بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

اکتوبر 2020

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

واٹس ایپ
0317 2266944

پہلی شعاع — رضیہ جمیل — 8
حمد — تنویر پھول — 9
نعت — الطاف حسین حالی — 9
نبی کی باتیں — ادارہ — 10

انٹرویو

بند حسن — اسماء ہمراہ آصف الیاس — 18
دستک — شاہین رشید — 22
بیٹھ کر سیر دوجہاں کرنا — آمنہ زریں — 15
جب تجھ سے پایا — ق - ع — 26
جب تجھ سے تارا — ج - ع — 30
شعاع کے ساتھ — ادارہ — 251

ناول

شہر تمنا — نعیمہ ناز — 36
شام کی حویلی میں — رخسانہ نگار عدنان — 178

مکمل ناول

زرتاشہ — گل ارباب — 124
سفر — سادیہ نواز — 200

ناولٹ

وہ نازنین — فرح بخاری — 96
دل کا معاملہ — عائشہ نصیر احمد — 70

افسانے

یار دل دار — افشین نعیم — 62
محافظ — حنا البشریٰ — 57
دائرہ — عمارہ جہاں — 92
مہراں کی کمائی — فرحت جبیں — 122
سونا — شازیہ الطاف ہاشمی — 175

نظمیں غزلیں

نظم — سباس گل — 237
غزل — سلیم کوثر — 237

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... -/840 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ______ -/7000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا _ -/8000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	244
مسکراہٹیں	ادارہ	238
یادوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	240
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	243
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	253
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	255
خوبصورت بنیے	ادارہ	257

اکتوبر 2020
جلد 35 شمارہ 02
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [redacted]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات

ماہنامہ شعاع کا اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وقت بدلا۔ زمانے کے اطوار بدلے۔ دنیا میں کسی شے کو ثبات بھی کہاں ہے۔ ہر گھڑی، ہر آن تغیّر کا پیغام ہے۔ انسان ترقی کی ان بلندیوں کو چھو رہا ہے، جن کا ایک صدی پہلے تصور بھی محال تھا۔ ترقی کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن نے بھی ترقی کی۔ ایک مہذب معاشرہ وجود میں آیا۔ قوانین وضع کیے گئے۔ سب کچھ بدلا لیکن عورت کی قسمت نہیں بدلی۔ عورت کی دنیا آج بھی کم و بیش وہی ہے۔ تاریک، اندھیری، روشنی سے محروم دنیا۔ عورت آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ظلم اور جبر کا شکار ہے۔ حالات کے شکنجے میں جکڑی، خاموشی سے ظلم و ستم سہتی ہوئی۔

پچھلے دنوں موٹروے پر ایک خاتون کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ دل دہلا گیا۔ جس کا تصور بھی ہولناک ہے لیکن اس سے زیادہ دل دکھا دینے والے اور ہول ناک وہ سفاکانہ تبصرے ہیں جو سامنے آئے۔ وہ مظلوم کو ہی قصور وار ٹھہراتے رہے کہ عورت ذات تنہا کیوں نکلی۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ عورت تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کے تین بچے بھی تھے۔

کیا چادر اور چار دیواری میں رہنے کی تلقین کرنے والے نہیں جانتے کہ عورت گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ نہیں ہے۔

خوف کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس واقعہ کا مرکزی ملزم تا حال آزاد ہے۔

جب مفادات، سچائی اور انصاف پر غالب آ جاتے ہیں تو قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ اپنا نام و نشان کھو بیٹھتی ہیں۔ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ اگر یوں ہی چلتا رہا تو کب تک چلے گا۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین کی برسی)

محمود بابر فیصل...... ایک ایسی شخصیت جو خوش رہنے اور خوش رکھنے کا ہنر جانتے تھے۔ ایک مختصر زندگی گزار کر دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے کہ ان کے دوست احباب آج تک ان کو بھول نہیں پائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں دوسرے جہان میں بھی خوش رکھے، آمین۔

قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں

☆ سفر...... ماریہ نواز کے ناول کی دوسری اور آخری قسط۔

☆ زرتاشہ...... گل ارباب کا مکمل ناول۔

☆ فرح بخاری اور عائشہ نصیر احمد کے ناولٹ۔

☆ حنا بشریٰ، افشین نعیم، عمارہ جہاں، فرحت جبیں اور شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے۔

☆ رخسانہ نگار عدنان اور نعیمہ ناز کے ناول۔

☆ آصف الیاس اور اسماء الیاس کا بندھن۔

☆ بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا...... آمنہ زریں کا تبصرہ۔

☆ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ...... دستک۔

☆ پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ۔

☆ آپ کا باورچی خانہ، ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

ہر اک شے پہ اُس کا کرم دیکھتے ہیں
بصیرت کی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں

پکارا اُسے مرکزِ دل سے جس دم
معاً اپنی پلکوں کو نم دیکھتے ہیں

انہیں عالم الغیب پر کیا بھروسا
جو ہر بات میں جامِ جم دیکھتے ہیں

نہیں ہم ہیں مایوس رحمت سے اُس کی
فلک کی طرف دم بدم دیکھتے ہیں

ہوا سرفگندہ جو رحماںؑ کے در پر
جہاں میں اُسے محترم دیکھتے ہیں

چمن میں نوا سنجیاں پھول نے کیں
شیاطیں کو مصروفِ غم دیکھتے ہیں

تنویر پھولؔ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مَس خام کو جس نے کُندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

الطاف حسین حالیؔ

خیر (نیکی) کے کاموں پر خرچ کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔''

(سبا۔39)

اور فرمایا'' اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تو اس کا فائدہ تمہیں ہی ہوگا اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو، اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہو اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

(البقرہ272)

نیز فرمایا'' جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔''

البقرہ(273)

فائدہ: ان آیات میں خرچ کرنے سے مراد نیکی اور اللہ کی پسندیدہ راہوں میں خرچ کرنا ہے۔ اس کی بابت ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ تمہارا خرچ ہوا ضائع نہیں جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا بہترین بدلہ (دنیا و آخر یا دونوں جگہ) عطا فرمائے گا، تاہم یہ خرچ ریاکاری اور شہرت کی غرض سے نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ثواب کے بجائے عذاب اور رضائے الٰہی کے بجائے اس کا غضب حصے میں آئے گا۔ اس لیے یہ خرچ صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ تمہاری خرچ کی ہوئی ایک ایک پائی کا علم اللہ کو ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا پورا پورا بدلہ عطا فرمائے گا۔

رشک

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے۔ ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا اور پھر اسے حق کی راہ میں خرچ کی ہمت و توفیق بھی دی۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے علم و حکمت سے نوازا، چنانچہ اس کے ساتھ فیصلہ کرتا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔''

(بخاری و مسلم)

اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پر رشک نہ کیا جائے سوائے ان ہر دو خصلتوں میں سے کسی ایک پر، یعنی ان پر رشک کرنا درست ہے۔

فوائد و مسائل

1۔ حسد نہایت مہلک اخلاقی بیماری ہے جو انسان کا امن و سکون برباد کر دیتی ہے۔ حسد کے معنی ہیں، کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر کڑھنا اور اس کے زوال کی آرزو کرنا۔ یہ حرام ہے اور اس سے انسان کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

2۔ ایک اور چیز غبطہ ہے جسے اردو میں رشک کرنا کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے اور اس کا مطلب ہے، کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر خوش ہونا اور یہ آرزو کرنا کہ اللہ اسے بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔ اس حدیث میں غبطہ کو بھی حسد سے نہیں تعبیر کیا گیا ہے، یہ حسد الغبطہ ہے، مطلق حسد نہیں کیونکہ وہ تو جائز ہی نہیں

ہے۔

3۔ بہر حال اس حدیث سے ایسے مال دار کی فضیلت واضح ہے جو اللہ کے دیے ہوئے مال کو صرف اپنی ذات ہی پر خرچ نہیں کرتا بلکہ اسے غربا و مساکین اور دین کی نشر و اشاعت پر خرچ کرتا ہے اسی طرح دین کا علم حاصل کرنے والے کی فضیلت کا بیان ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا اور دوسروں کو بھی قرآن و حدیث کی تعلیم دیتا ہے۔ ہر شخص کو یہ آرزو کرنا چاہیے کہ مال کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کا وافر جذبہ بھی اسے ملے اور دینی علوم اور اس کی حکمت سے وہ بہرہ ور ہوتا کہ انبیاء کی جانشینی کا شرف اسے حاصل ہو اور اس کا حق اچھی طرح ادا کر سکے۔

وارث کا مال

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟''

صحابہ نے کہا ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال ہی سب سے زیادہ محبوب ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''انسان کا مال تو وہی ہے جو اس نے (صدقہ و خیرات کر کے) آگے بھیجا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) اس میں بڑے حکیمانہ انداز سے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کو اجاگر اور ذہن نشین کیا گیا ہے کہ انسان کا اصل مال تو وہی ہے جو وہ مال کی محبت کو نظر انداز کر کے اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کی راہ میں اور اس کی پسندیدہ جگہوں پر خرچ کرے گا کیونکہ روز قیامت یہی مال اس کے کام آئے گا۔ اس کے علاوہ تو اس نے کھا پہن کر ختم کر دیا اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا، جو اس کے ورثاء کے کام آ گیا۔

(2) اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو تو اسے اللہ کی میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہیے۔

تھوڑا سا خرچ

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم آگ سے بچو، اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہی۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ حسب استطاعت اللہ راہ میں تھوڑا سا خرچ کر کے بھی اللہ کی رضا حاصل جا سکتی ہے۔

انکار کرنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا گیا اور آپ نے جواب میں فرمایا ہو۔ ''نہیں۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کرامت، نفس اور سخاوت کا بیان ہے کہ سائل کے سوال پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کبھی ''نہیں'' کا لفظ نہیں نکلا بشرطیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ چیز موجود ہوتی بلکہ بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرض لے کر بھی سائل کی حاجت پوری فرما دیتے، یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو اس سے وعدہ فرما لیتے۔

دو فرشتے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ہر دن جس میں بندے صبح کرتے ہیں، دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے ''اے اللہ! خرچ کرنے والے کو (بہترین) بدلہ عطا فرما۔'' دوسرا کہتا ہے۔ ''اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے حصے میں ہلاکت کر۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

(1) جس خرچ پر دعائے خیر کی نوید ہے، اس سے مراد صدقات نافلہ و واجبہ کے علاوہ اہل و عیال اور مہمانوں وغیرہ پر خرچ کرنا ہے اور جس امساک (ہاتھ روک رکھنے) پر بددعا ہے، وہ زکوٰۃ، صدقات اور مستحبات پر خرچ کرنا ہے۔ ہلاکت سے مراد مال کی ہلاکت یا بخیل کی اپنی ہلاکت بھی ہوسکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(2) فرشتے اللہ تعالیٰ کی پاک مخلوق ہیں جو کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ایسے فرماں برداروں کی دعائیں ضرور قبول فرماتا ہے۔ اس لیے فرشتوں کی دعائیں ضرور لینی چاہئیں جو بغیر کسی مفاد کے خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔

خرچ کر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ''اے آدم کے بیٹے تو خرچ کر، تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے پر خرچ کیا جائے گا، کا مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے فراخی اور بہترین بدلہ عطا فرمائے گا۔

بہترین خصلت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

''کون سا اسلام بہتر ہے؟'' (یعنی اس کی کون سی خصلت یا کون سی خصلت والا شخص بہتر ہے؟)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''تم کھانا کھلاؤ، لوگوں کو سلام کرو، چاہے تم پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) کھانا کھلانے میں کسی کو صدقے یا ہدیے کے ہدیے کے طور پر یا مہمان نوازی کے طور پر کھلانا شامل ہے، علاوہ ازیں اس سے مراد ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کردینا بھی ہوسکتا ہے۔ وہ بھوکا ہے تو اسے کھانا کھلایا جائے۔ کپڑے نہیں ہیں تو اسے لباس پہنایا جائے۔ بیمار ہے تو علاج کروایا جائے۔ مقروض ہے تو اسے قرض کے بوجھ سے نجات دلائی جائے۔

(2) سلام کرنے سے مراد، کثرت سے سلام کا پھیلانا ہے۔ اس سے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے اور نفرت و عداوت دور ہوتی ہے۔

چالیس خصلتیں

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''چالیس خصلتیں ان میں سب سے اعلا دودھ کے لیے بکری کا عطیہ دینا ہے، جو شخص بھی ان خصلتوں میں سے کسی ایک خصلت پر، ثواب کی امید سے اور اس پر کیے گئے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔'' (بخاری)

فائدہ:

منیحتہ اس جانور (بکری یا اونٹنی وغیرہ) کو کہتے ہیں جو صرف دودھ یا اون لینے کے لیے عطیہ

کے طور پر دیا جائے اور اس کے بعد اسے لوٹا دیا جائے۔ یہ بھی ایک احسان اور اچھی خصلت ہے۔ حدیث میں وارد شدہ چالیس خصلتوں کو بعض علماء نے اپنے اپنے طور پر شمار کیا ہے لیکن حافظ بن حجر نے کہا ہے کہ اس میں ہر خیر کی خصلت آجاتی ہے، انہیں شمار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مبہم رکھا ہے تو پھر دوسرا اسے کیوں کر متعین کرسکتا ہے؟ علاوہ ازیں اس ابہام میں شاید یہ حکمت ہو کہ کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھا جائے، چاہے وہ کتنا بھی تھوڑا اور معمولی ہو۔

ضرورت سے زائد

حضرت ابوامامہ صدی بن عجلان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اے ابن آدم! اگر تو زائد از ضرورت مال خرچ کردے گا تو یہ تیرے لیے بہتر ہوگا اور اگر تو اسے روک کر رکھے گا تو یہ تیرے لیے برا ہوگا اور تجھے برابر سرابر روزی پر ملامت نہیں کی جائے گی اور ابتدا اپنے اہل وعیال کے ساتھ کر۔ اور اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' (مسلم)

سوال کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام (کے نام) پر (یعنی نومسلم کی طرف سے) کسی چیز کا سوال کیا گیا تو آپ نے وہ ضرور دی۔

ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے دو پہاڑوں کے درمیان جتنی بکریاں تھیں، اسے دے دیں۔ وہ اپنی قوم کے پاس گیا اور جا کر کہا۔ ''اے میری قوم! اسلام قبول کرلو۔ اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس شخص کی طرح عطا کرتے ہیں جسے فقر کا اندیشہ نہیں ہوتا،

یقیناً ایک آدمی صرف دنیا حاصل کرنے کی
سے اسلام قبول کرتا لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزر
اسلام اسے دنیا میں موجود تمام چیزوں سے
محبوب ہوجاتا۔ (مسلم)

فوائد ومسائل:

(1) اس میں مولفۃ القلوب (نومسلموں
تالیف قلب کے طور پر مال دینے کا جواز ہے تا
اسلام پر پختہ ہوجائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ک
ابتدا میں قبول اسلام میں حصول دنیا کا جذبہ شامل
ہوتا تو تھوڑے عرصے بعد یہ جذبہ دل سے نکل
اور وہ نہایت مخلص مسلمان بن جاتا۔ اسی حکمت
پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مولفۃ القلوب کو ایک مص
زکوٰۃ بھی قرار دیا یعنی زکوٰۃ کی رقم بھی اس مد پر
کی جاسکتی ہے۔

(2) بعض علماء کے نزدیک اس مد پر خرچ
اب جائز نہیں ہے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس
قیامت تک زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے۔
بھی اس کی ضرورت ہے۔ اگر نومسلموں کی تا
قلب کا صحیح اہتمام ہو تو آج بھی اس کے فوائد ہم
سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی اس مد پر خ
کرنے کی کافی ضرورت ہے۔

صبر وحکم

حضرت جبیر بن معظم رضی اللہ عنہ بیا
فرماتے ہیں، ایک وقت وہ جنگ حنین سے واپسی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے آ
تھے کہ کچھ اعرابی (دیہاتی) آپ سے چمٹ
سوال کرنے لگے، یہاں تک کہ آپ کو مجبور کر
کیکر کے درخت کے پاس لے گئے۔ پس آ
صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر بھی اس (درخت
کانٹوں) نے اچک لی (یعنی اس میں پھنس
آپ کے جسم سے اتر گئی)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹھ
گئے اور فرمایا۔

''میری چادر تو مجھے دو۔ پس اگر میرے پاس ان خاردار درختوں کے برابر بھی اونٹ یا چوپائے ہوتے تو میں یقیناً انہیں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا، پھر تم مجھے بخیل پاتے نہ جھوٹا اور نہ بزدل۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) اس میں تالیف قلب کے طور پر دینے کے مسئلے کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا بیان ہے کہ کس طرح آپ صبر و حلم کے ساتھ دیہاتیوں کی سختی اور ان کی بدویت کو برداشت فرماتے۔

(2) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کے اندر بخل، دروغ گوئی اور بزدلی جیسی مذموم صفات نہیں ہونی چاہئیں۔ نیز بوقت ضرورت اپنی صفات حمیدہ کا ذکر کرنا بھی جائز ہے تاکہ جاہل لوگ بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔ ایسے موقع پر یہ وضاحت فخر و ریا میں شامل نہیں ہوگی جو مذموم فعل ہے۔

صدقہ کی برکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''صدقے نے کبھی مال نہیں گھٹایا اور عفو و درگزر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے اور جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اسے ضرور اونچا کرتا ہے۔'' (مسلم)

فائدہ: اس میں تین حقیقتوں کا بیان ہے۔

(1) صدقے سے مال کم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت عطا کر کے اس کی تلافی فرما دیتا ہے یا بعض دفعہ اس کا معاوضہ عطا کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں آخرت میں جو اجر و ثواب ملے گا۔ اس سے تو یقیناً اس کے مالی نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔

(2) انسان سمجھتا ہے کہ میں عفو و درگزر سے کام لوں گا تو لوگ مجھے کمزور خیال کریں گے، اس میں میری سبکی اور توہین ہے لیکن اس حدیث میں اس کے برعکس یہ حقیقت بیان کی جا رہی ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے، کمی نہیں کرتا کیونکہ معاف کرنے سے لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بڑھ جاتا ہے۔ یا اس عفو و درگزر پر آخرت میں اسے اجر و ثواب ملے گا، اس سے اس کے مقام و منزلت میں اور زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

(3) اس طرح تواضع اور فروتنی کرنے والوں کی عظمت و رفعت بھی اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے یا پھر آخرت میں انہیں بلند مرتبوں سے نوازے گا۔

صدقہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

''اس کا کتنا حصہ باقی ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''صرف ایک دستی باقی ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''سب ہی باقی ہے، سوائے ایک دستی کے۔''

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔)

اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے دستی کے علاوہ سب صدقہ کر دیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ صدقہ شدہ سارا حصہ ہمارے لیے باقی رہا کیونکہ آخرت میں اس کا اجر ملے گا۔ (اور دستی باقی نہیں رہی کیونکہ اسے خود کھایا جس پر آخرت میں اجر نہیں ملے گا۔)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو خود ہی سب کچھ نہیں کھانا چاہیے بلکہ صدقہ و خیرات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے تاکہ یہ چیز آخرت میں اس کے کام آئے۔

☆☆

عربی کہانیاں

ترجمہ و انتخاب:۔ اجمل کمال
تبصرہ:۔ آمنہ زرین

کہانی ایک سمندر ہے۔ جس میں پڑھنے والے سے پہلے لکھنے والا اترتا ہے۔ سمندر..... جس کا سکون بھی مرتعش نظر آتا ہے۔ جس کی وسعت، تا حد نظر۔ تصور کی مانند اور لامتناہی۔ اور گہرائی، دل کے نہاں خانوں جیسی۔ دکھنے کی۔ نہ دکھانے کی۔

فصاحت، بلاغت، حکمت اور نصیحت زبان کے اظہاریے ہیں اور عربی زبان ان سب پر بے مثل قدرت رکھتی ہے۔ سادہ مقام پر سادگی اور مشکل مقام پر شائستگی بھی تہذیب کی نمائندہ علامت ہے۔ یہ اسی فصاحت کا ابلاغ ہے کہ ہر منظر کے پس و پیش کے ساتھ ساتھ۔۔ تہہ میں لپٹے اسرار کو بھی پیمانہ مل جاتا ہے۔ یعنی ایک کہانی وہ جو کہی جارہی ہوتی ہے۔ اور ساتھ چلنے والی، اک ان کہی بھی۔

عربی فکشن کی فضا چمک دار اور روشن ہے۔

صحرا کی ہیبت، حکمت اور اسرار کو ایک نمائندہ کردار کے طور پر دیکھنا قاری کے لیے اڑن طشتری میں بیٹھنے جیسا ہے اور اس فضا میں تیرتے ہوئے، قاری اس آزادی سے ہمکنار ہونے والا ہے جو تحریر کے واسطے سے اسے ملتی ہے۔ یہ بھی اسی اڑن طشتری کی بدولت ہے کہ قاری یہ جان سکے کہ اس کے تخیل کی لگام لکھنے والے کے ہاتھ میں نہیں۔

تو چلیے پھر.....!

''کرسی بردار'' پڑھ کر کرسی سے جڑے آفاقی و نفسیاتی عوارض سامنے آتے ہیں اور ہم پر یہ کھلتا ہے کہ کرسی کہیں کی بھی ہو۔ اس کے اٹھانے والے خود کو بزعم خود واحد، نائب و نگراں اور تنہا وارث خیال کرتے ہیں اور جمے رہنے کی وجہ ایک ہی کافی جانتے ہیں کہ یہ ورثہ ہے اور چھوڑنے کی ایک سو دلیل بھی رد کرنے کا اضافی ہنر رکھتے ہیں۔ ''کرسیاں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ لوگوں کو اٹھائیں، نہ کہ لوگ انہیں اٹھائے پھریں۔''

1902 میں پیدا ہونے والے لکھاری توفیق عبدالحکیم نے بھلا اس زمانے کی رنگا رنگی کہاں دیکھی ہوگی۔

لیکن جدید ہونے کے زعم میں مبتلا ہونے سے قبل۔ یہ سکون ہی تھا جو دل و ذہن کو کشادہ رکھتا تھا۔ ایک ایسی کشادگی۔ جو کشف کا درجہ اختیار کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ مذہب کے نام پر کھلی ہوئی دوکان سے کرامات کا سودا۔ جو سماتا تو عوام کے دل میں ہے۔ مگر جب بیچا جاتا ہے تو جیبیں کسی اور کی بھرتا ہے۔ محض تین صفحات پر محیط یہ داستان بھی اپنے آپ میں آفاقیت رکھتی ہے۔ مذہب کا نام کوئی بھی ہو۔ وہ آپ کا ہو یا میرا۔ اسے منافع بخش بنانے والے ہر دور کا حصہ رہے ہیں۔ لیکن کہانی کا دلچسپ ترین مرحلہ۔ اس کے انجام میں ہے۔ جب آپ کو پتا چلے گا کہ ٹھگ ہندوستان کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی پائے جاتے ہیں۔ پڑھیے۔ بکاؤ کرامات۔

''خواب'' ایسی ہی ایک بظاہر ہلکی پھلکی کہانی ہے، جس میں لوگوں کے ذہنی رجحان کی غلط تعبیر بتا کر استحصالی رویہ دکھایا گیا ہے۔ اس استحصال سے بچاؤ کے لیے دوسرا رویہ میدان میں اترتا ہے۔ دونوں رویے نہایت انسانی ہیں۔ بہر حال ان میں

بندھن

اسماء ہمراہ آصف الیاس

شاہین رشید

ریڈیو کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام ''آصف الیاس'' بچوں کے بھائی جان اور معروف ڈرامہ سیریل ''ارطغرل غازی'' کے سینئر دوم میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جبکہ ایک تشہیری ادارے میں بطور کاپی رائیٹر اور وائس اوور آرٹسٹ کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ شعاع ڈائجسٹ کے مشہور و معروف سلسلے ''بندھن'' میں اس بار ہم نے آصف الیاس اور ان کی بیگم اسماء کو زحمت دی ہے۔ 17 اگست 2019ء میں ان کی شادی کو پورا ایک سال ہوگیا ہے۔ سینئر، موسٹ سینئر اور جونیئر جوڑوں سے تو بہت ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ سوچا بالکل ''نیوکپل'' سے کیوں نہ آپ کی ملاقات کروائی جائے۔

''کیسے مزاج ہیں آصف صاحب؟''

''جی الحمدوللہ۔''

''17 اگست کو ماشاءاللہ آپ کی شادی کو ایک سال مکمل ہوا۔ ہماری طرف سے اور ادارے کی جانب سے مبارک باد قبول کریں؟''

''بہت شکریہ۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟''

''میرا نام آصف الیاس ہے۔ والدین کا تعلق دہلی گھرانے سے ہے.....اور دہلی والوں کے لیے مشہور ہے کہ زہ ''چٹورے'' ہوتے ہیں تو میں بھی پیدائشی ''چٹورا'' ہوں۔ میں کراچی میں پیدا ہوا۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ تین بہنیں بڑی ہیں اور دو چھوٹی ہیں اور الحمدوللہ سب شادی شدہ ہیں۔ تعلیمی

قابلیت کچھ یوں ہے کہ دو عدد ماسٹرز ڈگریاں ہیں میرے پاس۔ لائبریری سائنس اور ماس کمیونکیشن کی۔ پھر بی ایڈ بھی کیا اور ڈرامہ اور تھیٹر سے متعلق کورسز بھی کیے ہیں۔"

"شادی کو ماشاء اللہ ایک سال ہوگیا ہے۔ کیسی گزر رہی ہے زندگی؟"

"جی الحمد للہ ایک سال ہوگیا ہے اور الحمدُ للہ کا مطلب ہے کہ میری شادی شدہ زندگی اللہ کے فضل و کرم سے اور اہلیہ کی بے پناہ محبت کی وجہ سے بہت اچھی گزر رہی ہے ورنہ منہ سے بے ساختہ الحمدُ للہ نہ نکلتا۔"

"شادی تھوڑی دیر میں ہوئی؟ کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوا کہ جلدی ہو جاتی یا ہوتی ہی نہیں؟"

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا" میرے اللہ کو مجھے اور اسماء کو اسی عرصے میں ملانا مقصود تھا اور آپ یقین کریں کہ بیشتر براتیوں نے ہماری جوڑی کو دیکھ کر بے اختیار کہا تھا کہ ماشاء اللہ" دیر آید درست آید"۔

"اسماء صاحبہ سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور آپ دونوں کا کیا رشتہ ہے۔ مطلب کزن ہیں یا دوست؟"

"اسماء سے پہلی ملاقات چھوٹی بہن کی ضد اور رشتہ کرانے والی کے سمجھانے پر ان کے گھر پر والدین، بھائی اور بھابھی کے سامنے ہوئی تھی...... اور اسماء شکر ہے کہ میری کزن نہیں ہے کیونکہ میں اپنی کسی کزن سے شادی کے حق میں نہیں تھا۔ اسماء کو میری سب سے چھوٹی بہن "بشریٰ" نے پسند کیا جس کے لیے میں اللہ کے بعد اپنی بہن کا شکر گزار ہوں۔"

"لڑکے عموماً اپنی پسند کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ نے بہنوں کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔ کیوں؟"

"والدہ کے بعد میری کل کائنات میری بہنیں ہیں۔ اس لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ ان کی بھابھی

ان کی پسند سے ہی لاؤں گا۔ میری قسمت کہ چار بہنیں شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں میں مصروف ہوگئیں اور میں خود سے لڑکی پسند کرنے کا روادار نہ تھا۔ (ورنہ تو میٹرک کے بعد ہی شادی کر چکا ہوتا) اس لیے چھوٹی بہن کو اس معاملے میں بڑا بن کر آگے آنا پڑا۔ اس نے پسند کرنے کے بعد ابتدائی مراحل میں اسماء کی تصویر بھی دکھائی۔ لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ "تم" بہنیں دیکھو، پسند کرو اور وہ مجھے پسند کرلیں تو شادی کرلوں گا۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی یا سادگی سے؟ نکاح پہلے ہوا یا رخصتی کے دن ......اور رسمیں انجوائے کیں آپ نے؟"

"نکاح بارات سے پہلے ہوگیا تھا (ورنہ رخصتی میں مزید تاخیر ہوجاتی) رسومات کے چکر میں ہم دونوں گھرانے فضول خرچی کی وجہ سے نہیں پڑے۔ تاہم مہندی مایوں کا اہتمام کیا گیا تھا اور ہم نے اپنی دیر سے پہنچنے والی بارات، تاخیر سے ہونے والی رخصتی اور چار روز بعد ہونے والے ولیمہ کو خوب انجوائے کیا۔"

"آپ کا حلقہ احباب بھی وسیع ہوگا، پھر مشہور شخصیت کی شادی میں بن بلائے مہمان بھی بہت آجاتے ہیں......تو کہیں کھانا کم تو نہیں پڑ گیا تھا؟"

"میری شادی میں پٹاخے نہیں پھٹے لیکن میں نے خود شادی سے ایک ہفتہ قبل "بم" پھاڑا تھا (اپنی

شادی کا بتا کر) جس پر حلقہ احباب و ارباب سب پھٹ پڑے کہ یہ کیا..... (میں خوش تھا کہ غصے میں لوگ نہیں آئیں گے یا کم آئیں گے) لیکن نہیں جناب بن بلائے ہی نہیں بلائے گئے سارے مہمان بھی آئے تھے۔ ہال چھوٹا پڑ گیا تھا خیر ہوگئی کہ کھانا کم نہیں پڑا۔''

''شادی کے بعد اسماء کو کیسا پایا؟ سگھڑ ہیں؟''

''جی الحمدُ للہ کافی سگھڑ ہیں البتہ مجھ جیسے شوہر کی وجہ سے بات بے بات جذباتی ہونا ان کا فطری عمل ہے۔''

''مزاج کی کیسی ہیں، اور لڑائی ہوتی ہے؟''

''میری سستی اور لاپروائی سے اسماء اکثر غصہ میں آجاتی ہیں۔ میں ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہوں۔ اسماء کی خوبی یہ ہے کہ جتنی جلدی غصہ آتا ہے اتنی جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ اس پہ کمال یہ کہ منانے میں پہل ہمیشہ اسماء ہی کرتی ہیں..... اور جہاں محبت ہو وہاں ہلکی پھلکی جھڑپ بھی ہو جاتی ہے اور ہماری لڑائی ماشاء اللہ روز ہوتی ہے (اس سے آپ ہماری محبت کا اندازہ لگا سکتی ہیں)۔''

''اتنی محبت، اتنی چاہت ہے اس رشتے میں۔ پھر یہ محبت کمزور کیسے پڑ جاتی ہے؟ کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟''

''اس مضبوط بندھن کو کمزور کرنے میں خود میاں بیوی کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر ان کے درمیان ذہنی وفکری ہم آہنگی نہ ہو تو پھر مسائل جنم لیتے ہیں..... یہ ہمارے درمیان پہلے دن سے طے ہوگیا تھا کہ زندگی کے کسی بھی مسئلہ کو پہلے مرحلے میں ہم خود سلجھائیں گے بعد میں بڑوں سے رجوع کریں گے اور طلاق کی نوبت بھی اس وقت آتی ہے جب عورت کو شیطان بہکائے اور مرد اپنے آپ کو ''عقل کل'' سمجھنے لگے۔''

''ہنی مون پہ گئے تھے؟ منانا چاہیے کہ نہیں؟''

''اگر آپ صاحب استطاعت ہیں تو ہنی مون سون سب منانا اور بیوی کو بھاری بھرکم تحفے دے کر منانا سب ضروری ہے۔ تاہم ہم دونوں ہنی مون پہ نہیں گئے تھے۔ فی الحال وہ میری ہنی اور میں ان کا مون ہوں۔''

''کیا اسماء روایتی بیگم کی طرح آپ کا خیال رکھتی ہیں؟''

''اسماء گو کہ روایتی بالکل بھی نہیں ہیں۔ تاہم میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ میں اپنی جاب کی وجہ سے رات گئے آتا ہوں۔ لیکن شروع دن سے ہم کھانا ایک ساتھ ہی کھاتے ہیں۔''

''آپ کو اسماء سجی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں اور آپ کے پروگرام سنتی ہیں؟''

''میں چونکہ سادہ مزاج ہوں اس لیے اسماء بھی بہت کم سجتی سنورتی ہیں اور ریڈیو سے اسماء کو چونکہ کوئی شغف نہیں ہے اس لیے زیادہ دلچسپی نہیں لیتیں۔ البتہ سراہتی ضرور ہیں۔''

''اور کچھ کہنا چاہیں گے اپنی بیگم سے؟''

''جی یہی کہ مجھے تم سے بے پناہ پیار ہے۔''

اور اب کچھ باتیں اسماء آصف سے

''کیسے مزاج ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟''

''میرے آباؤ اجداد کا تعلق سیتاپور سے ہے میں 27 دسمبر کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم دو ہی بہن بھائی ہیں میں ہوں اور پھر میرا چھوٹا بھائی اور میری تعلیم ایف ایس سی تک ہے۔''

''آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی اور آصف بتا رہے تھے کہ آپ بہت شرمیلی ہیں؟ آج کل کی لڑکیاں بھلا شرمیلی کہاں ہوتی ہیں؟''

''آج کل میری مصروفیات صرف اور صرف گھرداری ہے اور جہاں تک شرمیلی والی بات ہے تو چونکہ میں نے کسی کو انٹرویو نہیں دیا، اس لیے شرم آرہی تھی۔ ورنہ تو میں جس سے دوستی کرلوں، پھر اس کے ساتھ گھل مل جاتی ہوں۔''

''ماشاء اللہ شادی کو ایک سال ہوگیا ہے تو یہ

ایک سال کیسا گزرا؟''

''ہر لڑکی اپنے سسرال میں کچھ نہ کچھ ارمان لے کر آتی ہے۔ سو میرے بھی کچھ ارمان پورے ہوئے اور کچھ نہیں۔ تو بس اس طرح ایک سال کچھ نرم سا اور کچھ گرم سا گزر گیا۔ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ بس ٹھیک ہی گزرا شادی کا ایک سال۔''

''شادی سے پہلے آپ آصف کو یا ان کی فیملی کو کتنا جانتی ہیں؟''

''میں اور میری فیملی شادی سے پہلے آصف کو نہیں جانتے تھے۔ رشتہ کرانے والی نے میری فیملی کو آصف کی فیملی سے ملوایا تھا اور پھر آصف اپنی فیملی کو لے کر آئے تھے ہمارے گھر اور یہ بات ہے فروری 2019ء کی۔''

''گویا آپ کی پسند کا کوئی عمل دخل نہیں ہے؟''

''جی..... آصف سے میری شادی ارینج میرج ہے اور میں نے اپنے والدین کی پسند سے آصف سے شادی کی۔''

''آپ کو معلوم تھا کہ آپ کی شادی ایک معروف شخصیت سے ہونے والی ہے؟''

''شادی سے پہلے ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آصف مشہور شخصیت ہیں۔''

''اپنے گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا.....؟''

''زمین اور آسمان کا فرق ہے میرے اور آصف کے گھر کے ماحول میں۔''

''سسرال والوں کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے اور کیا جوائنٹ فیملی ہے آپ کی؟''

''جی جوائنٹ فیملی میں ہوں۔ میرے سسرال میں ہم صرف تین افراد ہیں آصف، میں اور آصف کے والد صاحب۔ آصف اور ان کے ابو کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔''

''جو خواب دیکھے پورے ہوئے؟''

''خواب تو بہت دیکھے میں نے، لیکن تعبیر کسی کی بھی پوری نہ ہو سکی۔''

''منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟''

''آصف نے منہ دکھائی میں گولڈ کا لاکٹ دیا تھا اور جیسا کہ آپ کو آصف نے بھی بتایا ہوگا ہم ہنی مون کے لیے کہیں بھی نہیں گئے۔''

''آصف کے گھر والوں نے جہیز کی ڈیمانڈ کی تھی اور کیا سسرال والوں کے ساتھ مل کر شادی کی شاپنگ کی تھی؟''

''آصف اور ان کی فیملی کی طرف سے جہیز کی کوئی ڈیمانڈ نہیں تھی اور میری برلی (جو سسرال سے چیزیں آتی ہیں) کی تیاری یا شاپنگ سسرال والوں نے خود کی تھی۔''

''لڑائی جھگڑے تو میاں بیوی میں ہوتے ہی ہیں۔ پہلی لڑائی کس بات پر ہوئی تھی؟''

''جی کئی بار لڑائی ہو چکی ہے ہماری اور پہلی لڑائی کمرے میں پھول نہ رکھنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔''

''آصف مزاج کے نرم ہیں یا گرم؟ اور سادگی میں پسند کرتے ہیں یا سجی بنی؟''

''آصف نرم مزاج کے انسان ہیں..... اور یہ مجھے سادگی میں پسند کرتے ہیں۔''

''اسماء! یہ بتائیں کہ آصف کا موڈ عموماً کن باتوں پر خراب ہو جاتا ہے؟''

''آصف کو بحث کرنا پسند نہیں ہے جب بھی آصف سے کسی بات پر بحث کرتی ہوں ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔''

''اور آپ روایتی بیوی ہیں یا سوشل ہیں؟''

''میں ٹیپیکل ہاؤس وائف ہوں اور سوشل نہیں ہوں۔ جاب کرنے کا دل چاہتا ہے؟''

''نہیں جی..... جاب کے حوالے سے میں یہی کہوں گی کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے جاب کرنے میں۔''

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے آصف الیاس اور مسز اسماء آصف سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ ہمیں ٹائم دیا۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

حسن خان

''کیا حال ہیں؟''

''الحمد للہ بالکل ٹھیک۔''

''ماشاء اللہ بہت اچھے پرفارمر ہو، آج کل تمہیں ''سوتیلی مامتا'' میں دیکھ رہی ہوں اور گزشتہ کچھ عرصہ پہلے ''سویا میرا نصیب'' میں دیکھا، بہت اچھا لگا۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں۔''

''بس یہی شوبز کی مصروفیات ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سب کو میرا کام پسند آتا ہے اور سب میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔''

''ناپا کے گریجویٹ ہو؟''

''جی میں ناپا کا ٹرینڈ ایکٹر ہوں اور اداکاری کی ٹریننگ میں نے تین سال تک لی ہے۔''

''گڈ..... ناپا میں تو بہت اچھے اور بہترین فنکار اساتذہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے اساتذہ میں کون کون تھے؟''

''ہمارے اساتذہ میں راحت کاظمی، طلعت حسین صاحب، ضیاء محی الدین صاحب یہ میرے استاد تھے جن سے میں نے تین سال ٹریننگ لی..... اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں ناپا کا گریجویٹ ہوں تو اس کے بارے میں تفصیل سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''بالکل آپ سے تفصیل سے بات کروں گی، باقاعدہ انٹرویو کر کے ابھی تو بس ایسے ہی تھوڑی بات چیت کرنا چاہ رہی ہوں۔ آپ کی پرفارمنس اور فیلڈ میں آمد کے بارے میں؟''

''بالکل کریں.....''

''تو جناب یہ بتائیں کہ آپ نے ناپا سے اداکاری کی ٹریننگ لی .....تو کیا بہت شوق تھا اداکاری کا؟''

''نہیں، نہیں مجھے تو بالکل بھی شوق نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا.. میرے ''ٹوٹو بھائی'' مجھے زبردستی اس فیلڈ میں لے کر آئے..... مگر جب فیلڈ میں آ گیا تو اچھا لگا تب سوچا کہ مزید پرفیکشن لانے کے لیے کیوں نہ ٹریننگ بھی لے لوں۔ چنانچہ اقراء یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد ''ناپا'' میں ایڈمیشن لیا اور پھر اداکاری کی طرف آ گیا۔''

''گھر والوں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا؟''

''بالکل بھی نہیں..... بلکہ وہ تو خوش ہیں کہ میں شوبز میں ہوں۔ گھر والے تو میرا ڈرامہ دیکھ کر بہت

خوش ہوتے ہیں۔"

"اچھی کمائی ہو جاتی ہے؟"

"جی الحمد للہ بہت اچھی کمائی ہو جاتی ہے۔"

"کیا کرتے ہو؟ جمع کرتے ہو یا خرچ کر دیتے ہو؟"

"پیسے کب جمع ہوتے ہیں اور ویسے بھی بندہ کماتا ہی اس لیے ہے کہ خرچ کرے۔ تو مجھے خرچ کر کے اچھا لگتا ہے اور جو کچھ کماتا ہوں۔ اپنی ماں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لے کر آتا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔"

"بہت دبلے پتلے ہو، کھاتے پیتے نہیں کیا؟"

ہنستے ہوئے "ارے کیا بات کر دی آپ نے، میں تو فٹ رہنے کے لیے بہت اچھا کھاتا ہوں۔"

"فینز بنے، ان سے مل کر کیسا لگتا ہے؟"

"جی..... جی ماشاء اللہ کافی فینز بن گئے ہیں اور ان سے مل کر بہت اچھا لگتا ہے، اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے ایک نئی طاقت ملتی ہے اور مزید اچھا کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

"ٹریننگ یافتہ ہو۔ اداکاری میں کیا آسان لگتا ہے رومینٹک اداکاری یا جو بھی کردار مل جائے؟"

"کوئی بھی کردار ہو، خواہ وہ رومینٹک ہو یا کامیڈی یا کوئی بھی۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر کوئی کردار نکھر کر سامنے آتا ہے۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ ٹریننگ کے دنوں میں سینئرز کے لیکچر کے علاوہ کیا ہوتا تھا؟"

"جتنے بھی مشہور افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار جو گزرے ہیں اور جو موجود ہیں ان سب کو پڑھنے کے لیے کہا جاتا تھا تو یوں سمجھیں کہ سب ہی نامور لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔"

"کسی خاص رول کو کرنے کی خواہش ہے؟"

"نہیں جو بھی مل جائے گا شوق سے اور دل سے کروں گا۔ کوئی قید نہیں ہے کہ یہ ملے یا وہ ملے۔"

"گڈ..... چلو پھر بات کریں گے تفصیل سے....."

☆☆☆

عظمیٰ رزاق..... رائیٹر + سابقہ کونٹینٹ منیجر

"کیا حال ہیں، کیسی ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے آپ سنائیں۔"

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"بے روزگار ہوں۔ گھر پر بیٹھی ہوں۔ ڈیڑھ سال سے، زندگی کچھ عجیب سی ہو گئی ہے گھر سے گھر تک۔"

"جاب کیسے گئی؟"

"وہی میڈیا" کرائسس۔ انہوں نے گیارہ ماہ تک زبردستی بٹھا کر رکھا کہ اب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ مگر اس کے بعد سب کو فارغ کر دیا۔

"تو واپس پرانے ادارے چلی جاتیں؟"

"وہاں بھی میڈیا کرائسس ہے۔ ویسے وہاں جگہ بھی خالی ہے اور ضرورت بھی ہے۔ ویسے بہت سے رائٹرز ہیں جن کے پاس آج بھی کام نہیں ہے۔ کچھ کی قسمت اچھی ہے تو لگے ہوئے ہیں کام سے۔"

"نئی جگہ پر کیا عہدہ تھا تمہارا؟"

''میں وہاں کانٹینٹ منیجر کی حیثیت سے گئی تھی اور نورالہدیٰ شاہ مجھے وہاں لے گئی تھیں۔ فروری 2018ء میں ان کے حالات خراب ہوئے تو انہوں نے ایک ماہ کے بعد ایکٹرز، ڈائریکٹرز کو فارغ کر دیا لیکن ہم کانٹینٹ والوں کو کہا گیا کہ آپ لوگ تو ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ ان شاء اللہ دو ماہ میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم سب نے ان کی بات پر اعتبار کیا اور اچھے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ جو کبھی نہیں آیا۔ گیارہ مہینے اس طرح بٹھا کر رکھا۔''

''سیلری دی؟''

''گیارہ ماہ میں صرف چار بار سیلری دی۔ اور جنوری 2019ء کو اچانک کہہ دیا کہ ہم سیلری دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس لیے سب کو فری لانس کر رہے ہیں۔ رائیٹرز کو بھی ان کے پیسے نہیں دیے گئے اور.....اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کو ان کا حق نہیں دیا گیا۔''

''اتنی زیادتی کے بعد کورٹ کا سہارا کیوں نہیں لیا آپ سب نے؟''

''نیوز چینل سے نکالے گئے کچھ لوگوں نے ایک گروپ بنایا تھا کہ کورٹ میں کیس کریں گے لیکن وہ کیس بھی آج تک نہیں ہو سکا اور جنوری 2018ء سے لے کر آج تک وہاں سے کسی نے رابطہ تک نہیں کیا.....اور ایک بات بتاؤں کہ کونٹینٹ ہیڈز نے اپنے واجبات کسی نہ کسی صورت میں نکلوا لیے لیکن انہوں نے اپنی ٹیم کو مڑ کر نہیں دیکھا۔''

''عظمیٰ! آپ اکثر فیس بک پہ ڈراموں پر ریویوز لکھتی ہیں.....کسی نے آپ سے رابطہ کیا کہ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں؟''

''ریویوز تو میں دل کی تسلی کے لیے لکھتی ہوں اور بہ حیثیت ناظر کے لکھتی ہوں۔ آج تک کسی نے رابطہ نہیں کیا ایک دو لوگوں نے ''یوٹیوب'' چینل کے لیے کہا تھا، تو جب میں خود یوٹیوب کے خود ساختہ چینلز نہیں دیکھتی تو کسی سے کیا توقع رکھوں کہ لوگ مجھے دیکھیں گے.....اور آپ کہہ رہی ہیں نا کہ میں اچھا لکھتی ہوں۔ لیکن ایک محترمہ بہت بڑی رائیٹر ہیں ان کے کسی ڈرامے پر میں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب میں باقاعدہ ریویوز لکھا بھی نہیں کرتی تھی تو ان محترمہ کے ٹولے کی گروپ چیٹ مجھے پہنچی تو اس میں مجھے ''بلقیس کمینی'' کا نام دیا گیا اور ان بڑی رائیٹر نے مجھے گالیاں دیں۔ میں نے فیس بک پر ان عظیم رائیٹر کو بلاک کیا ہوا ہے۔''

''تنقید نہ کر کے آپ کو اس طرح کا لقب ملا۔ اگر تنقید کر دیں تو؟''

''مزے کی بات بتاؤں.....ڈرامہ سیریل ''جلن'' میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن شاید کسی اور کے اسٹیٹس پہ میں نے کوئی کمنٹ کر دیا تھا کہ ایسے ڈرامے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے تو ——— ڈائریکٹر جو کہ کئی سالوں سے فیس بک پر ایڈ تھے اور ویسے بھی اچھی ملاقاتیں رہی ہیں ان سے.....تو بس تھوڑی سی تنقید پر انہوں نے مجھے فیس بک سے ڈیلیٹ کر دیا۔ ان لوگوں میں برداشت نام کی چیز ہی نہیں ہے.....اور ماشاء اللہ سے ایک ٹولہ ایسا بھی ہے جو ابھی رائیٹر بننے کی کوشش کر رہا ہے، وہ صرف میری تنقید کی کچھ سطروں کا اسکرین شاٹ بنا کر رائیٹر، ڈائریکٹرز کو اور ایکٹرز کو بھیجتے ہیں کہ عظمیٰ نے تمہاری یہ برائی کی ہے تو بس سچ بولنے کی وجہ سے دشمن زیادہ بنا رہی ہوں۔''

☆☆

ماہنامہ کرن

اکتوبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

❁ بیادِ محمود بابر فیصل،

❁ اداکارہ ''زرباب رانا'' سے شاہین رشید کی ملاقات،

❁ اداکارہ ''عالیہ علی'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیے''،

❁ اس ماہ ''اقصیٰ شہرزاد'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،

❁ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،

❁ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کے سلسلے وار ناول،

❁ ''کنارِ خواب جو'' فرح بخاری کا مکمل ناول،

❁ ''دیس میں نکلا ہوگا چاند'' قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،

❁ ''کانچ سے سائبان'' مصباح علی سید کا ناولٹ،

❁ ''سوزِ عشق'' کوثر ناز کا ناولٹ،

❁ ''ہوئے جو تم مہربان'' بینش مجید کا ناولٹ،

❁ ایمل رضا، فوزیہ سرور، حرا احمد، سمعیہ خالد اور ثانیہ چوہدری کے افسانے اور مستقل سلسلے،

❁ **''کرن کتاب''**

ایشیائی خواتین کا بیوٹی سیکرٹ، چاول کا پانی، میرا ہیئر اسٹائل، روزانہ صرف ایک 'ناشپاتی' نسوانیت کا دشمن لیکوریا، کچن اور آپ، کرن کا دسترخوان مزے دار ریسیپیز کے ساتھ۔

اکتوبر 2020ء کا شمارہ شائع ہوگیا

بالی) میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ انہوں نے کوتاہیاں کیں، یہ سوچ کر درگزر کر دیتی ہوں کہ میرا خیال بھی رکھا گیا، کوئی بات نہیں۔"

س: "آپ جوائنٹ فیملی سسٹم کو پسند کرتی ہیں؟"

ج: "اگر گیدرنگ اچھی ہو تو جوائنٹ فیملی سسٹم زبردست ہے اور اگر میرے جیسے معاملات یعنی نندیں کچن سے دھکیلے تک دے دیں، چیزیں آپ کے ہاتھ سے چھین لی جائیں۔ بچوں کے فیڈر اٹھا کر پھینکے جائیں، اپنے بیٹے اور بھائی کے سامنے ان ہی بچوں کے واری صدقے ایسے کہ ان باتوں پر کوئی یقین بھی نہ کرے۔ ایسی ذلت سے علیحدہ رہنا بہتر ہے جہاں انسان کو موت آئے تو کم از کم سکون سے مر تو جائے۔ لوگ تو نہ چین سے جینے دیتے ہیں نہ مرنے۔"

س: "میکے اور سسرال کے کھانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟"

ج: "واضح فرق تھا کہ یہاں پھیکا کھانا بنتا تھا مگر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ سالن بے حد نپا تلا ملتا تھا۔ دوبارہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ اگلے ٹائم بھی وہی سالن چلانا ہوتا تھا۔ شروع میں تو گزارا ہو گیا مگر پریگننسی اور بچے کو دودھ پلانے کے دوران بھوک بڑھ جاتی ہے۔ میں دسترخوان پر بیٹھتی اور بھوکی ہی اٹھتی۔ ساس نے باسی روٹی کھانا بھی میرے ذمے لگا رکھی تھی۔

کبھی تو ایسے ہوتا مہمانوں کے لیے، گھر والوں کے لیے روٹی پکانے کے بعد روتے ہوئے بچے کو فیڈ کرا کر دسترخوان پر بیٹھتی تو میرے کھانے کے لیے میدان صاف ملتا۔ جہاں تک انداز مختلف ہونے کی بات ہے تو میرے سسرالی پیسے والوں کے آگے پیچھے پھرتے اور غریب سے انسانیت کا سلوک تک روا رکھنے کے قائل نہیں۔"

س: "آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی؟"

ج: "ارے بھئی، ہماری اتنی بساط، اتنی اوقات؟ ہاں، کہانیاں لکھنی چھوڑ دی تھیں تا کہ ان کا رویہ میرے ساتھ کچھ بہتر ہو جائے۔ گھر کا سکون حاصل کرنے کے لیے مجھے یہ سودا منظور تھا مگر رتی برابر فرق نہ پڑا تو میں نے چھپ چھپ کر افسانے لکھے اور ان کی اشاعت کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔ جب بھی اعزاز یہ ملتا تو ہاتھ میں اپنے پیسے آتے جو میں اپنی مرضی سے کہیں بھی خرچ کر سکتی تھی۔ بے حد خوشی ہوتی۔ پھر ایک روز میں نے اپنے شوہر کو رسالے میں اپنا نام دکھا دیا۔ وہ حیران ہوئے مگر میں نے آج تک کوئی کہانی (سوائے اپنی جٹھانی کے) کسی کو پڑھنے کے لیے نہ دی، نہ اب اپنی کوئی کامیابی شیئر کرتی ہوں۔

لکھنے کے سفر میں میرے بہن بھائیوں نے میرا بے حد ساتھ دیا۔ ایک بار ان کے رشتہ داروں کے گھر گئے تو انہوں نے لکھنے کی وجہ سے خاصی پذیرائی بخشی۔ باہر کے جتنے لوگ مجھے اس حوالے سے جانتے ہیں، بے حد محبت سے ملتے ہیں۔ میں بھی کسر نفسی کا مظاہرہ کرتی ہوں۔ ایسی صورت حال دیکھ کر سسرال والے بھی توصیفی انداز میں دیکھتے ہیں۔

علیحدہ ہونے کے بعد میں نے اپنی طرف اٹھتی ہر انگلی کو اسی جانب موڑا جس نے بھی مجھ پر اٹھائی تھی۔ وقت نے بہت کچھ سکھا دیا۔ نتیجہ اب کوئی "پنگا" نہیں لیتا۔ بفضل خدا اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔"

خیر میری کہانی وہی ہے جو میرے جیسی اسّی فیصد لڑکیوں کی ہوا کرتی ہے۔ میں اپنی بہنوں سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ کبھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ ایک یہی امر دوسروں کو ہم پر حاوی کرتا ہے۔ ہم پر بھی اللہ کی اتنی ہی رحمت ہے جتنی کہ دوسروں پر۔ پھر کسی سے ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ ہم بھی اللہ کے بندے ہیں۔ اس سے لو لگائیں۔ وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔

زندگی اچھی نہیں ہے، آپ کی من پسند نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہم کسی سے کم تو نہیں ہیں۔ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ اگر ہر سعی ناکام گئی تو خاموش اور بس انتظار۔ اس مصلحت کے پیچھے چھپے بھید کو پانے کی جستجو کریں...... اور ہاں! میرے لیے دعا بھی۔

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ق.....ع

بجنگ آمد کے دیباچے میں کرنل محمد خان نے لکھا ہے۔

"بد خطی لاعلاج مرض نہیں ہے۔"

سو میں نے بھی مان لی ان کی بات، حالانکہ کزن نے میرے شاندار مارکس کو ہمیشہ میری ڈاکٹر والی لکھائی کے زمرے میں ہی ڈالا ہے کہ مصنف بے چارے کی سمجھ میں تو آتا کچھ نہیں بس اس نے واہ نمبر دے ڈالنا۔ آئیں ذرا آپ کو اپنی شادی شدہ حیات کا قصہ سناؤں۔

س: شادی کب ہوئی۔

تو جناب شادی 15 اکتوبر 2011 میں ہوئی جب آتش زیادہ جوان بھی تھا اور تازہ تازہ ایم بی اے میں ایڈمیشن کے خمار میں بھی، مگر وائے حسرت بیچ میں ایک رشتہ ٹپک پڑا۔ اور ایسا ٹپکا کہ بس دبلیز ہی پکڑ لی۔ صبح وشام بیسیوں کالز ابو کو بھی لگنے لگا کہ اتنی چاہت سے مانگ رہے تو یقیناً قدر بھی کریں گے۔

2۔ شادی سے پہلے کے مشاغل میں سرفہرست پڑھنا۔ کتب بینی، اخبار بینی، حتیٰ کہ پوسٹر بینی، جی ہاں گریزی ریڈر، امی اگر کبھی مجھے جھاڑو لگانے کا کہتیں، تو پہلے تمام کاغذ اٹھالیا کرتی تھیں۔ ورنہ جھاڑو لگانے کا دورانیہ بہت طویل ہوجایا کرتا تھا۔

ابو جی اس ضمن میں اکثر ایک لطیفہ بھی سنایا کرتے تھے کہ تم جیسا ہی ایک گریزی ریڈر ایک دفعہ ایک بورڈ..... پڑھنے کے لیے بیس فٹ اونچے بجلی کے کھمبے پر چڑھ گیا، اور اوپر پہنچ کر دیکھا بورڈ پر لکھا تھا اس کھمبے کے قریب مت آئیں کرنٹ لگنے کا خدشہ ہے۔"

س: شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج: پڑھنے کے علاوہ شاعری کا شوق، پھر پکانے کا، بڑی تراکیب آزمائی ہیں شعاع اور خواتین کی بھی اس ضمن میں ایک مکھنڈی حلوہ بنانے کا واقعہ قابل ذکر ہے، کسی بہن نے ترکیب بھیجی تھی شعاع میں۔ سوجی بھوکر اس کا اسٹارچ نکال کر بنانا تھا حلوہ، میں نے بھی ترکیب کے مطابق ہی کیا تھا سب مگر جانے کیا ہوا۔ بھونتے بھونتے اسٹارچ کب دوبارہ سوجی میں بدلا کوئی خبر نہ ہوئی۔ حلوہ فائنلی ایک عجیب سی دانے دار خشک ڈش میں تبدیل ہوگیا۔ بھائی لڈو کھیلتے ہوئے پیالہ بھر کے پاس لا رکھتا اور دانہ دانہ ٹونگتے جاتے سب نمکو کی طرح اور میں کہتی۔ یہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو کیا پتا۔"

خیر بات ہورہی تھی رشتہ کی تو فائنلی منگنی ہوگئی اور تقریباً پانچ ماہ رہی اس دوران کوئی رابطہ نہیں ہوا ان کی طرف سے حالانکہ مجھے میٹرک کے رزلٹ پر ابو جی نے ذاتی سیل فون لے دیا تھا۔ جب تک منگنی رہی شاوا (میری دادی، میری سہیلی، میری بیسٹ فرینڈز) اکثر مجھ سے پوچھا کرتیں۔ کوئی فون شون تو نہیں آیا اس کا۔

"میں کہتی نہیں۔"

تو ناک پر انگلی رکھ کر بولتیں" لگدائے شریف ای اے۔"

جب رشتہ آیا تو ستارا نے ہی تصویر دکھائی مجھے جناب گہری آنکھیں، اور دلکش نقوش دیکھنے میں جتنے اچھے لگے۔ حقیقت میں اس سے بڑھ کر ہی نکلے جناب۔

س: رشتہ میں مرضی شامل تھی؟

ج: رشتہ میں مرضی، بس اسی حد تک شامل تھی۔ موصوف کی آواز بھی نکاح کے بعد ہی سنی پہلی دفعہ، اپنی شادی کے روز، جی، جی جناب ہوتا ہے ابھی بھی ہوتا ہے ایسا، حالانکہ ہم قطعاً دقیانوسی نہیں ہیں۔ ابو

بالکل دوستوں جیسے، اور گھر کا ماحول بہت دوستانہ اور محبت بھرا۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

ج: بڑے ہی نیک خیالات تھے یہی سوچا تھا کہ گھر میں موجود واحد نند اور دیور کے ساتھ بہنوں والی دوستی ہوگی۔ مل کر گھر کے بڑے سے لان میں بیڈمنٹن کھیلا کریں گے۔ میکے جیسا دوستانہ اور خوب صورت ماحول ہوگا۔ اور ہمیشہ مل جل کر ہنسی خوشی رہیں گے۔ (زندگی واقعی فیری ٹیل نہیں ہوتی) ساس میری سادہ مزاج سی لگی تھیں سب کو، میری دادو اس رشتے کے حق میں سب سے زیادہ ساس کی وجہ سے ہی تھیں کہ تنگ کرنے والی نہیں لگتیں۔ سسر البتہ بہت رعب دار والے تھے۔ اونچے لمبے، سنجیدہ اور دوٹوک بات کرنے والے۔ بڑی بڑی پنچائیتوں کے فیصلے کرنے والے چوہدری تھے۔ اور دیکھنے میں بھی پورے چوہدری صاحب ہی لگتے تھے۔ ابھی آٹھ ماہ قبل اچانک ہی وفات ہوگئی ان کی ہمارے گھر کا اہم ترین ستون سرک گیا اپنی جگہ سے (اللہ جنت الفردوس میں جگہ دے ان کو) نند اور دیور سے بھی اچھی دوستی ہوگئی شادی کے بعد، اور دیور کی شادی تک راوی چین ہی لکھتا رہا تقریباً بعد کی کہانی ذرا ٹوئسٹ سے بھری ہوئی ہے۔

س: شادی کے لیے تعلیم کی قربانی دینا پڑی؟

ج: جی ہاں تعلیم کی ہی، بتایا تو (حسرت.....)

س: شادی کی رسموں کے دوران کوئی بدمزگی ہوئی؟

ج: شادی دھوم دھام سے ہوئی اور بالکل خیر وعافیت سے ہوگئی۔ رسمیں سب ہوئیں اور جھگڑا کسی ایک پر بھی نہ ہوا۔ بے چارے رشتے دار مفت کے انٹرٹینمنٹ شو سے محروم ہی رہ گئے۔

س: شوہر نے پہلی دفعہ دیکھ کر کیا کہا؟

ج: آہاں! کیا یاد دلا دیا جناب (آپس کی بات ہے سب سے زیادہ دلچسپ مجھے یہی سماں لگا) شوہر صاحب نے پہلی دفعہ تب ہی دیکھا تھا۔ تصویر کے بعد، شادی بالکل غیروں میں ہوئی۔ اور دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

''آپ تو اپنی تصویر سے بھی بہت زیادہ خوب صورت ہیں۔''

''مجھے پتا ہے۔'' میرا جواب بھی اتنا ہی بے ساختہ تھا۔ بہت ہنسے۔

پھر کہنے لگے آپ کے خیال میں زندگی گزارنے کے لیے سب سے ضروری چیز کیا ہوتی ہے؟''

میں نے کہا ''آکسیجن''

قہقہہ میں موصوف کو خود بھی بھول گیا کہ کس پائے کی تمہید باندھ رہے تھے۔ اب بھی کبھی کبھار چھیڑتے ہیں مجھے کہ تم تو آکسیجن ہو میری، زندگی گزارنے کے لیے سب سے ضروری۔''

اور ولیسے کی صبح دھلے دھلائے منہ کے ساتھ دیکھ کر فرمایا گیا۔ ارے اب تو رات سے بھی زیادہ پیاری لگ رہی ہو۔ (حد ہے ناں پہلے پتا ہوتا تو بچ جاتا نا بارہ ہزار پارلر کا، بس منہ دھو کر آ بیٹھتی)

بعد میں جب میں نے پوچھا کہ آپ نے پہلی دفعہ مجھے دیکھا تو کیا خیال آیا تھا؟

''ارے یار، میری تو لاٹری نکل آئی۔'' جتنا بے ساختہ جواب آیا تھا اتنی ہی بے ساختہ ہنسی بھی۔

س: میکے اور سسرال کے ماحول میں فرق تھا؟

ج: کافی فرق تھا میکے کا ماحول مذہبی ہے مگر لبرل سسرال میں تھوڑا سا گھٹا گھٹا سا ماحول لگا آغاز میں۔ میکے میں سب کے سب اچھی حس مزاح کے مالک اور بہت ہلچل والا ماحول تھا میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں باقی سب چھوٹے اور ابا نے تو کبھی احساس ہی نہ ہونے دیا باپ ہیں یا دوست۔ جب سسرال آئی تو اتنا بڑا گھر اور چار نفوس..... اف اتنی خاموشی، اور جب تک میرے شہزادے نہیں ہوگئے یہی حال رہا اور اب یہ حال ہے کہ دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن، ثابت ہوا کہ

انسان کیسی حال میں خوش نہیں۔ گھر میں صفائی کے لیے ماسی آتی تھی باقی کام خود کچھ عرصہ تک سب ٹھیک رہا پھر کام والی نے سارے گھر کا کام کرنا، سوائے میرے میں نے اعتراض کے بجائے اپنا کام خود کرنا شروع کر دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

س: شادی کے کتنے عرصہ بعد کام سنبھالا؟

ج: تقریباً ہفتہ ڈیڑھ بعد۔ کوئی باقاعدہ کھیر پکوائی نہ ہوئی۔ صبح نند ناشتہ بنا رہی تھی، میں نے خود ہی ساتھ جا کر چائے، آملیٹ وغیرہ بنانا شروع کر دیا اور ساتھ میں چھوٹے موٹے کام، کھانے میں کافی فرق تھا۔ میکے میں سب چاولوں کے گرویدہ، ہفتے میں چار دن چاول لازمی۔ خاص طور پر دوپہر میں۔ اور سسرال میں چاول کے نام سے الرجک، سب گوشت خور۔ اور میں بے چاری سیمی وبچی ٹیرین۔ میں نے یہ کیا کہ جیسا دیکھا ویسا بنانا شروع کر دیا۔ اپنے لیے جو مرضی بنائیں، اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا تو مسئلہ کیا ہونا تھا پھر۔

چائے البتہ میرا اور میری ساس کا مشترکہ شوق۔ دن میں بیسیوں دفعہ بنتی ہے۔

میرے سسر کو البتہ میرے بنائے کھانے بہت پسند آتے تھے۔ جب فرسٹ ٹائم میرے بیک کردہ بسکٹ کھائے تو ہنس کر کہنے لگے۔

''واہ! بیکری نہ بنا دوں تمہیں۔'' محنت وصول۔

نئی نئی ریسپیز ٹرائی کرنے پر نند بھی بہت خوش ہوتی اور سیکھنے کی کوشش کرتی۔

س: سسرال اور میکے کے ماحول میں فرق محسوس ہوا؟

ج: ماحول کی ان معمولی تبدیلیوں نے تو کوئی خاص فرق نہیں ڈالا۔ شوہر نامدار کے زریں خیالات نے البتہ ٹھیک ٹھاک صدمہ لگایا۔ تو جناب ہوا کچھ یوں کہ شادی سے قبل بھی میں چاہتی تھی کہ موصوف حاضر جواب ہوں، کیئرنگ ہوں، شاعری سے لگاؤ ہو اور رومانٹک تو بے حد ہوں۔ کیئرنگ اور حاضر جوابی کی حد تک چلو گزارہ ہو گیا مگر شاعری کی بات پر پہلا دھچکا شادی کے چوتھے روز ہی آ لگا۔ جب..... ''چلیں کوئی اچھا سا شعر سنائیں'' کی معصومانہ فرمائش پہ موصوف نے تاک تاک کے ایسے ''شعر'' مارے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ شہر بھر کہ رکشہ اور ٹرک ڈرائیورز ان کے ذوق سلیم سے مستفید ہوتے ہوں گے۔

وہ بھی شاید چہرے کے مدوجزر سے بھانپ گئے کہ اپنے کاج کی نازک دل شاعرہ کا دل کس زلزلے کی زد میں آیا ہے ——— جب اگلے دن میکے گئی تو ایک سے بڑھ کر ایک کلاسیکل شعر موبائل پہ بھیجا گیا۔ میں حیران ایسا انقلاب راتوں رات۔ استفسار پہ فرمایا۔

''انٹرنیٹ سے بھیج رہا ہوں۔''

ہاہاہا..... پیار پہلے آیا، ہنسی بعد میں.....

رومانٹک والی اسٹوری بھی درد بھری ہی رہی۔ بارش ہو تو بھیگنے کے بجائے موصوف کو پکوڑوں کی طلب جاگتی ہے اور لانگ ڈرائیو احمقانہ پن لگتا ہے پودے لگانے کا بڑا شوق ہے جناب کو۔ گھر میں چھ مرلہ کا لان ہے اور بھرا ہوا پودوں اور درختوں سے۔ جناب کے ہی کارنامے۔ مگر مجال ہے کبھی پھول توڑ کر دیا ہو، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ایک دفعہ شادی کے شروع کے دنوں میں سگنل پہ رکے تو گجرے لے لیے، ایک بچے سے موصوف نے۔ مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ لے کر ڈیش بورڈ پر ڈھیر دیے گئے۔

میں سارا رستہ انتظار کرتی رہی، جب گاڑی گھر کے پورچ میں آ رکی تو تنگ آ کر بول ہی اٹھی۔

''اب دے بھی دیں، خود پہنیں گے کیا؟'' کیا پہننے.....؟ چلو جی اب یہ بھی میں بتاؤں، یہ گجرے لیے کیوں تھے؟ ضبط کا گھونٹ بھرا۔

''ایسے ہی، چھوٹا سا بچہ تھا۔ انکار کرنا اچھا نہیں لگا مجھے اور خوشبو بھی تو آ رہی اتنی اچھی گاڑی سے۔''

چلو جی، چھٹی ہوئی۔ اب اتنی اچھی خوشبو سونگھتے موصوف کو ہمارے کباب ہوتے کلیجے کی بو خاک آتی۔

تعریف بھی جب کبھی بہت تیار شیار ہو کر آؤں تو آنکھیں جگر جگر چمکیں گی لیکن منہ سے فرمایا جائے گا۔

''پیسٹری لگ رہی ہو۔'' (پیٹو نہ ہو تو) واک پہ البتہ گھسیٹ کر لے جاتی ہوں ساتھ میں۔ باقی خوبیاں البتہ میری توقع سے بڑھ کر، نرم مزاج، محبت کرنے والے اور تعاون کرنے والے۔ آٹھ سال ہونے والے ہیں شادی کو، مجھے نہیں یاد پڑتا کبھی اونچی آواز میں بات بھی کی ہو اس شخص نے مجھ سے۔ بچوں کے لیے حد سے زیادہ مہربان اور نرم مزاج ابا جان، الحمدللہ۔

ہماری شادی پہ میری ساس نے مشترکہ فوٹو شوٹ نہیں ہونے دیا تھا یہ کہہ کر ہمارے ہاں رواج نہیں ہے۔ مجھے بڑا قلق تھا اس بات کا پانچ سو تصاویر کے البم میں دولہا دلہن کی چند تصاویر وہ بھی فیملی سمیت۔

شادی کی پہلی سالگرہ پہ موصوف نے مووی سے فوٹو شاپ سے مکس اپ کروا کے البم بنوالیا ہم دونوں کا۔ کیا ہی اوریجنل فوٹو شوٹ ہوتا ہوگا۔ شان دار۔ جب مجھے گفٹ کیا تو بہت اچھا لگا۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی اور کن پر تعریف؟

ج: آہاں تعریف بہت سی باتوں پر ہوئی۔ پہلے پہل تو اچھی شکل وصورت کے کافی ڈنکے بجے۔ بعد میں کوکنگ کی تعریف بہت ہوئی۔ ایک تبصرہ جو ہمیشہ اور ہر جگہ سے ہی سننے کو ملتا ہے ''پڑھی لکھی اور سمجھ دار'' (آہم آہم) اخلاق کی بہت تعریف ہوئی۔ پہلی بار جب ایک سسرالی رشتہ دار نے ابو کے سامنے کہا تھا۔

''کڑی نوں پچھن بلان دا پتا اے، کیسے گھر گھرانے دی لگدی اے، بہت سمجھ دار اے''

دنوں خوش رہے تھے ابو اس بات پر، اور میں بھی (ہاہاہا)

تنقید...... آاں سب سے زیادہ تنقید ہوئی دوپٹا ہر وقت نہ اوڑھنے پر۔ اصل میں ابو کے گھر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ باہر جاتے وقت چادر بھی لیتے، اسکارف بھی اور گھر کے اندر چاہے جینز پہن کر پھرتے رہو۔ سو مجھ سے دوپٹا سر پر اوڑھ کر کام ہوتا ہی نہیں تھا۔ اس پہ کافی باتیں سنیں۔ دوسری تنقید دیر سے اٹھنے پر ہوتی تھی، جب باقی گھر والے چھ بجے اٹھ جاتے ہوں تو آٹھ بجے نیچے آتی بہو دیر سے اٹھی ہی لگتی۔

کتابیں پڑھنے پر بھی...... ڈائجسٹ پڑھنا سسر کو نہیں پسند تھا تو شوہر نے اس کا حل یہ نکالا کہ تینوں ڈائجسٹ اسٹور پر لگوالیے۔ وہاں سے گھر لے آئے کہ نہ ہاں گھر آئے نہ ابا جی کو پتا چلے (جہاں چاہ وہاں راہ) اب تو گھر ہی آتے ہیں۔

س: سسرال میں وہ مقام ملا جو حق تھا؟

ج: تھوڑا سا زیادہ پوزیٹو اور وسیع القلب ہو کر سوچا جائے تو ''ہاں ملا'' فوراً سے کچھ نہیں مل جایا کرتا جناب۔ آپ جب ایک بنے بنائے سیٹ اپ میں آتی ہیں تو آتے ہی تاج تو کوئی نہیں پہنائے گا نا آپ کو۔

ٹھنڈی کر کے کھانی پڑتی ہے، ورنہ منہ کی بھی کھانی پڑ سکتی ہے (ہاہاہا)۔

ساس میری بہت ہی اچھی ہیں، اللہ ان کو لمبی عمر دے، صحت دے۔ آغاز میں نہ سہی چند سالوں کے بعد گھر کے اہم فیصلوں میں رائے بھی لی جانے لگی اور رائے کو اہمیت بھی ملنے لگی۔ دیور اور نند کی شادی ایک ساتھ ہوئی۔ وٹہ سٹہ، ساری شاپنگ مل جل کر ہی کی ہم نے۔ میری اماں کہا کرتی تھیں کہ یہ رشتہ میں نے تمہاری ساس کو دیکھ کر دیا ہے، بھلی مانس لگتی ہیں۔ وقت نے ان کا فیصلہ اور اندازہ بالکل صحیح ثابت کیا۔ ہمارے کبھی جھگڑے ہوتے نہ تو تکار، گھر سے باہر مارکیٹ، ہاسپٹل جہاں بھی ہم ساتھ ہوں تو لوگوں کو یہی لگتا کہ شاید ماں بیٹی ہیں، الحمدللہ۔

دیور کی شادی کے بعد کچھ مہینے مشکل تھے۔ دیورانی پتا نہیں کیا ذہن لے کر آئی تھی۔ ادھر سے گزرتے ''ہونہہ'' کرتی تو کبھی ادھر سے گزرتے۔ میں

حیران ہوتی رہتی کہ اسے کیا مسئلہ ہے۔ بلاوجہ باتوں کو کھینچ جانا، سال ڈیڑھ یہی حالات رہے۔ میں کبھی برداشت کرلیتی اور کبھی جواب دیتی کھینچ کے منہ پر۔

اس کا چونکہ وٹہ سٹہ تھا تو قدرتی طور پر کچھ دباؤ بھی تھا سسرال والوں پہ کہ اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ جب اس کا بڑا بچہ پیدا ہونے کو تھا تو میں میکے میں تھی، میرے بیٹے کو ٹائیفائیڈ ہوگیا، وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھا۔ ساس نے آنے کا فون کیا کہ گھر کب آنا ہے، میں نے کہا، بچہ بیمار ہے، ٹھیک ہوجائے تو آجاتی ہوں اور یہ بھی کہا کہ دیورانی کا ہاسپٹل کا ٹائم آنے تک لازمی گھر آجاؤں گی (میاں میرے باہر تھے ان دنوں.....)

''اتنی سی بات پر دیورانی نے مجھے میسج کیے کہ یہ کیوں کہا میرے ہاسپٹل جانے تک آجاؤ گی گھر۔'' مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری، میرے پاس میرا میاں ہے فلاں ہے فلاں ہے۔ آنا ہے تو آؤ نہیں آنا تو نہ آؤ۔ میرا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اور بہت سے اوٹ پٹانگ میسجز۔

مجھے آج بھی یاد ہے میں اس دن بہت روئی تھی ہاسپٹل میں ہی اپنے بیٹے کے پاس بیٹھ کر اتنا عناد اس کے دل میں کیوں ہے آخر۔

میں کوئی فرشتہ ہونے کی دعوے دار نہیں ہوں، غصہ بھی آتا، پھٹ بھی پڑتی ہوں بعض دفعہ مگر اللہ شاہد ہے میں نے آج تک دانستہ کسی کے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا۔ جب ہی مجھے اس کے رویے نے بے حد افسردہ کیا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس ایک ڈیڑھ سال کے تلخ دور کے بعد رفتہ رفتہ اسے بھی سمجھ میں آنے لگی کہ جو وہ خود سے فرض کیے بیٹھی ہے ویسا کچھ نہیں ہے۔ اور میں نے بھی فاصلہ سمیٹنے کی کوشش کی مزید۔

اور نتیجہ یہ نکلا جناب کہ پھر ہم دوست بنے اور پھر بہت اچھے دوست۔ اور اب یہ عالم ہے کہ اس کے دونوں بچے سارا دن میرے پاس ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے بچوں کا بہت پیار ہے آپس میں، میں نے اور اس نے بھی شہر کا کوئی ریسٹورنٹ نہیں چھوڑا جہاں ہم نے ''ڈیٹ'' نہ ماری ہو۔ لوگ ہمارے گھر کے امن اور محبت کی مثالیں دیتے۔ (مثلاً)

نصیحت..... لیں جی میرا اتنا طویل اعمال نامہ پڑھ کر آپ نے کوئی نصیحت حاصل نہیں کی جو الگ سے کروں؟ سیانے ہوں نا دیکھ کر سیکھا کرو۔ خیر جناب میرے اس سارے سفر کا نچوڑ یہ ہے ''مثبت رہیں'' زندگی ہے نا، جب تک چلے گی مدوجزر تو آئیں گے۔ آپ نے کرنا یہ ہے کہ مارجن دینا ہے سب کو۔ جگہ دینی ہے اور اپنے آپ کو رکھنا ہے پازیٹو نہ ان کے لیے نہیں' خود اپنے لیے' اپنے سے تو پیار ہوگا نا آپ کو۔ نہیں ہے تو کریں نا۔ آپ خود اپنے آپ سے پیار نہیں کریں گی تو کوئی دوسرا کیوں کرے گا۔ آپ مثبت سوچیں گی تو آپ ڈپریشن سے بچیں گی۔ ذہنی صحت بھی ٹھیک، اور جسمانی بھی (بھئی موٹی نہیں ہوں گی) اور یقین رکھیں حالات بھی ٹھیک ہوجائیں گے رفتہ رفتہ ہی سہی۔ بتایا تھا نا آپ کو ٹھنڈی کر کے کھانی پڑتی ہے۔''

ہاں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی اپنے گھر کے بوجھ خود اٹھائیں۔ اپنی امی کے ابا کے یا بہنوں کے اوپر نہ لاد کر آئیں۔

شادی ہوگئی نا۔

''بڑی ہوجائیں اب۔ ہر معاملے میں میکے کو اطلاع دینا ضروری ہے نہ ان کو انوالو کرنا، آپ کا گھر، آپ کی زندگی، آپ کے مسئلے تو حل بھی 'آپ' ہی کو کرنے ہیں اور آخر کرلیں گی۔ مجھے پتا ہے۔

مسئلے وقتی ہوتے ہیں۔ ''عزت'' دائمی ہوتی ہے۔ آپ ہر مسئلہ کا اشتہار لگائیں گی تب بھی حل وہ اپنے وقت پر ہی ہوگا پر آپ کے بھرم اور عزت پر لکیر ضرور ڈال جائے گا۔ کیا سمجھیں؟؟

خوش رہیں، کم از کم کوشش تو کریں نا، سیکھ جائیں گی رفتہ رفتہ،

کہتے ہیں یہ بھی آرٹ ہے۔ اچھے آرٹسٹ بنیں نا، یہ زندگی اک حق ہے آپ پر..... دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆☆

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔37۔اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

رابعہ خان نے لسبیلہ گارڈن کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

بہت عرصہ میں نے اخبار جہاں اور دیگر اخبارات میں مضامین تحریر کیے۔ اسی حوالے سے خود بھی مطالعہ کی شوقین ہوں۔ میں گزشتہ سال ستمبر میں گورنمنٹ اسکول سے ایچ ایم (ہیڈ مسٹریس) کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئی ہوں۔ میرے والد بھی سندھ یونی ورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے اور بے شمار کتابوں کے خالق۔ خیر جو میں نے جرأت کی ہے۔ میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ جو ہر ماہ باقاعدگی سے ہمارے گھر آتے ہیں، بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ کا رسالہ ہر نقص، ہر غلطی سے پاک ہوکر ترقی کرے، آمین۔

آج ایک تحریر شعاع سالگرہ نمبر اگست 2020 میں پڑھی۔ عنوان تھا ''عید ماما اور تہذیب'' رائٹر محترمہ بسمہ شانزے پارس نواب۔ اس تحریر کو پڑھ کر محترمہ کی نالج اور تربیت میں کمی کا شدت سے احساس ہوا۔

گورنمنٹ جاب میں ساٹھ سال میں ریٹائرمنٹ لازمی ہے جبکہ اس میں پرنسپل کی عمر 72 سال دکھائی گئی۔ پھر ستر بہتر سالہ معزز خاتون کو غیر مہذب القابات سے نوازا گیا۔

بہرحال اس طرح کی تحریر کے بے شک جو فرضی ہے، عام گھریلو لڑکیاں، کم تعلیم یافتہ خواتین پر برے اثرات ہوں گے کیونکہ اکثر و بیشتر ڈرامے، فلمیں دیکھ کر کم عقل یا کم تعلیم یافتہ لوگ، ان کے رول کو اپناتے ہیں۔ اتنی ذمہ دارانہ پوسٹ کی عورت، دو دو گھنٹے کہیں نہیں بیٹھ سکتی۔

ج: بہن رابعہ! یقین کریں آپ کا خط پڑھ کر ہمیں افسوس (بلکہ دکھ کہیں تو زیادہ مناسب ہے) ہوا ہے۔ جو کچھ ہوا نادانستگی میں ہوا۔ معلم کے پیشے کی اہمیت اور معلم کی عزت سے انکار ممکن نہیں، آپ پرنسپل اور ایکسٹرا، بائیس گریڈ کی بات کررہی ہیں، ہم تو اس کی بھی عزت کرتے ہیں جس نے ہمیں ایک لفظ بھی سکھایا ہو۔ ہم اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں، آئندہ مزید خیال رکھیں گے۔

سیدہ ماہم شاہ کراچی سے لکھتی ہیں

میں پہلی دفعہ شرکت کررہی ہوں۔ آپ مجھے اس خط کے بعد بتا دیجیے گا کہ ای میل کے ذریعے بھیجتے وقت صرف ان پیج اردو میں ٹائپ کرکے بھیجنا چاہیے۔

میں نے اگست اور جولائی کا شعاع ایک حاصل کیا۔ ساتھ ہی میں نونہال کی بھی قاری ہوں اور اس میں لکھتی ہوں۔ اس لیے اس مصروف روٹین کے دوران میں پورا شعاع نہیں پڑھ پائی۔ جتنا پڑھا ہے اسی نے شعاع کا دیوانہ بنا دیا۔ پرچے کی بات کی جائے تو عمارہ جہاں مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا کن لفظوں سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے ''مشکلیں مجھ پر'' لکھ کر قسم سے میرا سانس روک دیا۔ ارے بھئی! مطلب آپ کا افسانہ پڑھتے ہوئے میں کھوگئی۔

زمرپھوپھو..... فارس ماموں..... ہمارا سعدی.....

بقیہ صفحہ نمبر 244 پر

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکائنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کر سکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام ''عمران ڈائجسٹ، اکاونٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030'' کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/7000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/8000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

نعیمہ ناز

سحر ہونے تک

عالیہ بیگم اپنی بیٹی حمنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دینی چاہیے۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیز ے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ میں پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خودسر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر بہت ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مرمٹا ہے۔

چنبلی کا تعلق بازار حسن سے ہے طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا ہے جو چنبلی کے حسن پر مرمٹا ہے۔

شاہ میر رسول بخش کا سب سے چہیتا شاگرد تھا، جو ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔

احمد فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران انکل اسے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ ملی۔ انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جا گرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

سرمد سو رہا ہوتا ہے تو جمال کا فون آتا ہے۔ اپنی بدقسمتی پر کڑھتی نائلہ کو جمال کی کال ایک نعمت لگتی ہے۔ جمال اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے پھر سبز باغ دکھاتا ہے۔ اچانک نائلہ کی نظر اٹھتی ہے تو سامنے کھڑا سرمد اسے عجیب نظروں سے دیکھتا نظر آتا ہے۔

طلال چنبیلی کے شادی پر اصرار کرنے پر ہامی بھر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد مہک جان سے بات کرے گا۔ مہک جان سے بات کر کے وہ اس کی شرائط مان کر چنبیلی سے نکاح کر کے لے جاتا ہے۔

احمد کے انتقال کے بعد عائشہ اور اس کی امی بہت سارے مسائل کا شکار ہوتی ہیں لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے کسی سے قرض ادھار نہیں لیتیں۔

ایک سلائی کے سوٹ کے لیے لیس اور دھاگہ خریدنے کے لیے عائشہ کو بازار جانا پڑتا ہے۔ شام زیادہ ہو جاتی ہے، وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے مانی بصد اصرار اسے لفٹ دیتا ہے۔ مانی کی امی اور بہن ماریہ گاڑی میں مانی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھتی ہیں لیکن پہچان نہیں پاتیں۔ مانی پوچھ گچھ پر ماریہ کے سامنے عائشہ کا نام لے دیتا ہے۔

جمال دوپہر میں فون کر کے نائلہ کو ہوٹل لے جانے کی بات کرتا ہے۔ دروازہ بجنے پر وہ باپ کو دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی ہے۔ سید صاحب اس کا فون اٹھاتے ہیں۔ سید صاحب کے جانے کے بعد نائلہ جمال سے ملنے چلی جاتی ہے جہاں وہ ایک دوسرے سے التفات کا اظہار کرتے ہیں۔ جمال اسے اپنے تعمیر شدہ بنگلے میں لے جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے۔

چنبیلی طلال کے ساتھ شادی ہو جانے پر بہت خوش ہے۔ طلال اسے بتاتا ہے کہ ہر چیز جو اسے پسند آ جائے وہ قید کر لیتا ہے اور اس قید سے رہائی اس کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔

سید صاحب اپنے بیٹے فرحان سے اس کی شادی کی بات کرتے ہیں تو وہ پھر ٹال دیتا ہے۔ حمنہ کے نکاح والے دن مانی، عائشہ کا انتظار کرتا ہے۔ ماریہ جو اس کی ہے اس سے پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی امی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔

عائشہ کی خالہ کا فون آتا ہے وہ عائشہ کی امی سے کہتی ہے کہ جوان بچی کے ساتھ اکیلی کیسے رہو گی میرے پاس آ جاؤ، عائشہ کی امی انکار کر دیتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کب تک بہن کو انکار کروں گی اگر مجھے کچھ ہو گیا تو عائشہ کا کیا ہو گا۔ وہ عائشہ کے رشتے کی بات کرتی ہیں۔

جھکا جان بڑی لی کو ڈانٹتی ہے کہ تم اس انتظار میں رو رو کے کیوں مر رہی ہو، وہ نہیں آئے گا۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مر مرا گیا۔ تارا جھکا جان کو کبیر صاحب کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔

نائلہ جمال کے گھر سے آنے کے بعد بھی اسی تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔ سرمد آتا ہے تو اسے بخار ہوتا ہے۔ وہ نائلہ سے چائے بنانے کا کہتا ہے نائلہ منع کر دیتی ہے اور گلی کے نکڑ سے اسے چائے لانے کا کہتی ہے۔ واپس آ کر سرمد، نائلہ سے پوچھتا ہی ہے کہ وہ آج دن میں کہاں گئی تھی۔

چنبیلی طلال کو ماں بننے کے متعلق بتاتی ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں ہمارے یہاں خاندانی بیوی سے بچہ پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ ہم چھ بھائی ہیں اور چھٹا بھائی لاڈلا چیتا یہ شادی کے چھٹے مہینہ پیدا ہوا تھا۔

ماریہ، عائشہ کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے رشتے کے لیے شام میں کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ مانی اتفاقاً وہاں سے گزرتے ہوئے سن لیتا ہے۔

ظفر صاحب کی بیٹی کو فائرنگ کے ذریعے ڈرا کر ان کو عملی دھمکی دی جاتی ہے۔

چنبیلی بیٹے کی پیدائش پر طلال کی توجہ پا کر پھر اپنا خیال رکھتی ہے لیکن طلال نشے میں چور گھر آ کر اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے پاس سے آ رہا ہے۔ چنبیلی کے سوال پر کہتا ہے کہ تو تو بیوی ہے محبوبہ تو وہ ہے جو فلیٹ میں رہتی ہے۔

جان محمد کی بیٹی کو ایکسیڈنٹ کے ذریعے مروا دیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی بین کرتی ہے اور چلا چلا کے قاتلوں کے نام

لیتی ہے اس کی رشتہ دار اسے چپ کرانے کی کوشش کتی ہیں لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتی۔ میڈیا کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی کیس کے اہم گواہ کی بیٹی کی ایکسیڈنٹ میں موت۔ میڈیا کی بڑی تعداد اس کے گھر جمع تھی۔

ماریہ، شاہ میر کے ہاتھ کا سلا سوٹ دیکھ اس کی تعریف کرتی اور اسے کہتی ہے کہ تم اپنے چاچا کو تنگ کیوں کرتے ہو۔ انہوں نے تمہاری شکایت کی ہے۔ نائلہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اپنی کیفیت خود نہیں سمجھ پاتی۔ وہ ڈرتی ہے کہ باہر جانے پر پہچان لی جائے گی۔ جمال اس کا یہ حل نکالتا ہے کہ اسلام آباد شفٹ ہو جائے۔

امداد بروہی پریس کانفرنس کر کے صفائی پیش کرتا ہے کہ جان محمد کی بیٹی کو مارنے میں اور ظفر صاحب کی بیٹی پر فائرنگ میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

جان محمد کے جیل میں سارے عیش و آرام ختم ہو چکے تھے، اسے انتہائی بدبودار اور غلیظ کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا تھا۔ جب سے اس نے گولی نہ چلانے کا بیان دیا تھا اس پر شدید ٹارچر ہو رہا تھا۔

ترنم نے روتے روتے ارمانوں سے کرایہ پر لیا گھر خالی کیا، اماں دو ملازم ساتھ لائی تھی جو سارا سامان پیک کر رہے تھے۔ اسے تو ہوش نہ تھا ایک سوچ پریشان کر رہی تھی کہ اپنی کیا بات تھی جو اس نے دل پر لے لی اور دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

سامان لوڈ ہو گیا تو اماں نے اسے اور بچوں کو ٹیکسی میں بٹھایا۔ خلیل نے جاتی ٹیکسی دیکھ کر کہا، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں ایک عورت چاچا سے ملنے آتی ہے اور پوچھتی ہے کہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔ کیسا ہے وہ۔ چاچو کہتے ہی کہ ٹھیک ہے۔ وہاں ماریہ بھی چاچا سے ملتی ہے، وہ اپنی دوستوں کے ساتھ وہاں آتی ہے۔ عورت اٹھ کر چلی جاتی ہے، چاچا کسی سوچ میں گم تھے۔ شاہ میر ایک یتیم خانے میں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ خرچ کرتا ہے۔

عالیہ بیگم بیٹی کی شادی کے لیے زیورات نکالتی ہیں، شوہر مانی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کی پسند کی لڑکی کے گھر کب جانا ہے، وہ انکار کر دیتی ہیں۔

عائشہ کی خالہ کا بیٹا ذوہیب گھر والوں کو سرپرائز دینے کے لیے ایک ہفتے پہلے آ جاتا ہے۔

ظفر صدیقی صاحب کو وفاقی وزیر بچل شاہ پولیس کے اعلا افسر کے ہمراہ اپنے گھر بلا کر انہیں مقدمے کو ختم کرنے کا کہتا ہے۔ پولیس افسر کرم الٰہی بھی انہیں سمجھاتا ہے کہ جان محمد اب بیان ولی شاہ کے حق میں دے گا۔ بچل شاہ ایک لفافے میں بلینک چیک دیتا ہے کہ اپنی مرضی کا اماؤنٹ بھر لیں۔ مانی یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ظفر صاحب نے قصاص کے پیسے لے لیے۔

ترنم کی عدت ختم ہو جاتی ہے۔ ماں اسے کہتی ہے کہ وہ کچھ ہار سنگھار کر لے۔ ترنم اپنے بیٹے کی بسم اللہ کرنے کے لیے کہتی ہے۔

جمال فون سن کر زرد پڑ جاتا ہے۔ وہ نائلہ سے کہتا ہے کہ اپنا پرس اٹھاؤ اور چلو۔ وہ نائلہ کو خوب پیدل گھماتا پھراتا آگے بڑھتا ہے وہ کسی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ ایک جگہ جا کر وہ موٹر سائیکل کی پاس رکتا ہے اور اس پر بیٹھے ایک عجیب و غریب حلیے والے لڑکے کو کہتا ہے کہ نائلہ کو محفوظ جگہ پہنچا دے۔ وہ اسے انتہائی نچلے متوسط علاقے کے ایک گھر میں لے آتا ہے اور وہاں ایک عورت آ کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو۔

طلال کے پاس اس کے باپ کا فون آتا ہے کہ وہ ظفر صدیقی والے کیس سے دور رہے کیونکہ ان کے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ جھنڈے والی گاڑی کا خواب طلال کو اس کیس سے دور کر دیتا ہے۔

پریا طلال کی دیوانگی سے تنگ آ جاتی ہے۔ طلال اسے کہتا ہے کہ جو چیز اس کی ہوتی ہے وہ کسی اور کے قابل نہیں رہتی۔ وہ اس کے چہرے پر تیزاب ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ نائلہ کو پتا چلتا ہے کہ وہ جمال کا گھر ہے، راکٹ اس کا بھائی اور وہ لڑکی اس کی بھابھی ہے۔

چنبیلی طلال سے لڑ کر اپنا سامان پیک کرتی ہے۔ طلال اسے مارتا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ باہر نہ جانا۔ چنبیلی انتہائی بری حالت میں کوٹھے پر پہنچتی ہے۔ سب اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اچانک چنبیلی کی چیخوں سے پورا گھر لرز جاتا ہے۔

چنبلی کی چیخ سن کر جب سب اس کے کمرے میں پہنچتے ہیں تو اس کا چہرہ تیزاب کی وجہ سے موم بتی کی طرح پگھل رہا

تھا۔

ترنم کا بیٹا سپارہ پڑھنا شروع کر چکا ہے۔ ترنم بہت خوش ہے۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچو۔ وہ اسے شیخ صاحب کا بتاتی ہے۔ ترنم کہتی ہے کہ میں اپنے دونوں بچوں کو نہیں چھوڑوں گی۔

سومی، نائلہ کو بتاتی ہے کہ جمال پہلے یہاں ہی رہتا تھا۔ چھ مہینے پہلے گیا ہے اور وہ راکٹ کا بڑا بھائی اور اس کا جیٹھ ہے۔ راکٹ کے آنے پر بات ٹل جاتی ہے۔

جھمکا جان طلال کے خلاف ایف آئی آر درج کراتی ہے۔ چاچڑا سے سمجھاتا ہے کہ پرچہ تو کٹ جائے گا مگر طلال کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

عائشہ جس اسکول میں پڑھاتی ہے وہاں کچھ غنڈے آ کر ان کا سامان اٹھا کر پھینکتے ہیں اور انہیں ڈرا دھمکا کر جاتے ہیں۔

مانی کے لیے یہ بات انتہائی صدمے کا باعث تھی کہ شاہ زین کے گھر والوں نے اس کے قاتلوں سے مذاکرات کر کے کیس ختم کر دیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے ذوہیب اپنی امی سے باتیں کر رہا تھا عائشہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی کہ اچانک ذوہیب ماں کی آواز پر چونکتا ہے وہ بتاتی ہیں کہ ان کے سینے میں شدید درد اٹھا ہے۔ ذوہیب عائشہ سے کہتا ہے کہ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ خالہ کی حالت پر عائشہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔

اٹھارھویں قسط

جھمکا نے کچھ دیر انتظار کیا، چند منٹوں بعد جمال کا میسج آ گیا، اس نے ایڈریس بھیج دیا تھا، جھمکا نے اسے پڑھا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

زندگی کٹھن ہے۔ دنیا اس سے زیادہ سخت جگہ ہے۔ زیست مشکل ہے، اسے کاٹنا آسان نہیں، وہ انتہائی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اکیلا مرد، مسائل اور مشکلات کا کوہ گراں تھا، جو عبور کرنا تھا، پھر بھی ٹھیک سے یقین نہیں تھا کہ اس سے آگے کیا ہو؟ کوئی منزل یا ایک اور کوہ گراں؟

گھر سے نکل کر چاند سیدھا اپنے محسن و مربی مولوی صاحب کے پاس گیا تھا جو اس کے استاد بھی تھے، رہنما، دوست بھی، ہمدرد بھی، مسیحا بھی اور خضر بھی، چاند نے ان سے کسی ایسے ٹھکانے کی درخواست کی تھی جہاں وہ روپوش ہو جائے اسے ڈھونڈا نہ جا سکے۔

مولوی صاحب اس کے حالات سے اتنا ہی واقف تھے جتنا کہ وہ کبھی کبھار ذکر کر دیتا تھا ویسے بھی وہ طبعاً خاموش طبع تھا۔ اس کی ذات کسی گہرے سمندر کی مانند تھی۔ اپنے قریبی لوگوں پر بھی آشکار نہیں تھا، مولوی صاحب نے فی الحال تو اسے اپنے بھائی کے گھر بھجوا دیا تھا، وہ علاقہ یہاں سے کافی دور تھا۔

چاند کی روپوشی کے ساتھ ہی اس کے لیے مشکلات کا ایک نیا دور شروع ہوا جن کے بارے میں اسے تھوڑا بہت اندازہ تھا مگر یہ مشکلات اس کے اندازے سے کہیں بڑھ کر تھیں۔

☆☆☆

لان کے کڑھائی والے سوٹ کے ساتھ پرنٹڈ شیفون کا دوپٹہ، اسکارف کے انداز میں اوڑھے ہوئے وہ لیپ ٹاپ پہ جھکی کام کر رہی تھی۔ کچھ دیر آنکھوں اور کمر کو آرام دینے کے لیے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ تب ہی آفس کے دروازے پہ دستک ہوئی۔ یہ مانی کی مخصوص دستک تھی، وہ عموماً اپنی

کی چین سے دروازہ بجا کر پھر اندر آتا تھا، عائشہ جلدی سے سیدھی ہوگئی۔
مانی اندر آیا رسمی علیک سلیک اور معمول کی رپورٹ لینے کے بعد اس نے فروا کی شادی کا کارڈ عائشہ کے سامنے رکھا۔
''یہ اس دن ماریہ بھول گئی تھی۔''
''میں نے کہا تو تھا کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے، میں تو یوں بھی آ ہی جاتی۔'' عائشہ نے کارڈ اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔
''اس دن آپ کے فیانسی سے مل کر اچھا لگا، پرسنالٹی اور مینرز دونوں ہی بہترین ہیں۔''
مانی کی بات سن کر وہ اک دم ساکت ہوگئی۔ پھر اس کی حیرت بھری نگاہیں اس دشمن جان پہ مرکوز ہوگئیں۔ اسے اس قسم کی بات کی توقع نہیں تھی جو اس کے سامنے بیٹھے اس شخص نے کی۔
''آپ کو کس نے بتایا کہ وہ میرے منگیتر ہیں؟''
''سنا تھا کبھی۔''
''اور آپ سنی سنائی باتوں پہ یقین کر لیتے ہیں؟''
''جس کی زبان سے سنا، اس پر بھروسا ہے اس لیے یقین بھی آ گیا۔''
''اوہ۔'' عائشہ یک لخت ہی سب سمجھ گئی۔
دروغ بر مصلحت کبھی کبھی انسان کے گلے پڑ جاتا ہے، حرا کے لائے ہوئے پروپوزل سے جان چھڑانے کے لیے جو جھوٹ بولا تھا وہ اس طرح سامنے آئے گا؟ عائشہ کو اندازہ نہ تھا۔
کبھی ہماری سمجھ چھوٹی ہو جاتی ہے اور معاملات بہت مشکل، نہ سمجھ میں آتے ہیں نہ قابو، آگے اب کچھ کہنا، انا اور وقار کے منافی ہوتا شاید، اس کی آنکھیں بے بسی سے جھک گئیں۔
''کاش کہ تم کہتیں کہ یہ جھوٹ ہے غلط ہے۔'' مانی نے اپنے دل کی صدا کو دل کے اندر ہی رکھا۔ عائشہ کی آنکھوں کی بے بسی، خود اس کی نگاہوں میں بھی اتر آئی تھی۔

☆☆☆

گھر میں خوشیوں کی کہکشاں اتری ہوئی تھی، دو روز پہلے حمنہ اپنے گل گوتھنے چھوٹے سے بیٹے کے ہمراہ وارد ہوئی تھی اور آج بڑی دادی کی تشریف آوری ہوئی تھی، فروا کی شادی کی خوشی دیدنی ہوگئی تھی۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑی ہوئی تھی اور ساتھ ساتھ ایک ہنگامہ بھی۔
حمنہ کا بیٹا سب کے لیے ایک چھوٹا سا کھلونا بنا ہوا تھا۔ کبھی مانی اسے ہوا میں اچھالتا، اپنی بہنوں کی چیخیں اور بڑوں کی ڈانٹ سنتا اور کبھی ماریہ اسے دبوچے بے تحاشا پیار کر کر کے اس کے گلابی گال سرخ کر دیتی۔ فروا کا کچن میں جانا ممنوع اور گھر کا کوئی بھی کام منع تھا۔ اب شریفہ بیگم کے علاوہ ایک اور ملازمہ رکھی گئی تھی۔ دونوں مل کر کچن اور گھر کے دیگر کام بخوبی سنبھال رہی تھیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے اتنی سختی نہیں کی تھی، جتنی بیٹا کر رہا تھا۔ ان کا بلاوجہ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سب منع تھا۔ ایک کل وقتی ملازم لڑکا رکھ لیا تھا جو ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اگرچہ وہ اس تیمارداری کو اتنا ضروری خیال نہیں کر رہے تھے، مگر عارف بہت پریشان اور فکرمند ہو گیا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں، کوئی بیماری نہیں ہے، بس..... بس پچھتاوا ہے۔''
آج برسوں بعد خود سے اقرار کیا تھا، دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی، ابھر ابھر کر ڈوب رہا تھا، ڈوب ڈوب

کرا بھر رہا تھا۔ ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے کچھ ہیولے، کچھ چہرے تھے جو لہرا رہے تھے اور ایک چہرہ واضح تھا جو اس دن اسپتال میں دیکھا تھا۔

اگرچہ اس چہرے پہ کرختگی تھی، بڑھتی عمر کے سائے اور گزرے وقت کی تلخیاں رقم تھیں مگر ان دلکش نقوش میں چھپی ماضی کی منی کا چہرہ انہوں نے پہچان لیا یوں چشم زدن میں جان لیا جیسے گھپ اندھیرے میں یکا یک ماچس کی ایک تیلی کوئی جلادے اور اگلے ہی لمحے بجھا بھی دے۔ مگر اس ایک لمحے کی جو روشنی ہوئی تھی، اس پل بھر کے اجالے میں سب کچھ صاف صاف نظر آ بھی جائے، اپنی خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ وحشت زدہ سے تھے۔ کہانی ہو یا انسان، ہر ایک کا اگر آغاز ہے تو انجام بھی ہے انہوں نے جو کہانی شروع کی تھی اس کا اختتام ابھی باقی تھا۔ وہ جو کبھی کبھی ایک کسک محسوس ہوتی تھی۔ آج ایک مکمل خلش بن چکی تھی، ایک کسک کے ساتھ زندگی کٹ گئی وقت گزر گیا مگر اب جو خلش، احساس جرم اور پچھتاوے کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی اس کے ساتھ وقت گزر رہا تھا نہ زندگی، آغاز کو انجام دینا ضروری تھا، کہانی کو اختتام دینا ناگزیر تھا۔ اپنی لایعنی سوچوں میں وہ بری طرح بھٹک رہے تھے۔

☆☆☆

موبائل ہاتھ میں لیے کچھ دیر تک وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر کسی کو کال کرنے لگی۔ نائلہ منتظر اور ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا جمال نے مجھے بلایا ہے؟''

جھمکا نے منہ پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک موبائل کان سے لگائے رکھا پھر جھنجھلا کر پٹخ دیا۔

''ایک تو اس چاچڑ کمینے کا نمبر ہر وقت بزی ہی رہتا ہے پورے ملک کی پولیس کو یہی تو کنٹرول کر رہا ہے۔'' جھمکا بڑبڑا رہی تھی جب نائلہ نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔

''تیری دلچسپی ختم نہیں ہوئی، ابھی تک سبق نہیں ملا تجھے؟'' جھمکا نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھورا۔

''وہ مجھے بلا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ.....'' نائلہ کے دل میں امید کی ایک جوت جاگی مگر بولتے بولتے ہکلا سی گئی۔ جیسے اندر سے کوئی اس کی اس امید کو جھٹلا رہا ہو۔

''ہاں بول، کیا مطلب ہے اس کا، تیرے عشق میں پاگل ہو گیا ہے وہ؟ مجھ سے زیادہ نہیں جانتی ہے اسے، پکا کمینہ ہے، کوئی موٹی آسامی دیکھ لی ہوگی تیرے لیے، تب ہی لے جا رہا ہے۔''

جھمکا نے اسے آئینہ دکھایا اور اس آئینے میں نائلہ کو اتنی بھیانک تصویر نظر آئی کہ وہ خوف کے مارے زرد پڑ گئی۔ مگر پھر بھی ایک آس، ایک امید یا شاید مجبوری تھی جو جمال سے دوبارہ امید باندھ رہی تھی۔ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا نہ ہی ٹھکانہ، یہاں مستقل تو نہیں رہ سکتی تھی، بے سمت و بے نشان زندگی میں جمال کو ہی اپنا آسرا اور سہارا تصور کر رہی تھی۔ مگر جھمکا، اپنے نام کی بس ایک ہی تھی، ایسی خوں خوار نظروں سے اسے گھورا تھا اور ایسے سخت لب و لہجے میں اسے لفظوں کی مار ماری تھی کہ وہ اپنی جگہ بت بن گئی تھی۔

جھمکا اب دوبارہ اپنے سیل فون کی جانب متوجہ ہو گئی تھی، کال ملا کر کان سے لگائے بیٹھی تھی۔ دوسری بیل پر ہی چاچڑ نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو ہاں جھمکا، کیا خبر ہے؟''

''جمال کے بارے میں خبر ہے، ایک ایڈریس ہے میرے پاس، اگر گرفتار کرنا ہو تو دیکھ لو وہاں جا کر۔''

''پکی خبر ہے؟'' چاچڑ فوراً مستعد ہوا۔ جمال بہت عرصے سے مطلوب تھا پولیس کو، اگر وہ اس کی گرفتاری

میں کامیاب ہو جاتا تو کوئی نہ کوئی انعام یا پروموشن کے چانسز بڑھ جانے تھے۔
''سو فیصد پکی ہے، مگر دیر نہ کرنا۔''
فون آف کر کے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی اور اس نے دیکھا ہی نہیں کہ نائلہ کیسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی ہے؟

☆☆☆

چائے بنا کر ٹرے میں دو مگ رکھ کر سیدھی خالہ کے کمرے میں ہی چلی آئی۔ ''راشدہ (ملازمہ) بنا لیتی بیٹا، تم کیوں اتنی زحمت کرتی ہو؟''
خالہ الماری کھول کر کھڑی تھیں، عائشہ کو چائے لاتا دیکھا تو بے اختیار بول پڑیں، ویسے وہ اکثر ہی اسے ٹوک دیتی تھیں، جب وہ ان کے لیے چائے، کافی وغیرہ بنا کر لے آتی۔
''مجھے اچھا لگتا ہے خالہ! امی کے لیے بناتی تھی تو.....'' عائشہ کے چہرے پہ اداسی چھا گئی، ماں کی یاد جب بھی آتی اسے اپنے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔
''مجھے بھی اچھا لگتا ہے جب تم اتنے پیار سے میرے لیے کچھ کرتی ہو تو، بس یہ سوچتی ہوں کہ کہیں میری عادتیں نہ خراب ہو جائیں۔'' خالہ نے مسکراتے ہوئے مگ اٹھایا۔
ان کی بات سن کر عائشہ بھی ہولے سے مسکرا دی مگر ایسی مسکراہٹ جیسے اندر کوئی کشمکش ہو جو اس مسکراہٹ کا بالکل بھی ساتھ نہ دے رہی ہو۔
''خالہ! ایک بات پوچھوں؟'' چائے کا سپ لے کر عائشہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے خالہ کی طرف دیکھا۔
''اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ پوچھو۔''
''میں نے جب سے ہوش سنبھالا، سوائے آپ کے اپنا کوئی رشتے دار کبھی نہیں دیکھا۔ نہ امی کو دیکھا کسی کے گھر جاتے ہوئے یا کسی سے ملتے ہوئے اور نہ ہی ہمارے گھر کبھی کوئی آیا، آپ اور امی دو بہنیں تھیں، کوئی بھائی نہیں تھا مگر کیا آپ کے اور کوئی رشتے دار وغیرہ کوئی نہیں ہیں؟ اور میری ددھیال میں؟ امی سے جب بھی سوال کیا وہ ٹال جاتی تھیں۔''
عائشہ نے آج پہلی بار ان سے اپنی الجھن شیئر کی تھی۔ آج سے پہلے کئی بار اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ خالہ سے اس بارے میں سوال کرے مگر وہ سوچ کر ہی رہ جاتی، مگر اب جہاں وہ مختلف خیالات میں الجھی رہتی اور خود سے الجھتی رہتی، وہیں اس سوال نے بھی ادھم مچایا ہوا تھا، بھنور بن کر دل و دماغ میں چکراتا رہتا تھا۔ آج اس نے جی کڑا کے یہ الجھن سلجھانے کی کوشش کی۔ اگرچہ دماغ کے کسی گوشے میں یہ ڈر بھی تھا کہ خدا جانے کس حقیقت کا انکشاف ہو۔ بعض بعید جب تک چھپے ہوئے ہوں انسان مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے اور جب وہ بعید کھل جائے تو انسان کو مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ بے خبری بھی کبھی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مگر عائشہ نے ان وسوسوں اور خدشات سے نڈر ہو کر خالہ سے سوال کر ہی لیا اور وہ عائشہ کی بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔
ماضی میں سفر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر اس سے جڑی یادیں ناخوشگوار اور تکلیف دہ ہوں تو وہ تکلیف ہر اس پل بھی محسوس ہوتی ہے جب انسان ماضی کو یاد کر رہا ہو یا بیان کر رہا ہو۔

☆☆☆

شہر کے سب سے مہنگے اسپتال کا وی، آئی، پی روم کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے پرتعیش کمرے سے کم نہ تھا جہاں

ہر سہولت، ہر آرام موجود تھا مگر اس جگہ ان کا قیام دو دن ہی رہا۔ اس کے بعد ڈسچارج ہو کر گھر واپس آ گئے، ایکسیڈنٹ سچ مچ ہوا تھا مگر اتنا شدید نہیں تھا۔ گاڑی اور بڑے ملک صاحب، دونوں کو معمولی نوعیت کی چوٹیں اور دھچکے لگے تھے، گاڑی قیمتی اور نئی تھی، معمولی دھچکوں اور خراشوں کو برداشت کر گئی، مگر بڑے ملک صاحب کی عمر کا تقاضا تھا کچھ بیٹے کے حوالے سے مصلحت سے کام لیا۔

انہوں نے اپنی تکلیف کو کئی گنا ضرب دے کر بیٹے کو بلوا تو لیا تھا مگر بیٹے کی شکل سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کتنا بھنایا ہوا ہے، اسے اپنے تاثرات چھپانے نہیں آتے تھے نہ ہی وہ اپنے باپ کی طرح اداکاری پہ یقین رکھتا تھا۔ شاید اسی لیے کبھی کبھار بڑے ملک صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ان کا بیٹا ایک اچھا اور کامیاب سیاست دان نہ بن سکے۔

اس وقت بھی طلال ان کے جہازی سائز بیڈ کے سرہانے رکھی کرسی پہ ٹانگیں پھیلائے نیم دراز تھا اور بے زاری کے عالم میں جمائیاں لے رہا تھا۔ اس کی کوفت اور جھنجلاہٹ باپ سے چھپی ہوئی نہ تھی، جو سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے۔

''کب تک ان ٹکے ٹکے کی عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہے گا؟ جھنڈے والی گاڑی میں بیٹھنا ہے یا نہیں؟''

بڑے ملک صاحب تمہید میں وقت ضائع کرنے کے قائل نہ تھے۔ براہ راست مطلب کی بات کرتے تھے۔

''بیٹھنا ہے بابا سائیں، جو آپ نے کہا وہ میں نے کیا، میرے اپنے بھی کچھ کام ہیں، معاملات ہیں۔ انہیں ہی نمٹانے گیا تھا۔'' طلال کا دبا دبا اشتعال اس کے لفظوں اور لہجے سے چھلک رہا تھا۔ جسے اس نے دبانے یا چھپانے کی قطعی کوشش نہیں کی۔

''پوری فوج ہے میرے پاس جس کو چاہو لے لو اور کام نکلواؤ، خود کو خطرے میں اور مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''بہت دم خم ہے میرے بازوؤں میں، کسی کا محتاج نہیں ہوں جو کرنا ہے، خود کروں گا۔'' طلال ملک کا زعم، اکڑ اور غرور اپنے منہ سے بول رہا تھا۔

''یہ تو بے وقوفی ہے بلکہ حماقت۔'' انہیں اپنے بیٹے پہ تاؤ آ گیا۔

''نہ بے وقوفی ہے نہ حماقت، یہی مردانگی اور بہادری ہے، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، اسے للکار کے اپنا انتقام لینا، دوسرا بندہ بھیج کے اپنا بدلہ لیا تو کیا کیا؟ مزا خود شکار کرنے میں ہے کسی سے کروانے میں نہیں۔'' طلال ملک نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

''ابھی یہ سب کرنے کا وقت نہیں ہے۔ الیکشن مہم اپنے عروج پر ہے۔ اس وقت ذرا سی غلطی اور معمولی سی حماقت بھی سارے کیے کرائے پہ پانی پھیر دے گی۔ تمہیں جو کرنا ہے بعد میں بھی کر سکتے ہو لیکن اگر یہ سیٹ ہار گئے تو پانچ سال انتظار کرنا پڑے گا۔''

ان کی بات سن کر بیٹا سوچ میں پڑ گیا۔

''صرف ہتھیار ہی انسان کو طاقت ور نہیں بناتے، اختیار اور عہدہ بھی بہت بڑی طاقت ہیں۔ یہ طاقت حاصل ہو جائے تو بڑے سے بڑا جرم بھی معاف ہو جاتا ہے ہمارے یہاں۔'' بڑے میاں نے لوہا گرم دیکھ کر مزید چوٹ ماری۔

''ٹھیک ہے بابا سائیں، جیسے آپ کا حکم۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد طلال ملک نے باپ کو دیکھتے ہوئے ہامی بھری۔

☆☆☆

بس یونہی موہوم سا اندازہ تھا کہ زندگی مختلف اور مشکل ہوگی مگر اتنی زیادہ مشکل ہوگی یہ اندازہ اور خیال نہیں تھا وہ اکیلا ہوتا تو پھر بھی غنیمت تھا مگر چھوٹے چھوٹے دو بچوں کے ساتھ اکیلے رہنا، انہیں سنبھالنا، اسے دانتوں تلے پسینہ آجاتا، مگر مولوی صاحب اس سے زیادہ دور اندیش اور سمجھ دار تھے۔

انہوں نے چاند کو اپنے بھائی کے گھر صرف ٹھکانا ہی فراہم نہیں کیا بلکہ بچوں کی دیکھ بھال اور سنبھالنے کا بھی معقول بندوبست کروایا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک مرد اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو خود کبھی بھی نہیں سنبھال سکتا۔

انہوں نے اپنی بھابھی سے درخواست کی تھی کہ وہ کچھ عرصے تعاون کرلیں پھر وہ کوئی اور راستہ نکالتے ہیں۔ وہ بھلی خاتون اس کار خیر کے لیے تیار ہوگئیں۔ اگرچہ ان کے اپنے بھی چھوٹے بڑے کئی بچے تھے مگر بڑی بیٹیوں کی مدد سے گھر کے سارے کام ہو رہے تھے وہیں یہ دو بچے بھی پلنے لگے۔

چاند نے دوسری جگہ نوکری کرلی تھی، تنخواہ اگرچہ کم تھی مگر یہی غنیمت تھا کہ روزگار لگ گیا، رات میں کچھ وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزار لیتا۔ کبھی تھکن بہت زیادہ ہوتی اور نیند کا غلبہ ہوتا تو یہ ملاقات اور بھی مختصر ہوجاتی۔

زندگی کی گاڑی لشتم پشتم گھسٹ رہی تھی کہ ایک روز مولوی صاحب اس سے ملنے آگئے۔

''میاں یوں کب تک وقت گزارو گے؟ کیسے کٹے گی آگے کی زندگی؟'' باتوں باتوں میں وہ سوال کر بیٹھے۔

''بس جیسے گزر رہی ہے ایسے ہی گزر جائے گی۔'' کوئی واضح جواب اور واضح سمت تو چاند کے پاس بھی نہ تھی۔

''زندگی ایسے نہیں گزرتی، نہ ہی گزاری جاسکتی ہے۔ رب نے انسانوں کے لیے کچھ قاعدے قوانین بنائے ہیں وہ انسانوں کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں نکاح کرلینا چاہیے کسی بھلی لڑکی سے، جو تمہارا گھر بار سنبھال لے اور تمہیں بھی۔''

''میرے نصیب میں یہ سکھ ہے ہی نہیں شاید۔'' چاند کے لبوں پہ ایک تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''پروردگار کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، یہ اور بات کہ ہمیں اس حکمت کی خبر ہوتی ہے نہ سمجھ۔'' مولوی صاحب نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

''کسی کے چلے جانے سے نہ دنیا ختم ہوتی ہے نہ زندگی، سارا نظام یونہی چلتا رہتا ہے، جیسے چل رہا تھا، اپنا غم پیچھے کرکے آگے بڑھو، اپنا نہیں تو بچوں کا خیال کرو۔'' وہ چاند کو سمجھا رہے تھے۔

''دل نہیں مانتا مولوی صاحب!'' چاند نے بے بسی سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

''گھر آباد کرو، دل بھی آباد ہو ہی جائے گا۔'' اس کے شانے پہ تھپکی دے کر وہ کھڑے ہوگئے۔

☆☆☆

جدید وضع کی بلوجینز کے ساتھ بلیک ٹاپ پہنے سلکی بالوں کو اس نے جھٹک کر پیچھے کیا۔ کلائی میں کڑا اور انگلیوں میں دو چار انگوٹھیاں تھیں، ہاتھ میں پکڑے گلاس کا مشروب آدھا ہو چکا تھا، وہ بہت دھیرے دھیرے گھونٹ بھر رہی تھی۔

''اب تو خوش ہے تو؟'' بانو میڈم نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے پریا کو مخاطب کیا۔

''اصل خوشی تو تب ہوگی جب یہاں سے نکل جاؤں گی، جب تک یہاں ہوں، میری جان اٹکی ہی رہے

گی۔'' پریا نے ایک گھونٹ بھرا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ چڑیا سا دل ہے تیرا۔'' میڈم نے ہنس کر اس کا مذاق اڑایا۔

''اور آپ کو نہیں معلوم، بہت خطرناک اور ظالم بندہ ہے وہ، جو اپنی بیوی اور اپنے بچے کی ماں پہ تیزاب ڈال سکتا ہے، وہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں تو سوچ کر ہی کانپ جاتی ہوں۔'' پریا کو سچ مچ جھرجھری آ گئی۔

''اللہ نے بڑا کرم کیا سارے انتظامات ہو گئے، پتا بھی نہیں چلا، کیسے اک دم سے سارے کام ہو گئے۔'' میڈم نے تشکر کا اظہار کیا۔

''ہوں۔'' پریا نے ایک اور گھونٹ بھرا اور گلاس میز پہ رکھ دیا۔ بظاہر تو اس کی نگاہیں سامنے دیوار پہ لگی پینٹنگ کے اوپر تھیں مگر درحقیقت وہ کچھ سوچ رہی تھی، پچھلے چند ہفتے اس کے، جس خوف و ہراس کے عالم میں گزرے تھے، وہ ذہنی مریض بنتے بنتے رہ گئی تھی، اپنی دانست میں تو بہت محفوظ پناہ گاہ کا انتخاب کیا تھا، مگر یہ وہم و گمان میں نہ تھا کہ اسے تلاش کرنے والے یہاں بھی اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ طلال ملک سے بچنے کا ایک یہی راستہ نظر آیا، اس نے ملک سے باہر جانے کی کوشش شروع کر دی۔

عام حالات ہوتے تو یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی، وہ اکثر ہی بیرونِ ملک سفر کرتی رہتی تھی، مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کی ریکی کی جا رہی تھی اور وہ ایسے نکلنا چاہ رہی تھی کہ کسی کو خصوصاً طلال ملک کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ زندگی چوہے بلی کا کھیل بن گئی تھی۔ بہت ہی رازداری کے ساتھ سارے انتظامات کیے تھے، پھر بھی دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا، کون جانے، کس لمحے کیا ہو جائے؟

☆☆☆

بڑے سے تخت پہ سفید براق کڑھائی والی چادر بچھی تھی۔ کناروں پہ چوڑی چوڑی کروشیا کی بنی ہوئی بیل لٹک رہی تھی۔ چادر کے نیچے نرم پتلا سا گدیلا تھا جس کی وجہ سے تخت کی سختی زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

گاؤ تکیوں پہ گہرے نیلے رنگ کے سلک کے غلاف تھے جن پہ سرخ، سفید اور ہرے رنگوں کی ریشم سے کشیدہ کاری تھی۔ تکیوں کے منہ بند کرنے کی ڈوری بھی ریشم کی تھی جن کے سروں پہ ریشم ہی کے پھندنے لگے تھے۔ انہی تکیوں سے ٹیک لگائے بڑی دادی اور دادی جان بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ باتیں کیا تھیں بس عمومی عمر رسیدہ افراد کی طرح ماضی کے اوراق کھنگال رہی تھیں۔ گزرے وقت اور گزرے لوگوں کو یاد کر رہی تھیں کھٹی میٹھی یادیں اور باتیں جنہیں یاد کر کے کبھی رنجیدہ ہو جاتیں، کبھی ہنس پڑتیں۔

''یاد ہے بڑے ماموں جان ہر سال اپنی حویلی میں اتنا بڑا مشاعرہ کرواتے تھے، کیسے کیسے صاحب اسلوب اور صاحب فن مہمان آتے تھے ہاں، کیا وقت تھا؟ کیا لوگ تھے؟ مجھے تو ان دنوں جگر مرادآبادی کا کلام، انداز، ترنم اور آواز اتنی پسند تھی کیا بتاؤں؟'' بڑی دادی کے چہرے پہ گزرا وقت چمک بن کر بکھرا۔

''ان دنوں آپ سے دو ہی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ کلام جگر اور ستائش جگر، رافعہ بھابھی تو کبھی کہتی تھیں ہمیں روئی کے دو پھوئے لا دو کانوں میں لگا لیں۔ اس موئے جگر اور حمو (بڑی دادی) دونوں کو ہم سے نہیں جھیلا جاتا۔'' دادی ہنستے ہوئے یاد دلا رہی تھیں۔

''وہ بھی ایک وقت تھا، اب اس عمر میں وہی کلام دوبارہ پڑھا تو کتنی دیر سوچتی رہی یا اللہ اس وقت ہم کیسے باؤلے دیوانے ہو جاتے تھے یہ سب پڑھ کے؟''

''جوانی ہوتی ہی ایسی ہے۔''

''اور بڑھاپا؟''

''یا..... بڑھاپا؟'' انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری بڑھاپے میں لاکھ برائیاں ہوں، ہزار مشکلات ہوں مگر ایک اچھائی یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں اور ان کے بھی بچوں کی خوشیاں دیکھ رہے ہیں اور پھر ایسا بڑھاپا جس میں بیماریاں کم اور اپنے پیاروں کا ساتھ اور خیال زیادہ ہو، وہ اتنا برا تو نہیں ہوتا۔''

''ہائے کیا چیز تھی جوانی اور کیا شے ہے بڑھاپا؟''

''اور وہ بچپن جس کے بارے میں اب سوچتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خواب دیکھا تھا۔''

''خواب ہی تھا شاید جو گزر گیا حقیقت تو یہ ہے۔'' دادی نے اپنے ہاتھ دیکھے، اپنی بہن کا چہرہ دیکھا۔ وقت اپنی نشانیاں جن پہ بکھیرتا ہوا گزر رہا تھا۔

☆☆☆

نقرئی و سنہری کارڈ ہاتھ میں لیے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

''واہ بھئی کیا خوش نصیب لوگ ہیں۔'' چاچا نے سر ہلایا۔

''کون؟'' شاہ میر چونکا۔

''یہی، جن کے نام شادی کارڈز پہ چھپتے ہیں، دولہا، دلہن۔'' چاچا نے اپنی ٹھوڑی کھجائی جہاں اب شیو بڑھ چکی تھی۔

''خوش نصیبی کا شادی سے کیا تعلق؟''

''اوئے، خوش نصیب ہوتے ہیں وہ، جو کسی کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ کسی کے شریک سفر بن جاتے ہیں۔ بندے کے آنسو، ہنسی دیکھنے والا کوئی تو ہو۔'' چاچا نے اپنی بات کی تشریح کی۔

''چاچا! تم نے یہ نیک کام کیوں نہیں کیا؟'' شاہ میر نے سوال اٹھایا۔

''بس یار! وہ ایک ہی تھی جو دل کو بھائی، وہ کسی اور کے سنگ رخصت ہوگئی۔ اپنا دل ٹوٹ گیا۔ کسی اور کے لیے پھر دل مانا ہی نہیں۔ یوں سمجھ جوگ لے لیا میں نے۔'' چاچا کے چہرے پہ سائے لہرائے، جن پر گزرے وقت کے ساتھ ساتھ شاید ملال تھا۔ پچھتاوا تھا۔

''محبت سچی نہیں ہوگی، تب ہی وہ کسی اور کی ہوگئی۔'' شاہ میر نے اظہار خیال کیا۔

''محبت تو سچی تھی پاگلے، بالکل سچی، بس..... اظہار نہیں کر سکا۔ کبھی بتا نہیں سکا اسے۔ یہ جو محبت ہے نا، اگر جی کی جی میں رہ جائے تو جی کا جنجال بن جاتی ہے۔ میں سوچتا ہی رہ گیا ہمت جمع کرنے میں لگا رہا اور ایک روز معلوم ہوا کہ وہ کسی اور کی ہونے والی ہے۔ اب تو نانی دادی بن گئی ہوگی۔ بس پیارے وقت جب تک ہماری مٹھی میں ہوتا ہے ہم قدر نہیں کرتے یا شاید احساس نہیں ہوتا۔ اک دم ہی پھر ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔ تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔''

آج سے پہلے شاہ میر نے اتنا سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا انہیں۔ وہ حیران ہو رہا تھا۔

''خیریت تو ہے، آج بڑے جذباتی ہو رہے ہیں آپ؟''

''تو تو ہو نہیں رہا جذباتی، لہٰذا مجھے ہی ہونا پڑا۔ کیا کروں؟''

چاچا کے معنی خیز الفاظ اس کے سر پر سے نہیں گزرے بلکہ سیدھا دل میں پیوست ہوگئے۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ایک نظر چاچا کی طرف دیکھا۔ جو اس کے سب کچھ تھے۔ اس کے ماں، باپ، بہن بھائی، دوست، رازدار، ہمدرد، خیر خواہ، اول تا آخر سب کچھ وہی تھے۔ اپنی اب تک کی زندگی میں اس نے چاچا جی کو اتنا سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے لالے۔ اسے آگے آ کے تھام لے۔''

شاہ میر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ یکا یک مسکرائے اور ان کی روشن مسکراہٹ میں وہ سب کچھ عیاں تھا جو وہ شاہ میر سے کہنا چاہ رہے تھے۔

''ایک ہی بات کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں آپ؟'' اس بار شاہ میر سنجیدہ ہوا۔

''یار، میں تجھے ہنستا بستا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی میں ہی، ساری زندگی تو اکیلا نہیں رہے گا۔ میرے مرنے کے بعد ہی سہی۔ شادی تو کرے گا۔ تو پھر میرے سامنے، میری حیاتی میں ہی مجھے یہ خوشی دے دی۔''

''چاچا!'' شاہ میر بے بسی سے انہیں دیکھ کر کچھ کہنے والا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

''ایک منٹ!'' وہ موبائل اٹھا کر کال اٹینڈ کرنے لگا۔ فرار کا اچھا بہانا مل گیا تھا اسے۔

''کب تک بچے گا بچو!'' اسے دوسرے کمرے میں جاتا دیکھ کر چاچا بڑبڑائے۔

☆☆☆

''ہم دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ گھر میں دولت کی بہت زیادہ ریل پیل نہیں تھی مگر خوشحالی اور خوشیاں تھیں، ابا سرکاری ملازم تھے۔ بھائی جان بڑے تھے۔ تلاش معاش کی جدوجہد کینیڈا لے گئی۔ وہ وہیں سیٹل ہو گئے اپنی فیملی کو بھی بلا لیا۔ ہم دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔

میرے شوہر پہلے دبئی چلے گئے۔ کچھ سال وہیں رہے۔ پھر انہوں نے اپنا بزنس اسٹارٹ کیا۔ اللہ نے اس میں کامیابی دی۔ بزنس کے ساتھ ساتھ ہم بھی پھلتے پھولتے گئے پھر امریکا آ گئے۔ میری طرح، تمہاری امی کی شادی بھی مڈل کلاس گھرانے میں ہوئی تھی۔ مگر سارے کھیل شاید نصیب کے ہیں۔ تمہارے ابو ایک نجی کمپنی میں ملازم تھے۔ بہت امیر نہیں تھے مگر بالکل غریب بھی نہیں تھے۔ اس وقت مہنگائی بہت زیادہ نہیں تھی۔ لوگوں میں قناعت پسندی تھی۔ ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا تھا۔ پھر ایک روز اچانک تمہارے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ فوراً ہی ختم ہو گئے، تم اس وقت تین سال کی تھیں اور احمد پانچ سال کا تھا۔

آپا بھری جوانی میں بیوہ ہو گئیں ان کی ساس جوان بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں۔ بمشکل چار، چھ ماہ زندہ رہ کر وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ایک مکان چھوڑ گئی تھیں جو ان کے بچوں نے بیچ کر ترکہ آپس میں تقسیم کر لیا۔ آپا کے حصے میں کچھ نہیں آیا۔ نہ ہی تمہارے کسی چچا تایا یا پھپھو نے مدد کی۔

ہمارے والدین بھی فوت ہو چکے تھے۔ ہمارا گھر بھی بھائی جان نے بیچ کر ہم دونوں بہنوں کا حصہ دے دیا تھا۔ مگر وہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی۔ خالہ نے بولتے بولتے ایک وقفہ لیا۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ پھر گویا ہوئیں۔

''آپا بہت خود دار تھیں، بہت ہی زیادہ، پھر گردش حالات نے انہیں زور رنج اور حساس بھی بنا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی چھوٹی سی دنیا الگ بسالی تھی۔ جہاں وہ محنت کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے لگیں۔ کسی کی مدد یا احسان لینا انہوں نے کبھی گوارا نہ کیا۔ میں نے بلکہ ہم دونوں میاں بیوی نے بہت کوشش کی ان کی مدد کرنے کی۔ سپورٹ کرنے کی مگر اس معاملے میں ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ ناراض ہو جاتی تھیں۔ تھک ہار کے ہم نے انہیں۔ ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ بھائی جان کینیڈا کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ چند ایک بار پاکستان آئے۔ پھر ایک دن وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بیوی بچے وہیں ہیں۔ اپنی اپنی لائف میں سیٹلڈ ہیں۔ میں جب بھی پاکستان آتی، آپا سے ضرور ملتی تھی۔''

''ددھیال میں کبھی کسی نے امی سے رابطہ رکھنے کی کوشش نہیں کی؟'' خالہ کی باتیں محویت سے سنتے ہوئے عائشہ نے سوال کیا۔

سب کے حالات بدل گئے تو دل بھی بدل گئے۔ خوش حالی بے فکری اور پیسے کی ریل پیل میں کسی کو فرصت نہیں ملی کہ وہ مستقل اور باقاعدہ رابطہ رکھتے آپا سے۔ ابتداء میں تو پھر بھی کسی خوشی غمی میں آپا شریک ہو جاتی تھیں

پھر جب وہ لوگ کھینچنے لگے تو آپا بھی دور ہٹ ہوگئیں۔ ویسے بھی ان کا خیال تھا کہ امیر رشتے داروں سے زیادہ میل جول کی صورت میں ان کے بچے احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ انہوں نے خود کو بالکل ہی محدود کرلیا تھا۔''

خالہ بولتے بولتے خاموش ہوگئیں۔ عائشہ بوجھل دل کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی، کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا شاید مگر سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

☆☆☆

کمرہ کافی کشادہ تھا مگر جگہ جگہ پھیلے کپڑوں، کھلونوں اور دوسری چیزوں کی وجہ سے کچھ تنگ اور گھنا گھنا لگ رہا تھا۔ چاند اوور ٹائم کر کے آیا تھا۔ بہت تھکا ہوا ہوتا تھا مگر اس پھیلاوے اور بے ترتیبی سے اسے الجھن ہوئی تھی۔ جیسے تیسے سب کچھ سمیٹ ہی لیتا۔ مگر تفصیلی صفائی چھٹی کے دن ہی کرتا، اسے ان سب کاموں کی اور ایسے شب و روز گزارنے کی عادت نہیں تھی۔ مگر اب سر پہ پڑی تو وہ سب کرنا پڑ رہا تھا جو کبھی کرنے کا کبھی خواب خیال میں بھی سوچا نہیں تھا۔ زندگی اسے گھسیٹ رہی تھی یا وہ زندگی کو گھسیٹ رہا تھا۔ حالات کے تانے بانے ٹھیک ہو کر ہی نہیں دے رہے تھے۔

ان ہی الجھے سلجھے دنوں میں مولوی صاحب ایک بار پھر آ گئے۔

''ہمارے ایک عزیز ہیں ان کی بہن بیوہ ہوگئی ہے۔ پانچ سال ہوئے تھے شادی کو بچے نہیں ہیں۔ لڑکی کے بھائی نے مجھ سے کوئی رشتہ دیکھنے کو کہا ہے۔ اگر تم کہو تو تمہارے لیے بات کروں؟''

ان کی بات سن کر چاند ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اسے اپنا آپ اور اپنا دل خالی خالی محسوس ہوتا تھا۔ کوئی خواہش تھی نہ آرزو نہ تمنا، مگر بچے، دو چھوٹے چھوٹے بچے۔ انہیں تو ضرورت تھی ایک عورت کی۔ چاہے وہ ماں ہو یا ماں جیسی ہو، اور یہاں آ کر چاند ہار ہار جاتا تھا۔

ضرورت جذبات سے بڑی ہوتی ہے۔ بڑھ کر ہوتی ہے اس کے بچوں کو، اس کے گھر کو ایک نسوانی وجود کی ضرورت تھی۔ اور یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی، باقی جو کچھ تھا۔ وہ خواب تھا۔ خیال تھا اور زندگی، خواب کے سہارے گزرتی ہے نہ خیال کے، ٹھوس حقائق کی بنیاد پر زندگی استوار ہوتی ہے چاہے وہ حقائق کتنے ہی تلخ اور کتنے ہی ناگوار کیوں نہ ہوں۔

وہ چاند بابو، جو سوچتا تھا کہ صائمہ کے بعد زندگی میں کسی اور کی کوئی گنجائش ہوگی نہ جگہ، اب دوسری نہج پر سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''جو آپ مناسب سمجھیں مولوی صاحب!'' سر جھکائے ہوئے چاند ساعتوں نے اپنی ہی آواز سنی جو بہت اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''تت..... تم..... تم یہ نہیں کر سکتیں'' نائلہ کی آنکھیں اور آواز دونوں پھٹ گئی تھیں۔

''کیوں نہیں کر سکتی۔ کون روکے گا مجھے؟'' جھمکا نے کڑے تیوروں کے ساتھ اسے گھورا۔

''وہ میرا واحد سہارا تھا اس پوری دنیا میں، میں اب کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی؟''

نائلہ بلبلا کر رو پڑی، ایک آنسو ہی تھے جو اس کے بس میں تھے۔ باقی تو سب کچھ ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

''اس کے ساتھ جا کر کیا کرتی۔ جب تک کی زندگی ہے۔ خوار ہی رہتی وہ سہارا نہیں تھا تیرا، پھانسی کا پھندا تھا۔ ایسا پھندا جو جینے بھی نہیں دیتا۔ مرنے بھی نہیں دیتا۔''

جھمکا وہی تلخ حقائق بیان کر رہی تھی۔ جن کا سامنا چاہنے کے باوجود بھی نائلہ نہیں کر سکی۔ بلکہ وہ کرنا ہی نہیں

چاہ رہی تھی، وہ اپنے ان ہی خوابوں کی دنیا میں رہ رہی تھی۔ جو سراب اور دھوکہ نظر آرہے تھے مگر وہ اب بھی اس سراب اور دھوکے کا انکار کرنے پر مصر تھی۔ گہری تاریکی میں آنکھیں بند کیے وہ اسی خوش فہمی کا شکار تھی کہ جب وہ آنکھیں کھولے گی تو چاروں طرف چکا چوند روشنیوں کا راج ہوگا اور تاریکی کا کہیں نام ونشان نہ ہوگا۔

''تم مجھے ملنے تو دو اس سے، میں خود بات کروں گی میں جانتی ہوں، وہ ایسا نہیں ہے۔''

نائلہ کی حالت اس جواری کی مانند ہو رہی تھی جو اپنے آخری داؤ میں اپنا سب کچھ ہار چکا ہو۔ پھر بھی ایک اور داؤ لگانے پر مصر ہو کہ شاید اس بار قسمت مہربان ہو جائے جبکہ اس کے پاس بازی لگانے کے لیے اب کچھ بچا بھی نہ ہو۔

''مجھ سے زیادہ نہیں جانتی تو اسے، بچپن سے دیکھ رہی ہوں وہ کسی کا نہیں۔ اپنے باپ کا بھی نہیں۔ سوائے اپنے آپ کے، کسی سے پیار نہیں کرتا وہ۔''

''میرا کیا ہوگا؟ میں کہاں جاؤں گی؟'' نائلہ بالکل ہی حواس باختہ ہوگئی۔ تھوڑے سے عرصے میں ہی اس کی حالت مرجھائے پھول جیسی ہوگئی تھی۔ ساری خوب صورتی شگفتگی، تازگی ونرمی سب ماند پڑ گئی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے اس بات کے غماز تھے کہ وہ کتنا کم سوتی ہے اور کتنا زیادہ سوچتی ہے جو انسان بغیر سوچے سمجھے، آنکھیں بند کیے اپنی بے لگام خواہش کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کے لیے پھر آگے دو ہی چیزیں رہ جاتی ہیں۔ ہر وقت کے تفکرات اور ہمیشہ کی شب بیداریاں، جن میں رات کے اندھیروں میں زندگی کا اندھیرا بھی شامل ہو جاتا ہے۔

اس کی بے خواب آنکھوں میں رت جگوں کا عذاب تھا۔ جو کسی کو نظر آئے نہ آئے جھمکا کو صاف نظر آرہا تھا۔ مگر عرصہ ہوا اسے کسی پر رحم آتا تھا۔ نہ ترس، اب تو خود پر بھی نہیں آتا تھا اپنے چہرے پر دنیا بھر کی سفاکی اور خشونت سجا کر اس نے نائلہ کی جانب دیکھا۔

''یہیں پڑی رہ اور کہاں جائے گی؟''

☆☆☆

گرم گرم پیزا کا ٹکڑا منہ میں رکھ کر پنیر کی نمکین خستگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ماریہ نے ستائشی نظروں سے فروا کو دیکھا۔

''تمہارے ہاتھوں کا ذائقہ اور چہرے کی دلکشی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔''

''بکومت۔'' فروا نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

''صرف تمہارے لیے یہ زحمت کی ہے، خاموشی سے بنا دی تمہاری فیورٹ ڈش، ورنہ میرے کچن میں جانے پر پابندی ہے، جانتی ہو نا۔''

''جی ہاں اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ بھی کہ میرا ڈیزائن کردہ برائیڈل ڈریس آپ کو بے حد پسند آیا ہے لہٰذا مجھ سے یہ پرپوزل عنایت کی گئی ہے۔'' ماریہ نے زیتون اٹھا کر منہ میں رکھا۔

''بقول تمہارے، تم سے زیادہ، شاہ میر کا کمال ہے یہ۔'' فروا نے ایک محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

''سو تو ہے۔'' ماریہ نے اعتراف کیا۔ ''وہ بہت ٹیلنٹڈ اور ہارڈ ورکنگ ہے، اس کی صلاحیت خداداد ہے اگر اسے کوئی بڑا پلیٹ فارم مل جائے تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ میرے ساتھ ایک چھوٹے سے سیٹ اپ میں اس کی صلاحیتوں کے ساتھ ٹھیک سے انصاف نہیں ہو رہا ہے۔'' ماریہ کھاتی جارہی تھی۔ بولتی جارہی تھی اور بیچ بیچ میں اپنی تراشیدہ زلفیں بھی جھٹک جھٹک کر پیچھے کرتی جارہی تھی جو اس وقت پونی ٹیل کی قید سے آزاد تھیں۔

''ویسے تمہارے منہ سے اتنی تعریفیں کبھی کسی کی سنی نہیں، بڑا خوش نصیب ہے شاہ میر!''

''ایسا کوئی ملا ہی نہیں تھا اب تک۔'' فروا کے معنی خیز لب و لہجے سے انجان و بے نیاز، وہ اپنی فطری سادگی اور لاپروائی سے بول رہی تھی۔

''اب تو مل گیا۔ اب کیا ارادے ہیں؟''

''کیا مطلب؟ کیسے ارادے؟'' چکن کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے ماریہ اب چونکی۔

''زندگی کے بارے میں، آگے کے ارادے، فیوچر پلاننگ دل کے معاملات، خوابوں کے حساب کتاب وغیرہ وغیرہ۔''

''سیریسلی بتاؤں، مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں میرا وہ خانہ خالی ہی ہے جو دل میں ہوتا ہے یا دماغ میں، خدا جانے کہاں ہوتا ہے۔ مجھے خواب نہیں آئیڈیاز آتے ہیں۔ ایسے ڈیزائن ایسے رنگ، ایسے کمبینیشن، میں بس ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہوں، اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔'' وہ اتنی سادگی اور معصومیت سے کہہ رہی تھی کہ فروا کو ہنسی آ گئی۔

''اول درجے کی بے وقوف ہو تم۔''

''جی نہیں، میں تھوڑی انوکھی اور مختلف ہوں، یہ دادی جان کی رائے ہے۔'' ماریہ نے فرضی کالر اکڑائے اور چلی گارلک کیچپ کا چٹخارا لیا۔

''خدا ہی بہتر جانے، انوکھی ہو یا دل سے بے خبر۔'' فروا بڑبڑائی۔

☆☆☆

بچپن سے لڑکپن اور جوانی تک کوئی اتنی صدیاں تو نہیں گزر جاتیں کچھ برس ہی تو ہوتے ہیں مگر ان چند برسوں میں ہی دنیا کی جیسے کایا پلٹ گئی۔ کتنا کچھ ہے جو کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔

مڈل کلاس گھرانوں میں روایتیں، اخلاقی اقدار اور رسوم و رواج اپنی پوری آب و تاب سے زندہ تھے۔ سادگی بھی تھی۔ خوب صورتی بھی، شادی بیاہ میں قورمہ روٹی یا زردہ بریانی ہوتے تھے۔ جن کا ذائقہ اور لطف مدتوں یاد رہتا تھا۔ اب بوفے میں درجنوں کھانے ہوتے ہیں۔ مگر کسی ایک شے سے بھی انسان ٹھیک سے لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ چیزیں کھائی کم جاتی ہیں۔ ضائع زیادہ ہوتی ہیں۔

ایک چینل تھا، سب کچھ آتا تھا۔ دین بھی، دنیا بھی، تفریح بھی، سیاست بھی آٹھ سے نو، عوام الناس اس کے لیے خاص گھنٹہ ہوتا تھا۔ لوگ اسی میں دم سادھے بیٹھے دیکھتے تھے اور تخلیق کار اس ایک گھنٹے میں کمال دکھا دیتے تھے۔ اچھی تخلیقات اب بھی ہوتی ہیں مگر ریموٹ کسی چینل پر رکے تو۔

چلمن اور آنچل کی اوٹ سے اٹھتی جھکتی پلکیں، شرماتی آنکھیں اب خواب خیال ہوتی جا رہی ہیں۔ دنیا گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ سارے عالم کی ثقافت ایک ہو گئی ہے۔ مغرب سے مشرق تک پھٹی جینز اور بے باک اداؤں کا رواج ہو گیا ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ کسی اداکارہ کی حسین مسکراہٹ پر فلم بین دل تھام لیتے تھے۔ ڈھلکے ہوئے آنچل پر آہیں نکل پڑتی تھیں۔

اب چہار طرف سب کچھ عیاں ہے۔ کچھ پوشیدہ رہا نہ راز رہا مگر سب کچھ دیکھ کر بھی دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے نہ رگ و پے میں سنسنی دوڑتی ہے۔

سارا سال نت نئے ملبوسات پہننے کے بعد عید الفطر پر نیا لباس اور نیا جوتا پہننے کی خوشی بھی کچھ ماند سی پڑ گئی ہے بس بچوں کی وجہ سے ابھی کچھ بھرم باقی ہے جو آج بھی چاند رات میں آدھی رات تک جاگ کر اپنے نئے کپڑے اور چیزیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ انہیں صبح پہننا ہے۔

میں اگرچہ بہت زیادہ ماضی پرست نہیں، دنیا میں ہونے والی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی کو ناپسند نہیں کرتا۔ میں خود انہیں استعمال کرتا ہوں۔ ان سے فائدے اٹھاتا ہوں مگر بس کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس ترقی و ٹیکنالوجی کی بھاری قیمت ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ آج ہر شے کی کثرت ہے پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان ذائقوں کا فقدان ہے جو کبھی محسوس ہوتے تھے۔ وہ مزا، وہ لطف جیسے ماضی کا حصہ بن گیا ہو۔ اب بہتے خون کی ارزانی بھی بس ایک خبر ہے جو عمومی بے حسی سے سنی جاتی ہے۔ خوشیوں کا ہجوم ہے پھر بھی مسرت روٹھی ہوئی ہے۔ آسانیوں کی۔ ہر قسم کے رزق کی فروانی ہے۔ معلومات کی تفریحات کی بہتات ہے پھر بھی وہ ایک شے جسے برکت کہتے ہیں۔ زندگی وقت اور بہت سی چیزوں سے منہا ہوتی جا رہی ہے۔

پہلے تھوڑے میں بھی انسان خوش ہو جاتا تھا۔ کم میں بھی قانع اور مطمئن رہتا تھا۔ اب کثرت ہے مگر سکون، اطمینان، قناعت، مسرت سب کی آنچ ذرا کم ہے۔

☆☆☆

ٹیبل کلینڈر پر چھپی ہوئی تاریخوں میں سے دو کے گرد دائرے بنے ہوئے تھے۔ ان دو دائروں اور ان کے اندر سجی تاریخوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ یہ تاریخیں ابھی پانچ دن دور تھیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ دل اپنے ماضی کے لیے ہمک رہا تھا۔ اسی رستے پر پھر سے قدم رکھ کر وہیں کی خبر لینے کو بے چین ہو رہا تھا جہاں سے آئے تھے۔ مگر دماغ خبردار کر رہا تھا۔ ڈرا رہا تھا۔ کہیں کچھ ایسا نہ ہو جائے کہ بیٹے کی خوشیاں کھٹائی میں پڑ جائیں۔

انہوں نے لیٹے لیٹے ایک نظر عارف کو دیکھا جو موبائل کان سے لگائے ہوئے تھا۔ ایسی خوب صورت مسکراہٹ اور سنہری خوشی، پہلے کبھی انہوں نے بیٹے کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔ خدانخواستہ وہ اس خوشی سے محروم ہو گیا تو؟؟ آگے کا سوچ کر ان کا دل اک دم سے کانپ گیا۔

اولاد کی محبت کیا شے ہے؟ انہیں آج سے پہلے اس بات کا ادراک ضرور تھا مگر اس کا احساس آج ہوا تھا۔

''مجھے جانا ضرور ہے وہاں، مگر عارف کی شادی کے بعد دماغ صلاح دے رہا تھا۔ ایک بھنور تھا کشمکش کا جو ان کے اندر چکرا رہا۔

☆☆☆

سڑک پر ٹریفک اور روشنیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بھی اسی ریلے میں شامل تھا۔ چاروں طرف شور تھا۔ پی پاں کرتی گاڑیاں۔ بجتے ہوئے ہارن، مگر اس کے اندر بڑی خاموشی تھی۔ تنہائی۔ اداسی، خاموشی، واہ مدثر میاں تم تو سن ساٹھ کی کسی ٹریجک فلم کے ہیرو لگ رہے ہو۔ سوچتے سوچتے وہ مسکرا دیا۔

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تیری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو تیرے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں میری آنکھوں پر جھکی رہتی ہیں

گھر پہنچا تو سب کی محفل جمی تھی۔ اسے بھی فوراً اس محفل کو جوائن کرنے کا حکم ملا۔ نہا دھو کر، کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں آیا۔ تو گرم گرم خوشبودار چائے کے ساتھ اسنیکس کا اہتمام تھا۔

''اس وقت تو اس سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں۔'' مانی نے گرم چائے کا مگ اٹھایا۔

''ماشاء اللہ لمبی عمر پاؤ، خیر سے تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔''

بڑی دادی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''خیریت؟''

''اب جب تک تم بھی کسی کھونٹے سے نہیں بندھ جاؤ گے، کہاں خیریت رہے گی؟ سوال پہ سوال تو ہوں گے۔''

''تو کیا کھونٹے سے بندھنے کے بعد خیریت ہو جائے گی؟'' مانی کا سوال برجستہ تھا۔ جملہ حاضرین مسکرا دیے۔

''سیانے کہہ گئے ہیں اسے بور کے لڈو، جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔''

''بہتر یہی ہے کہ کھا کے پچھتائے۔ نہ کھا کر پچھتانے میں ملال بھی شامل ہو جاتا ہے کہ کاش کھا ہی لیتے۔'' ابو جان نے لقمہ دیا۔

''تو میاں، کب کھا رہے ہو یہ لڈو اور کب کھلا رہے ہو ہمیں مٹھائی۔''

دادی جان آج شاید یہیں بیٹھے بیٹھے اس کی شادی کروانے ہی کے موڈ میں تھیں۔ مانی کو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ اور اس نے برملا اظہار بھی کر دیا۔

''ٹال مٹول نہ کرو صاحبزادے فیصلہ کرو۔''

''فیصلہ بھی ہو جائے گا دادی! پہلے ان محترمہ کو تو رخصت کریں۔ ہم بھی لکھوا لیں گے اپنا نام غازیوں میں یا شہیدوں میں۔'' فروا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا مگر اک نامحسوس سا درد اک کسک تھی جو کسی کو پتا نہ چلی مگر ابو ضرور بے چین ہو گئے اک نظر بیٹے کے چہرے پر ڈالی۔ اوپر سے پرسکون سمندر سا چہرہ، اندر مگر طوفان مچل رہے تھے۔

''کس بھنور میں خود کو پھنسا بیٹھے میرے بیٹے؟'' ان کی نگاہیں بیٹے کی نگاہوں سے ملیں، مانی کی نگاہوں میں اک سوال تھا۔ اک آس تھی۔

انہوں نے نظریں چرا لیں۔

''فروا کی شادی کے بعد ان شاء اللہ مانی کا بھی فائنل ہو جائے گا۔'' عالیہ بیگم اپنے مخصوص دبنگ لہجے میں بتا رہی تھیں۔

☆☆☆

جدید تراش خراش کا بہت عمدہ لباس تن پر موجود تھا۔ سنہری چہرہ گہرے میک اپ سے سجا ہوا تھا۔ لباس کی میچنگ کے زیورات سے خود کو آراستہ کیے ہوئے بظاہر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اندر ہی اندر ایک بے چینی اور اضطراب تھا۔

بے تابی کے ساتھ وہ شمسو کا انتظار کر رہی تھی اور بالآخر وہ آ ہی گیا۔ سیاہی مائل رنگت دلبا جیسا قد اور سوکھا چرخ اچمور سا جسم، شمسو نے چاند کو ڈھونڈنے میں دن رات ایک کر دیے تھے اور آج تقریباً آٹھ ماہ بعد وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

''یہ چاند کا ایڈریس،'' شمسو نے جیب سے ایک پرچہ نکال کر جھکا کے سامنے رکھا۔ اس نے جھپٹ کر وہ پرچہ اٹھایا اور متاع عزیز کی طرح سنبھال کر رکھا۔

''میں لے چلوں؟ کب چلنے کا ارادہ ہے؟'' شمسو نے پیش کش کی۔

''معذور نہیں ہوں میں، خود چلی جاؤں گی۔''

''شکریہ تو ادا کر دے، کم سے کم مسکرا کر ہی دیکھ لے۔ کتنی محنت کی ہے، دن رات خوار ہوا ہوں تیرے لیے۔''

''میرے لیے یا ان نوٹوں کے لیے جھکانے نیلے نیلے کئی نوٹ اس کے منہ پر ہی دے مارے۔ لے پکڑ اپنا معاوضہ۔''

''ایک ہی بات ہے۔ تو بھی قیمتی ہے اور یہ نوٹ بھی۔'' نیچے گرے نوٹ اکٹھے کرتے ہوئے شمسو نے

ڈھٹائی دکھائی۔
''اب دفعان ہو جا یہاں سے۔ ورنہ ضائع ہو جائے گا۔ میرے ہاتھوں سے۔'' جھمکا غرائی۔
''ہا..... اس سے بڑا اعزاز کیا ہوگا۔ تیرے ہاتھوں قتل ہو جاؤں، شہید محبت کہلاؤں گا۔''
جھمکا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ترنم اندر آ گئی۔ گزرے چند ماہ میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی بیٹے کا غم، دیمک بن کر اس کے وجود کو کھا رہا تھا۔
''کیا ہوا۔ کچھ پتا چلا میرے بیٹے کا؟'' بے تابی سے پوچھتے ہوئے اس کی منتظر نگاہیں باری باری شمسو اور اپنی بیٹی پر ٹک گئیں۔
''نہیں، ابھی کچھ پتا نہیں چلا۔ خدا جانے کہاں دفعان ہو گیا ہے۔'' شمسو کے کچھ کہنے سے پیشتر جھمکا بے زاری سے بول اٹھی۔
''تو گیا تھا معلوم کرنے؟'' ترنم نے شمسو کو مخاطب کیا۔
''ہاں گیا تو تھا پر.....'' شمسو نے بولتے ہوئے سر کھجایا۔
''جب پتا چل جائے گا تو سب سے پہلے تمہیں ہی بتائیں گے۔''
جھمکا نے جھلاتے ہوئے ماں کو جواب دیا اور ایک سخت نگاہ شمسو پر ڈالی جس میں تنبیہ تھی۔ شمسو نے اس تنبیہ کو سمجھ لیا اور خاموشی سے سر تسلیم خم کیا۔
ترنم مایوس ہو کر پلٹ گئی۔ اس نے سنا ہی نہیں۔ اس کی بیٹی کتنی نفرت سے بڑبڑا رہی تھی۔
''پہلے میں اپنا حساب کتاب برابر کروں گی، پھر تم سمیٹتی رہنا اپنے بیٹے سے۔''

☆☆☆

باپ سے کسی طرح جان چھڑا کر وہ خاموشی سے واپس آ گیا تھا۔ اسے حضور بخش پر شک ہو رہا تھا کہ وہ یقیناً اس کی مخبری، بڑے ملک صاحب سے کرتا ہے۔ مگر اس وقت طلال نے اس پر اپنے شک و شبے کا اظہار کرنے اور اسے زیر عتاب لانے کے بجائے پہلے اپنا کام نمٹانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے پاس آج کی رات تھی۔ جو کچھ کرنا تھا آج رات ہی کرنا تھا۔ ویسے تو اس کی ساری تیاری مکمل تھی۔
''حضور بخش ساتھ ہوتا تو اچھا تھا مگر خیر، میں اس کا یا کسی کا بھی محتاج نہیں ہوں۔ اپنے دشمنوں سے اکیلے بھی نمٹ سکتا ہوں۔ بڑے بڑوں کو ٹھکانے لگایا ہے یہ چیونٹی کیا چیز ہے اور وہ بڑھیا، دونوں کو ایک ہاتھ سے مسل سکتا ہوں۔''
فخر و نخوت میں ڈوبا ہوا اس کا دماغ پریا اور بانو میڈم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور بڑی حقارت سے سوچ رہا تھا۔
قسمت مہربان تھی۔ اس کی راہ کے کانٹے چن کو قدرت خود اس کے لیے رستہ ہموار کر رہی تھی۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ پریا کی کل روانگی ہے اور اس وقت وہ اپنے فلیٹ میں ہے۔
''ملک صاحب، وہ ابھی ابھی میرے سامنے اس بلڈنگ میں داخل ہوئی ہے جس میں اس کا فلیٹ ہے۔'' طلال کے خاص الخاص کارندے نے کچھ دیر پہلے ہی اسے کال کی تھی۔
''یہ تو اور بھی آسان ہو گیا کام۔'' طلال کا دل خوشی سے جھوم اٹھا وہاں کی چابی اس کے پاس تھی۔ فلیٹ میں داخل ہونا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس نے گاڑی کی چابی لی اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ہینگر پر لگے سوٹ پر سے نادیدہ شکنیں دور کر کے اس نے ایک تنقیدی نظر ڈالی، بالکل سادہ سوبر کلر کا شلوار قمیص اور ویسی ہی سوبر سی واسکٹ۔

''انکل کا سوٹ یہیں رہ گیا۔'' شاہ میر، ماریہ کی طرف مڑا۔

''ہاں نا، مجھے یہی تو فکر ہو رہی ہے، انکل کا سوٹ پہنچانا ہے مگر کیسے پہنچاؤں؟ گھر میں سب مصروف ہیں عارف بھائی کو فون کیا تھا۔ وہ تو سب سے زیادہ بزی ہیں۔ اکیلے ہی سارے کام نمٹا رہے ہیں۔ میں خود چلی جاتی مگر اکیلے جاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔''

''میں دے آؤں؟'' شاہ میر نے دل میں آئے خیال کو لفظوں کا روپ دے تو دیا مگر پھر خود بھی حیران ہوا۔ وہ آج تک یوں کبھی کسی کے گھر نہیں گیا تھا اور جانے کے لیے کبھی خود کہا بھی نہیں تھا مگر آج؟ نہ جانے کیوں آج کل انہونیاں ہونے لگی تھیں اس کے ساتھ۔

ماریہ نے اس کی طرف دیکھا مگر حیرانی سے نہیں بلکہ اس کی نگاہوں میں اطمینان تھا۔

''تم نے میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے پارٹنر، اب اس نیک کام میں دیر مت کرو، ہو سکے تو ابھی چلے جاؤ۔''

''ابھی؟''

''ہاں نا، ابھی جا کر دے آؤ پلیز، دو ہی دن تو رہ گئے ہیں۔'' ماریہ کا انداز ملتجی ہوا۔

''اچھا!'' شاہ میر نے ہینگر میں لگا سوٹ اتارا اور اسے پیک کرنے لگا۔ حیرت انگیز طور پر وہ پرسکون تھا اور بے حد اطمینان کے ساتھ جب وہ سید صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے ہی اسی طرح کہیں بھی آتا جاتا رہتا ہو۔

گھر ڈھونڈنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی، ماریہ نے بہت وضاحت کے ساتھ پتا سمجھایا تھا۔ کال بیل کے جواب میں سید صاحب نے ہی گیٹ کھولا تھا اور اسے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔

''میں شاہ میر ہوں۔ ماریہ بی بی کے ساتھ ان کے بوتیک میں کام کرتا ہوں۔ آپ کا سوٹ بجھوایا ہے انہوں نے۔ آپ پہن کر چیک کر لیں، کوئی کمی بیشی ہو گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔'' شاہ میر نے ایک ہی سانس میں مدعا بیان کیا۔ وہ واقعی بدل رہا تھا شاید۔

''اندر آجاؤ۔'' وہ تحمل سا مسکرائے اور شاہ میر کو ان کا چہرہ غور سے دیکھ کر ایک غیر معمولی پن کا احساس ہوا ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں جیسے جلدی میں خشک کر کے باہر آئے ہوں۔ مگر شاہ میر کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کی بھیگی آنکھوں کی وجہ پوچھتا یا جاننے کی کوشش کرتا۔

''آپ سوٹ ٹرائی کر لیں۔'' صوفے پر بیٹھنے کے بعد شاہ میر نے انہیں مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہی ہو گا بیٹا، میں پہن لوں گا۔ بہت شکریہ کہ تم نے اتنی زحمت کی۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟'' سید صاحب اس لڑکے سے بمشکل دوسری یا تیسری بار ملے تھے مگر نہ جانے کون سی کشش تھی جو شاہ میر کی طرف انہیں کھینچ رہی تھی، ایک اپنائیت اور انسیت کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ بھی تقریباً عارف کی ہی عمر کا نوجوان ہے۔ جو بچے اپنی اولاد کے ہم عمر ہوں وہ بھی اپنے ہی بچے لگتے ہیں۔ ان کے دل نے تاویل پیش کی۔

شاہ میر ان کی طبیعت اور حال احوال پوچھ رہا تھا۔ اسے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں نہ جانے کیوں ایک ننھا منا سا وجود یاد آیا۔ وہ بھی شاید اتنا ہی بڑا ہو گیا ہو گا؟ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سے لاشعوری طور پر شاہ میر کو دیکھ رہے ہیں اور وہ خود یہ جمی ان کی نظریں محسوس کر کے کچھ بے چین ہو رہا تھا۔

''میں اب چلتا ہوں۔'' وہ بالآخر کھڑا ہو گیا۔

''کچھ دیر اور رک جاتے، وہ کچھ مایوسی سے ہو گئے۔ تنہائی اور اداسی دونوں ہی بڑی بری ہوتی ہیں۔ اس وقت وہ جس کیفیت سے گزر رہے تھے انہیں شدت سے کسی کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر وہ بس

بے بسی سے شاہ میر کو دیکھ کر رہ گئے۔ وہ چلا گیا اور وہ بند دروازے کو دیکھتے رہے۔
ان کا دل اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا جس طرح وہ اب سے کچھ دیر قبل شاہ میر کی آمد سے پہلے رو رہے تھے۔

☆☆☆

صبح سے دوپہر ہوگئی اور پھر سہ پہر بھی شروع ہوگئی۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ غم و غصے کا طوفان تھا جو جانے پر مجبور کر رہا تھا اور اندر سے کوئی روک بھی رہا تھا مگر پھر وہ فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہوگئی۔ اپنی سیاہ چادر اوڑھ کر اس نے آئینہ دیکھا۔ خوب صورت آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے اور ہلکی ہلکی سوجن نمایاں تھی۔ گاگلز آنکھوں پر چڑھا کر وہ باہر نکل گئی۔
مطلوبہ گلی تک شمو نے پہنچا دیا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے گھر بھی بتا دیا۔ میکانیکی انداز میں اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔
''جی فرمایئے۔'' دروازہ کھولنے والی خوب صورت جوان عورت تھی لب ولہجہ شائستہ تھا۔
''یہ رابعہ خالہ کا گھر ہے نا۔'' جھمکا کو یہی بہانا سوجھا۔
''نہیں، یہاں تو ہم لوگ رہتے ہیں۔ میرے شوہر اور بچے۔ ہوسکتا ہے ہم سے پہلے رہتی ہوں یہ خاتون، جنہیں آپ پوچھ رہی ہیں۔ دراصل ہم کچھ عرصہ پہلے ہی یہاں آئے ہیں۔''
''ایک گلاس پانی مل جائے گا؟'' جیسے ہی وہ خاموش ہوئی جھمکا بول اٹھی ویسے بھی سچ مچ اس کا حلق پیاس سے سوکھ رہا تھا۔
''اندر آکر پی لیں، یہاں تو بڑی تیز دھوپ ہے۔'' خوش مزاجی سے بولتی ہوئی وہ عورت پلٹی۔ جھمکا اس کے پیچھے چل پڑی۔ گھر میں گھستے ہی صحن تھا پھر دو کمرے، وہ جس کمرے میں آئی۔ وہاں ایک بچہ سو رہا تھا۔ اور ایک بچی کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ چولہے پر پکتی ہوئی ہنڈیا کی خوشبو گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ صحن اور کمرہ صاف ستھرے تھے۔
''آپ بیٹھیں۔ میں پانی لے کر آتی ہوں۔''
وہ پانی لینے چلی گئی، جھمکا کی نگاہیں کھلونوں سے کھیلتی بچی پر جمی ہوئی تھیں۔
''نائلہ!'' اس کے بے آواز لبوں نے پکارا۔ بچی کی دلچسپی اپنے کھلونوں میں زیادہ تھی۔ اس نے بے توجہی سے ایک نظر اس اجنبی عورت کو دیکھا جس کا نصف سے زیادہ چہرہ کالی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ بچی دوبارہ اپنے کھلونوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔
''یہ لیجیے۔'' خاتون خانہ ٹھنڈے پانی کا گلاس لائی تھی جو جھمکا نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا مگر اندر ہی اندر شعلوں کی آنچ تھی کہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔
''آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔'' جھمکا نے بچی کی طرف اشارہ کیا۔
''ماشاءاللہ۔'' خاتون خانہ نے مسکرا کر کہا اس کے لہجے میں مامتا بھی تھی شفقت اور محبت بھی۔
''یہ بیٹا ہے آپ کا؟'' جھمکا نے سوئے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کیا۔
''جی، دو بچے ہیں میرے، بیٹا بڑا ہے اور پھر بیٹی ہے۔''
''ایک گلاس پانی اور مل جائے گا؟''
''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

☆☆

حنا بشریٰ

محافظ

رات سرد بھی تھی اور سیاہ بھی۔ ہر شے نے اندھیرے اور خاموشی کی ردا اوڑھ رکھی تھی۔ گھر کے سب افراد سو چکے تھے۔ سب لائٹس آف تھیں سوائے کچن کے۔ آج کوئی تیسرا چوتھا روز ہو چلا تھا کہ جب بھی وہ کام سے رات کو لوٹتا تو کچن کی جلتی لائٹ اس کی توجہ کھینچ لیتی۔ مگر وہ اکثر اس بات کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا کہ امی یا بہنیں ہوں گی۔ کسی ضرورت کے لیے آنکھ کھلی ہوگی تو کچن میں آ گئی ہوں گی۔ وہ یہ سوچ کر ہمیشہ اپنے قدم کمرے کی طرف بڑھا دیا کرتا تھا۔ مگر آج وہ ایسا نہ کر سکا۔

اسی پل ہلکا سا قہقہہ اس کی سماعتوں کے آر پار ہوا اور قدموں کو منجمد کر گیا اور پھر دھیان ہی نہیں بے اختیار قدم بھی اسی جانب اٹھ گئے۔ جہاں سے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

خود کو اندھیرے میں چھپائے ہوئے اس نے کچن کی جالی والی کھڑکی کے اندر جھانکا اور پھر ساکت رہ گیا۔ یہ اس وقت..... یہاں.....؟ مگر کیوں؟

اور پھر حیرانی کو اندھیرے کی سیاہ چادر نے ڈھانپ لیا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر عافیہ اور نائلہ کھسر پھسر میں مصروف تھیں اور سعدیہ بار بار بیٹیوں کو اس کھسر پھسر پہ جس میں ہلکی ہلکی ''کھی کھی'' کی آوازیں بھی بے قابو ہونے لگتی تھیں، ٹوک رہی تھیں۔

''تم دونوں سے ناشتا بھی خاموشی سے نہیں ہوتا۔'' اس ڈانٹ پہ تھوڑی دیر کے لیے ''کھی کھی'' کنٹرول میں کی جاتی اور پھر دو منٹ بعد دوبارہ بے قابو ہو جاتی۔

''کیا کروں میں تم لڑکیوں کا..... باتیں ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔'' سعدیہ نے دونوں کو ڈپٹتے ہوئے گھورا اور ساتھ ہی احد کو ناشتے کے لیے آواز لگائی۔

''آ رہا ہوں امی!''

''بیٹا! ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کام پہ نہیں جانا کیا آج؟'' احد کے سامنے خستہ پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ رکھتے ہوئے وہ کچھ الجھی سی بولیں۔

''کیا ہوا امی؟ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔''

احد ماں کے تاثرات نظر انداز نہ کر سکا تھا۔

''بس ان لڑکیوں کی غیر ذمہ داری.....'' ابھی وہ عافیہ اور نائلہ کو گھورتے ہوئے مزید کچھ کہتیں کہ دونوں نے بیک وقت ان کا فقرہ مکمل نہ کرنے دیا۔

''نہیں بھائی! قسم لے لیں۔ ہم نے رات کو کچن کی لائٹ نہیں جلائی۔'' وہ دونوں کچھ دیر پہلے خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہی تھیں۔ ماں کی شکایت اور وہ بھی کماؤ پوت کے سامنے تو اپنا دفاع کیے بنا نہ رہ سکیں۔

''امی تو ہر وقت ہمارے پیچھے ہی پڑی رہتی ہیں۔''

ان دونوں کا موڈ اچھا خاصا خراب ہو گیا تھا۔ جس کا اظہار وہ خفا خفا چہروں سے کرنے لگی تھیں۔

''چھوڑیں امی! جب وہ کہہ رہی ہیں تو.....''

احد بھی بہنوں کی حمایت میں بول اٹھا تو سعدیہ نے بیٹے کو قدرے خفا نگاہوں سے دیکھا۔ ایسی نظروں سے جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''بگاڑو جی بھر کے اپنی لاڈلیوں کو۔''

احد گھر کا اکلوتا بیٹا تھا اور سب سے بڑا بھی۔ باپ کی بیماری کی وجہ سے گھر کی ساری ذمہ داری اس پہ آ گئی جو ابھی خود زیر تعلیم تھا۔ خواہش تو اس کی بھی یہی تھی کہ اعلا تعلیم حاصل کرے گا۔ بہت سے خوب صورت خواب مستقبل کے بارے میں اس نے دیکھ رکھے تھے اور بہت سے پلان بنا رکھے تھے۔ مگر اچانک سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

وہ چاہتا تو اس مشکل وقت میں خود غرض بن کر اپنے حوالے سے سوچ سکتا تھا۔ ماں بہنوں کو بوجھ سمجھ سکتا تھا۔ باپ کی بیماری سے اکتا سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ تعلیم کو خیر باد کہہ کر اس نے ایک ہوٹل میں جاب کر لی اور اپنے گھر کا کفیل بن گیا اور اپنی بہنوں کی خواہشوں اور مستقبل کا محافظ.....

گزارا کسی حد تک اچھے طریقے سے ہونے لگا مگر حالات کے ایک دم پلٹا کھانے نے سعدیہ کو بہت محتاط بنا دیا وہ جو کما کر لاتا سعدیہ اس کو سینت سینت کر استعمال کرتیں اور دونوں بیٹیوں کو بھی ہر معاملے میں ہاتھ کھینچ کر خرچ کرنے کو کہا کرتیں۔ ذرا سی فضول خرچی پہ ان کی اچھی خاصی کلاس لیتی تھیں۔

مزید احتیاط کا عالم یہ کہ گھر کا کوئی پنکھا یا لائٹ بھی بلا ضرورت استعمال ہوتا تو اس پر عافیہ اور نائلہ کی اچھی خاصی شامت آجاتی تھی۔ پچھلے کچھ روز سے یہی ہو رہا تھا۔ رات کو کچن کی لائٹ جلائی جاتی اور پھر جلانے والا بند کرنا بھول جاتا۔ صبح سویرے جب سعدیہ نماز کے لیے اٹھتیں تو پہلا کام یہی کرتیں اور پھر سارا دن غصے میں بڑبڑاتی رہتیں۔

''مفت کی بجلی نہیں ہے، بل دینا پڑتا ہے...... مگر تم لڑکیوں کو تو جیسے احساس ہی نہیں۔''

عافیہ اور نائلہ اپنی صفائیاں پیش کرتی رہ جاتیں کہ یہ حرکت انہوں نے نہیں کی۔

''امی کبھی کسی اور کے بھی کان کھینچ لیا کریں۔ آپ کو تو صرف میری بہنیں ہی نظر آتی ہیں۔''

ناشتا ختم کرتے ہوئے احد نے اشارتاً گھر میں موجود ایک اور فرد کا ذکر کیا ہی تھا کہ وہ آ گئی۔

کالج کے صاف ستھرے استری شدہ یونیفارم میں اس کا نازک مخملی سا سراپا کسی حسین سانچے میں ڈھلا نظر آ رہا تھا۔ چھوٹی سی تنگ قمیص فیشن کے عین مطابق تھی اور ساتھ میں گھیر دار شلوار اور خوب بڑا سا دوپٹا لے کر خود کو چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ کاجل کی دھار، پپوٹوں پہ پلکوں کی جھالر کے بالکل قریب نفاست سے لگا لائنر جو اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید خوب صورت بنا رہا تھا۔ بھرے بھرے گداز لبوں پہ نیچرل کلر کا لپ گلوس۔

''یہ تم کہاں جا رہی ہو اتنی تیار ہو کر؟'' احد اس کی تیاری کو نظر انداز نہ کر پایا تو کڑے تیوروں سے سوال کیا تھا۔ اس کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ اس پر پہلے ہی تپا بیٹھا تھا اور مزید کسر اس کی تیاری نے کر دی تھی۔

''کالج......'' سعدیہ کی موجودگی کی وجہ سے جواب شیریں انداز میں دیا گیا جبکہ بڑی بڑی آنکھوں میں احد کے لیے غصہ بھی تھا اور حقارت بھی۔

''یہ کالج کون اتنا بن ٹھن کر جاتا ہے۔ عافیہ اور نائلہ کو تو میں نے کبھی اتنا تیار ہو کر کالج جاتے نہیں دیکھا؟'' احد طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

سعدیہ نے بیٹے کو ملامتی نگاہوں سے گھورا اور ساتھ ہی بیٹیوں کو ناشتے کے برتن سمیٹنے کا حکم دیا جو بہت دلچسپی سے اس نوک جھوک کا مزا لے رہی تھیں۔

''علیزا! آج کالج میں اسپورٹس ڈے ہے۔ کوئی پڑھائی نہیں ہو گی۔'' اس طنزیہ نوک جھونک کا مزید مزا لینے کے لیے عافیہ نے اس میں مسالا بھرا۔

''لو کر لو بات......'' سر جھٹکتے ہوئے احد نے ایک طنزیہ نگاہ علیزا کے میک اپ زدہ چہرے پر ڈالی تو علیزا سرتاپا سلگ کر رہ گئی۔

علیزا احد کی پھوپھی زاد تھی۔ والد تو اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ ماں نے اچھے کالج میں داخلے کے لیے لاہور اپنے بھائی کے پاس بھجوا دیا۔ تاکہ بیٹی گریجویشن کر لے تو کم از کم کسی جگہ نوکری کر کے ان کا سہارا تو بن سکے گی۔ مگر یہ سب ان کے دل میں ہی رہ گیا۔ بیٹی کو بھائی کے گھر بھیجنے کے بعد وہ خود ملک عدم روانہ ہو گئیں۔ تو ان کٹھن حالات میں ماموں کے خون نے جوش مارا اور بھانجی کو اپنے پاس ہی رکھ لیا اور اس کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

''علیزا! آج تو بسوں کی ہڑتال ہے، کیسے جاؤ گی؟'' نائلہ بھی لقمہ دینے میں پیچھے نہ رہ سکی۔

کالج میں اسپورٹس ڈے تھا اور بسوں کی بھی ہڑتال تھی۔ فائنل ایگزام سر پر تھے۔ سو نائلہ اور عافیہ نے تیاری کے لیے چھٹی کر لی تھی۔ مگر علیزا بن سنور کے کالج جانے کے لیے تیار کھڑی تھی تو وہ دونوں چپ نہ رہ سکیں۔

''میرا پریکٹیکل ہے ممانی!'' علیزا نے جب ہر طرف تنقید اور اعتراض دیکھا تو فوراً سعدیہ کو مدد کے لیے پکارا۔ اس کے چہرے کی بے چینی بتا رہی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ ہر صورت کالج جائے گی۔

''کیا ہو گیا ہے...... کیوں سب اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔''

سعدیہ کے شوہر کی جان تھی اپنی بھانجی میں۔ سو وہ کیسے اس کی مخالفت کر سکتی تھیں۔ ایک دو بار کی تھی تو شوہر کی طرف سے ایسی ناراضی دیکھنی پڑی کہ انہوں نے تو زبان پہ تالا لگا لیا۔ کسی بھی بات پہ علیزا کو روکنا ٹوکنا ترک کر دیا۔ عافیہ اور نائلہ بھی علیزا کو کچھ کہتیں تو سعدیہ ان کی ہی کلاس لیتی مگر علیزا کو کچھ نہ کہتیں۔ سو

آج بھی انہوں نے یہی کیا۔

''جاؤ بیٹا! تم کالج جاؤ۔'' سعدیہ ڈھال بنی علیزا کے سامنے کھڑی ہوئیں تو باقیوں کے منہ کے زاویے بگڑ گئے جبکہ علیزا کی آنکھوں میں فاتحانہ مسکراہٹ لہرائی۔

''چلو آؤ، میں چھوڑ دیتا ہوں۔''

نائلہ اور عافیہ نے ہار مان لی تھی، سو ناشتے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئیں۔ مگر احد ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

''معاف کرو۔ میں جاؤں تمہاری ''کھٹارا'' بائیک پہ، اونہہ.....''

وہ دونوں ہاتھ حقارت سے جوڑتے ہوئے بولی اور بیگ کندھے پہ ڈالتی کھٹ کھٹ کرتی باہر نکل گئی تو سعدیہ نے ایک خاموش مگر طائرانہ نگاہ اس کی اونچی ہیل کی سینڈل پر ڈالی۔ تیاری دیکھ کر واقعی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کالج جا رہی ہے۔ مگر وہ کچھ کہہ کر گھر کا ماحول نہیں خراب کرنا چاہتی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھ بھی رہی تھیں اور سمجھ بھی رہی تھیں مگر خاموش صرف مصلحتاً تھیں۔

''امی! آپ نے علیزا کو بہت سر پر چڑھا لیا ہے۔'' احد کی خفگی بجا تھی۔

''مجبوری ہے، کیا کروں۔'' ڈائننگ ٹیبل کو صاف کرتے ہوئے وہ کسی خیال کے تحت رک گئیں۔

''احد! تم جانتے ہو کہ رات کو کچن کی لائٹ کون جلتی چھوڑ آتا ہے؟''

سعدیہ کو پھر وہی بات یاد آ گئی جو ہر صبح ان کا خون جلایا کرتی تھی اور تقریباً روز ہی وہ عافیہ اور نائلہ کی درگت بنایا کرتی تھیں۔ احد کے تاثرات سے انہیں شک ہوا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ رات کو لائٹ کون جلاتا ہے، سو اس سے پوچھ لیا۔

''چھوڑیں امی!'' احد سخت بدمزا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ لائٹ کون آن کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے، مگر سعدیہ کے سامنے نام لینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''ویسے امی! عافیہ اور نائلہ کو تو آپ بہت کھینچ کر رکھتی ہیں مگر ان محترمہ کو نہیں۔'' وہ جل بھن کر بولا۔

''ارے پگلے! ان دونوں نے تو اپنے گھروں کو جانا ہے، اگر آج کھینچ کر نہیں رکھوں گی تو لوگ کہیں گے کہ ماں نے تربیت ٹھیک نہیں کی۔'' سعدیہ نے اپنی ناانصافی کی ایک وجہ پہلی بار وضاحت سے بیان کی تھی۔

''اور وہ محترمہ..... کیا اس کی کل کو شادی نہیں ہونی۔'' احد ناسمجھی سے بولا۔

اسے ماں کے رویے پر اکثر شکایت ہوتی تھی کہ وہ نائلہ اور عافیہ کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں اور علیزا کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ بلکہ وہ شکوہ کیا کرتا کہ نائلہ اور عافیہ آپ کی سوتیلی بیٹیاں ہیں اور علیزا سگی۔ سعدیہ اس تبصرے پر بس ہنس کر رہ جاتی تھیں۔

''اس نے کہاں جانا ہے بھلا؟'' بات گہری معنویت رکھتی تھی۔

''کیوں وہ کوئی لڑکا ہے، جو رخصت نہیں ہوگی۔'' احد خود ہی کہہ کر ہلکا سا ہنس دیا۔

''ارے پگلے! جہاں آنا تھا، آ گئی ہے۔'' سعدیہ بھی بیٹے کی بات پر مسکرائیں اور کھل کر وضاحت کی۔

احد کی سمجھ میں آ گیا کہ ابو نے اپنی بھانجی کو بہو بنانے کا فیصلہ کر رکھا ہے، یہ انکشاف احد پر آج ہی ہوا تھا۔

علیزا بلاشبہ بے حد خوب صورت تھی۔ وہ تو کیا کوئی بھی لڑکا اس پر دل و جان سے فدا ہو سکتا تھا مگر علیزا ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے حسن پر بے حد غرور کرتی ہیں۔ جن کے نزدیک زندگی شاہانہ معیار کی ہوتی ہے۔ رو دھو کر سسک سسک کر زندگی نہیں گزارنا چاہتیں۔ شریک حیات کے حوالے سے پسند ناپسند ہوتی ہے۔

وہ احد کے ساتھ بے حد حقارت بھرا رویہ رکھتی تھی۔ قبول صورت احد شریف اور برسر روزگار تھا مگر علیزا کو دولت اور آسائش نہیں دے سکتا تھا۔ علیزا کو احد میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''پہلے ان محترمہ کے ارادے تو پوچھ لیں۔ وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی ہیں اور آپ لوگ اسے دل و جان سے بہو مان کے بیٹھ گئے ہیں۔''

احد نے بائیک کی چابی اٹھائی اور سر جھٹکتے ہوئے کام کے لیے نکل پڑا۔ آدھے راستے میں بس اسٹاپ کے قریب اس کی بائیک نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تو اس الجھن کو سلجھانے کے لیے وہ

اردگرد نظر دوڑا رہا تھا کہ اس کی نظر بس اسٹاپ پر کھڑی علیزا پہ پڑی اور پھر اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھ لیا جس کے بعد اندازہ ہو گیا کہ علیزا کالج کے بہانے بن ٹھن کر کہاں جا رہی تھی۔ سیاہ، چمک دار نیو ماڈل کی کار اس کے پاس رکی تو علیزا جھٹ سے جا بیٹھی اور گرد اڑاتی کار یہ جا وہ جا۔

☆☆☆

''عاصم! اب میرے لیے بہانہ بنا کر روز نکلنا ممکن نہیں۔'' شہر کے معروف ہوٹل میں وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ان کا تعلق پچھلے تین مہینے سے قائم تھا۔ عاصم محض اس کے ساتھ ٹائم پاس کر رہا تھا۔ جب کہ علیزا اس کی محبت میں مبتلا ہو چکی تھی۔

''بس میری جان۔ تھوڑا انتظار اور۔'' اس کے موی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے۔ عاصم کی آنکھوں میں شوخی و شرارت بھری تھی۔

''کتنا اور انتظار۔'' علیزا کو آج یہ شوخی و شرارت بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ چوری چھپے کا یہ کھیل بند ہو اور عاصم باقاعدہ اس کے لیے رشتہ لے کر آئے۔ عاصم سے اس کی دوستی ایک سہیلی کے ذریعے ہوئی تھی۔ امیر کبیر، خوب صورت، ماڈرن..... کیا کمی تھی اس میں جو علیزا اس کی دیوانی نہ ہوتی۔

''بس ممی پاپا انگلینڈ ٹور سے واپس آ جائیں تو فوراً انہیں تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔'' یہ میٹھی گولی وہ ہر ہفتے دو ہفتے علیزا کو دیا کرتا تھا۔ مگر آج اسے یہ گولی میٹھی نہیں بلکہ کڑوی لگ رہی تھی اور حلق سے اتارنا مشکل ہو رہی تھی۔

''اچھا چھوڑو ساری باتیں، بتاؤ کیا کھاؤ گی؟'' شوخی سے اس نے علیزا کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا اور پھر کوئی جواب نہ پا کر خود ہی ویٹر کو آواز دے کر بلا لیا۔

''جی سر! کیا آرڈر کریں گے؟'' مانوس آواز علیزا کے کانوں میں پڑی تو وہ بری طرح سے چونکی۔ نظریں بے اختیار ہی آواز کی جانب اٹھیں اور پھر جھکانی پڑ گئیں جن میں ندامت و شرمندگی کا جل کی تہہ کے ساتھ جامی تھی۔

''دیکھو، کوئی مزے کی سویٹ ڈش لاؤ۔ جس کو کھا کر ''میری بیوی'' کا موڈ ٹھیک ہو جائے۔''

عاصم نے نہایت بے باکی سے کہتے ہوئے علیزا کی جانب دیکھ کر آنکھ دبائی تھی کہ وہ نوجوان حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

اور پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ..... علیزا کا بازو پکڑ کر بے دردی سے گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا اور اپنے پیچھے تمسخر، حیرانی اور طنز و غلیظ جملے چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت اس نوجوان کو کوئی پروا نہیں تھی۔ کسی نظر کی نہ ہی کسی کے تمسخر کی۔

اس وقت وہ بس ایک ''محافظ'' تھا۔ جس کا کام بس حفاظت کرنا تھا۔ اس لڑکی کا جو بے راہ روی کا شکار ہو چکی تھی جو گھر والوں کو کالج کا کہہ کر غیر لڑکے کے ساتھ ہوٹل میں ملاقات کے لیے آئی تھی۔ اس کا ''محافظ'' جو اپنے پیاروں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی۔ اس لڑکی کا ''محافظ'' جسے اتنی بھی سمجھ نہیں تھی کہ وہ صرف وقت گزاری کا سامان بنی ہوئی تھی، ایک امیر زادے کے دل کو بہلانے کے لیے کھلونا..... کیونکہ جو عزت دینا چاہتے ہیں وہ ٹائم پاس نہیں کرتے۔ اس نادان کو اتنی بھی سمجھ نہیں تھی کہ وہ شخص بغیر نکاح کے اسے اپنی بیوی کہہ رہا ہے۔ کل کو اس کے ساتھ کوئی بھی غلط رشتہ اور تعلق قائم کر سکتا ہے۔ ایسا تعلق جو لڑکی کے لیے باعث ذلت ہو۔

وہ نوجوان کوئی اور نہیں احد تھا۔ جس سے وہ خار کھاتی تھی، جس کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھنا اپنی توہین سمجھتی تھی۔ پھر مہینے کے اندر ہی احد کے ساتھ سادگی سے نکاح ہو گیا تھا۔ گھر والوں کو کچھ بھی بتائے بغیر وہ اس لڑکی کا ہمیشہ کا ''محافظ'' بن گیا تھا جو غلط راہوں پہ چل پڑی تھی۔

عاصم نے اس دن کے بعد کسی قسم کا رابطہ کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ بھی کسی نئی لڑکی کے ساتھ کسی نئی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی مخلص ہوتا تو اگلے دن ہی علیزا کے گھر اس کے والدین رشتے کے لیے موجود ہوتے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ جس سے علیزا کو اپنی بے وقوفی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

وہ دل سے احد کی شکر گزار تھی جس نے اس کے راز پر پردہ ڈال کر اسے گھر والوں کی نظروں میں گرنے سے بچا لیا تھا۔

☆☆

افشین نعیم

یار دل دار

رات کے کھانے کے بعد وہ پانچوں انس کے ہاتھ کے بنے سبز قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ داخلی دروازے اور کھڑکیوں سے آئی ہوا بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی، احسن کی طبیعت شرارت پر مائل ہوئی۔

''یار انس! بہت دعائیں دیا کرے گی تیری بیوی ہمیں۔'' قہوے کی چسکی لیتے ہوئے احسن بولا۔

''کیوں احسن بھائی، میں کسی ملنگ پیرنی سے شادی کرنے والا ہوں کیا.....؟'' انس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

''او، نہیں یار..... یہ جو ہم نے تجھے چائے، قہوہ ایکسپرٹ بنا دیا ہے نا، تو، تو مستقبل میں انتہائی سگھڑ شوہر ثابت ہونے والا ہے۔ بس ساری دعائیں غائبانہ طور پر ہمیں پہنچا کریں گی۔'' پیالی خالی کر کے میز پر رکھتے اس نے وضاحت کی۔

''مطلب، آپ پھوہڑ شوہروں کی بیویوں کی تمام غائبانہ بددعائیں مجھ تک پہنچیں گی۔'' لہجے میں پریشانی اور آنکھوں میں حیرانی سموتے اس نے سوال کیا۔

''بہت زبان چلنے لگی ہے تیری، اتنی زبان بیوی کے سامنے چلائے گا نا تو برتن اٹھا اٹھا کر مارے گی سر پر۔'' حیدر نے انس کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہوگا.....؟'' مارے حیرت کے انس کا منہ پورے کا پورا کھل گیا۔

''بالکل ایسا ہی ہوگا.....'' عادل اپنی بات پر زور دیتا ہوا بولا۔ ''بھائی! یہ بات اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہے۔'' آنکھوں سے حیدر کی طرف اشارہ کرتے بڑے معنی خیز لہجے میں کہتے اس نے احسن کے ہاتھ پر تالی ماری۔

''اور نہیں تو کیا..... یہ جو نشان بھائی کے ماتھے پر آپ کو نظر آ رہا ہے نا.....'' (حیدر نے غیر ارادی طور پر اپنی چوٹ پر ہاتھ پھیرا، جو صبح غنودگی کے عالم میں باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے دیوار سے ٹکرانے کے سبب لگی تھی۔)

''یہ بھابھی جان نے اس کو بیلن کھینچ کر مارا تھا'' احسن دانت نکالتے ہوئے بولا۔

اس کی بات پر جہاں عادل اور انس کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا وہیں محب اللہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رینگی۔

''میں تم بے چارے کنواروں کے حسد کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔'' دل ہی دل میں تلملاتے بظاہر پرسکون انداز میں کہتے حیدر نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

''حسد.....؟'' احسن نے عادل کی طرف دیکھ کر چبا چبا کر دہراتے ہوئے کہا۔

''ہاں ناں..... جل رہے ہو ناں تم لوگ، میری شادی پہلے جو ہو گئی ہے۔'' احسن کے تاثرات مزہ دے گئے تھے۔ دل پر ایک ٹھنڈی پھوار سی پڑی تھی۔ سو بات کو خوامخواہ ہی طول دیا۔

''یہاں تک آ رہی ہے جلنے کی بو.....'' حیدر مزید پھیلا۔

''اوئے، یہ جلنے کی نہیں تیرے موزوں کی بدبو

ہے۔ آفس سے واپس آ کر سرف سے غسل دیا کر پیروں اور موزوں کو۔'' احسن بل کھاتا ہوا بولا۔

''سرف سے کچھ نہیں بنے گا۔ تیزاب سے غسل دینا۔ تب فرق پڑے گا۔'' عادل نے اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔

''چلو، ٹھیک ہے۔ اب میری ٹھیک ٹھاک تسلی ہوگئی ہے۔'' حیدر چوٹ کے نشان کو سہلاتے ہوئے بولا۔

''یارو! مونا میم نے مجھے نیچے بلوایا تھا آج۔'' عادل اچانک یاد آنے پر بولا۔

''وہ اپنی بیٹی اور نواسی کی سہولت کے لیے گاڑی لینا چاہ رہی ہیں۔ غالباً سیکنڈ ہینڈ، مجھ سے مدد چاہ رہی تھیں۔ اس سلسلے میں۔''

''داماد کا گاڑیوں کا شوروم ہے اور وہ گاڑی خریدنے کے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔'' انس حیدر سے بولا۔

''میں آج گیا تھا۔ اس کے شوروم۔'' احسن کی بات نے دھماکے کا سا کام کیا۔

سب ہی اپنی اپنی جگہ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''گاڑی خریدنے کے لیے.....؟'' سب سے پہلے محب اللہ نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں،'' احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دولہا میاں کی چھان بین کے لیے۔''

''اوہ بھائی! وہ مونا میم کی بیٹی کا داماد ہے۔ تیرا نہیں جو تو تفتیش کرتا پھر رہا ہے۔'' حیدر اسے جھاڑتے ہوئے بولا۔

''تم لوگوں کو یاد نہیں ہے۔ مونا میم نے ہم لوگوں سے درخواست کی تھی اس کی چھان بین کے لیے۔'' احسن نے بروقت یاد دلایا۔

''تو، تو ایسے اتاؤلا ہو رہا ہے جیسے لڑکی نے خود تجھ سے درخواست کی ہو۔'' عادل کی بات پر احسن سچ مچ چڑ گیا۔

''یار، اگر میں اخلاقیات اور انسانی ہمدردی کے تحت ان کی مدد کرنا چاہ رہا ہوں تو تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے۔'' تیوری چڑھا کر باری باری اس نے حیدر اور عادل کو گھورا۔

''اخلاقیات اور انسانی ہمدردی.....'' معنی خیزی سے کہتے ہوئے حیدر ہلکے سے کھنکھارا۔

''چکر تو کچھ اور ہی لگ رہا ہے پیارے!'' عادل نے اس کی گھوریوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

''ایک، دو، تین، چار.....'' انس کے بآواز بلند گنتی گننے پر سب لوگ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ جو احسن کی طرف روئے سخن کیے گنتی گننے میں مگن تھا۔

''کیا ہے.....؟'' احسن ڈپٹ کر بولا۔

انس سہمنے کی اداکاری کرتا ہوا خاموش ہو گیا۔

''کچھ نہیں..... آپ کے ماتھے کے بل گن رہا تھا۔'' انس منمناتے ہوئے بولا۔

اس سے پہلے کہ احسن مزید کچھ کہتا۔ محب اللہ بیچ بچاؤ کے انداز میں میدان میں کودا۔

''اچھا تو پھر کیا نتیجہ نکلا چھان بین کا.....؟'' محب اللہ کے سوال نے سب کی دلچسپی کا رخ احسن کے جواب کی طرف موڑ دیا۔

''افسوس..... صد افسوس.....'' احسن نے نفی میں سر ہلاتے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''کوئی مشکوک بات معلوم نہ ہو سکی۔ خاصی اچھی ریپوٹیشن ہے اختشام وارثی صاحب کی مارکیٹ میں۔ کسی بھی طرح کی کوئی قابل گرفت بات سامنے نہ آ سکی۔ اپنی سی کوشش کر لی میں نے۔'' احسن نے خاصا تفصیلی جواب دیا۔

''اور یہ ساری کوشش، انسانی ہمدردی کے کھاتے میں جائے گی ہے نا.....؟'' حیدر نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے سوال کیا۔

''اور نہیں تو کیا.....؟ بھائی کی نیت پر کوئی شبہ نہ کرے۔'' عادل نے شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے حیدر کو وارن کرنے کے انداز میں آنکھیں دکھائیں۔

''یار، زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ کوئی لڑکی مجھے دیکھتے ہی مجھ پر مر مٹی.....'' احسن نے یاسیت بھرے لہجے میں کہتے دیوار سے سر کی پشت ٹکاتے ہوئے کہا۔

''حق ہکہا.....'' کے ساتھ حلق سے ایک ٹھنڈی سانس آہ کی صورت برآمد ہوئی۔

باقی چاروں نے آنکھیں آخری حد تک پھاڑ کر اور منہ ممکنہ حد تک کھول کر اس کا انداز اور انداز گفتگو ملاحظہ کیا۔

''مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ زندگی گزارنے کے سہانے سپنے آنکھوں میں سجا بیٹھی..... پگلی۔'' احسن کی زبان بدستور چلتی رہی۔

''او..... بھائی ہوش کر.....!'' عادل نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔

''زبردستی مجھے نیاگرا، پورشن دکھانے لے گئی۔'' احسن ان سنی کرتے ہوئے اپنی کہتا رہا۔

''احسن او بھائی..... او میرے یار.....!'' حیدر نے کندھے سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

''کہہ رہی تھی..... زندگی تو ہم دونوں کو گزارنی ہے نا۔'' لہجے میں رقت سی در آئی۔

''مجھے لگ رہا ہے، صدمے سے ان کا دماغ

چل گیا ہے۔" انس نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔
"وہ میرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں۔"
دل بے خبر میری بات سن......
احسن شعر مکمل نہیں کر پایا تھا کہ اچانک اس کے حواس خمسہ نے کچھ غلط ہونے کا سگنل دیا۔
عین وقت پر اس نے عادل کا ہاتھ پکڑا ورنہ ڈنڈا جو اس کے سر کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی کھوپڑی پر بج چکا ہوتا۔
"یہ کیا کر رہا تھا تو......؟" ایک عالم جلال میں اس نے عادل سے سوال کیا۔
"ڈنڈا مار کر اس صدمے کا اثر زائل کر رہا تھا جو تیرے دماغ پر ہوا ہے۔"
"میرا صدمہ تو زائل کر دے گا......" احسن نے کہتے ہوئے عادل کا ہاتھ چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے ڈنڈا سنبھالا۔
"اس بے چاری کا دکھ......صدمہ......وہ کیسے زائل ہوگا۔ جو پہلی نظر میں ہی......" بات مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ سب نے مل کر اس پر دھاوا بول دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اونچی آواز میں لہک لہک کر شعر مکمل کیا۔
اسے بھول جا......اسے بھول جا......

☆☆☆

"احتشام کیسا لگا تمہیں......؟" شہر بانو کے سوال پر اٹیچی کیس کھولے اپنا سامان سیٹ کرتی میری کے ہاتھ ذرا دیر کو رکے۔ نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا، اور کندھے اچکا کر دوبارہ سے کام میں مصروف ہوگئی۔
شہر بانو کے چہرے پر کچھ ناگواری کا تاثر ابھرا۔
"میں نے کچھ پوچھا ہے میری......؟" اب کے بولیں تو لہجے میں کچھ سختی تھی۔ ماں کا انداز سمجھ کر میری پوری طرح ان کی جانب متوجہ ہوئی۔
"آپ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس مام......؟ ڈیڈ کی چوائس ہے تو اچھا ہی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت-/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف-/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ھمارا پتہ:
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

ہوگا۔'' ایک ہی جملے میں ساری بات سمیٹ دی۔

'' میری! تمہاری اس سے ملاقات کیسی رہی.....؟ اس ملاقات نے اس کا کیا تاثر چھوڑا تم پر.....؟'' وہ کچھ الجھتے ہوئے بولیں۔

'' اس بات سے اب کوئی فرق پڑتا ہے مام.....؟'' وہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئی۔

'' مجھے ''گرینڈ ما'' کا یہاں بالکل اکیلے رہنا ٹھیک نہیں لگتا تھا اور ڈیڈ کو مجھے یہاں ''گرینڈ ما'' کے پاس چھوڑنا۔ سو انہوں نے شادی کی پخ لگا دی ساتھ۔ دوست کے ساتھ مل کر بالا ہی بالا رشتہ ڈھونڈ بھی لیا۔ طے بھی کر دیا۔ اب کچھ دن میں وہ شادی کے لیے پاکستان پہنچنے والے ہیں۔ سو، مجھے کیا لگا۔ کیسا لگا.....؟ اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

بات ختم کر کے، وہ خاموشی سے اپنے کیوٹکس سے سجے ناخن دیکھنے لگی۔

'' مجھے فرق پڑتا ہے میری.....؟ اور تمہاری ''گرینڈ ما'' کو بھی.....؟ تمہاری رائے اہم ہے ہمارے لیے۔'' شہر بانو آنکھوں میں فکرمندی لیے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

'' ہماری پون گھنٹے کی مختصر سی پہلی ملاقات میں اسے میرے بارے میں کچھ بھی جاننے کا کوئی اشتیاق نہیں تھا۔ وہ خود اپنے بارے میں بھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مام! اس کا سارا وقت مجھے یہ سمجھانے میں گزر گیا کہ میں یہاں پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کر کے کتنی بڑی غلطی کر رہی ہوں۔ میں ایک تابناک مستقبل کو ٹھوکر مار کر، ایک پسماندہ ملک میں کبھی بھی نہیں رہ پاؤں گی۔ اینڈ فائنلی یہ کہ ہم دونوں کو اپنی زندگی یورپ میں ہی شروع کرنی چاہیے۔ کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کو پاکستان آنے جانے میں البتہ کوئی مضائقہ نہیں۔''

بے تاثر لہجے میں بات مکمل کر کے، اس نے دوبارہ اپنی کیس کھول لیا۔

شہر بانو کے چہرے پر رقم پریشانی وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

'' مونا میم بہت خوش تھیں تیری کارکردگی سے۔'' عادل نے احسن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

'' میں نے ورلڈ کپ جیتا ہے.....؟'' احسن نے ایک کٹیلی نظر اس پر ڈالتے ہوئے دوبارہ دور نظر آتے درختوں پر نظر جما دی۔

'' اوہ نہیں یار..... ورلڈ کپ جیتنے والی تو شکل ہی نہیں ہے تیری۔'' عادل نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگاتے ہوئے، اب کی بار ذرا زور سے کندھے کی بینڈ بجائی۔

'' یہ، جو ظلم میرا کندھا سہہ رہا ہے نا..... اس کا بدلہ تیرے جبڑے کو چکانا پڑے گا۔'' احسن نے پہلی نظر اپنے کندھے اور دوسری عادل کی بتیسی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

عادل نے فوراً سے پیشتر اپنی بتیسی اندر کی۔

انس اپنی ہی دھن میں سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ رہا تھا۔

عادل اور احسن کو ریلنگ کے ساتھ کھڑے باتیں کرتے دیکھا تو بجائے اندر جانے کے ان کی طرف آ گیا۔

'' کیا کر رہے ہیں آپ لوگ .....؟'' یونہی بات کا آغاز کرنے کے لیے انس بولا۔

'' جھولا جھول رہے ہیں..... عادل نے مسکراتے ہوئے انس کو دیکھا۔

انس نے سر کھجاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنا شروع کر دیا۔

'' ہاں تو میں تجھے بتا رہا تھا کہ جب میں نے مونا میم کو بتایا کہ اپنا احسن ساری چھان بین کرا آیا ہے احتشام صاحب کی۔ ہر چیز سو فیصد اوکے ہے۔ آپ اطمینان سے شادی کی تاریخ فائنل کر دیں۔ تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ اور تجھے ڈھیروں ڈھیر دعاؤں سے نوازا، جو میں نے نیاز مندی سے سر جھکا کر وصول کیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی باور کرا دیا کہ

بنانہ احسن کی اپنی بھی پانچ بہنیں ہیں اس لیے وہ دنیا کی ہر لڑکی کو اپنی بہن ہی سمجھتا ہے۔ اور میرب کے لیے بھی جو کچھ اس نے کیا اپنی بہن...... سمجھ کر۔'' عادل کی زبان کو بریک...... احسن کے تیور دیکھ کر لگا۔

قریب تھا کہ احسن اس پر جھپٹ پڑتا۔ عادل ...... فوراً دو قدم پیچھے ہٹا۔

''تب ہی محبّ اللہ کمرے سے باہر آیا اور حیدر نیچے سے اوپر آیا۔

''واہ...... کیا ٹائمنگ ہے۔'' عادل ان دونوں کو ایک ہی وقت میں دو مختلف سمتوں سے آتا دیکھ کر بولا۔

''یہ، تم لوگوں کی ٹائمنگ کیوں خراب ہوتی جا رہی ہے۔'' محبّ اللہ کچھ ناراضی سے بولا

''چائے تم سب کا انتظار کر رہی ہے۔''

''ہاہ...... کاش...... اس کے بجائے مجھے سننے کو ملتا۔ حیدر بھابھی تیرا انتظار کر رہی ہے۔'' حیدر نے مصنوعی آہ بھری۔

محبّ اللہ کی تقلید میں وہ سب لوگ اندر آ گئے۔

''یارو...... ! ویسے ایک بات ہے...... عادل، چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولا۔ سب لوگ توجہ سے اس کی بات سننے لگے۔

''یہ جو احتشام صاحب ہیں نا......'' ان کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے ان کو بہت قریب سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں...... یہ یاد نہیں آ رہا......''

''کوئی بات نہیں......'' حیدر سکون سے بولا۔

''تجھے بچپن میں پہاڑے بھی یاد نہیں آتے ہوں گے ٹیچر کے سامنے۔''

''تو، میرے بچپن میں، میرے ساتھ نہیں تھا۔'' عادل تپ کر بولا۔

(یہ الگ بات کہ پہاڑے اس کی دکھتی رگ تھے۔ خوب مار کھائی ان پر سکول میں)

''تیری جوانی سے، تیرے بچپن کا اندازہ لگانا لوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔'' احسن نے بھی حصہ ڈالا۔

''او...... بھائیو!'' کوئی میرے مسئلے کا حل بتاؤ......'' محبّ اللہ ان سب کو دیکھ کر بولا۔

''تیرا بھی کوئی مسئلہ ہے......'' عادل نے حیرت سے باقی سب کو دیکھا۔

''ہاں......!'' اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔

''مسئلہ ہے اور خاصا گمبھیر مسئلہ ہے۔''

''کیا......'' سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''ابا جی، اپنی بہن کی بیٹی سے میرا نکاح کروانا چاہتے ہیں۔'' محبّ اللہ نے بولنا شروع کیا۔

''لیکن، امی جی کی اپنی نند یعنی میری پھپھو سے کبھی نہیں بنی۔ سو، وہ بالکل راضی نہیں ہیں۔ اب وہ ابا جی سے علی الاعلان دو ٹوک بات کرنے کے بجائے، میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہ رہی ہیں۔''

''مطلب، امی جی چاہ رہی ہیں کہ تو انکار کر دے۔'' حیدر نے سمجھ کر سر ہلایا۔ محبّ اللہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

تو، اس میں مسئلہ کیا ہے، کر دے انکار...... اور انکار کرتے ہی بھاگ کر ادھر آ جانا۔ پیچھے سے امی جی سنبھال لیں گی سب۔'' عادل نے منٹوں میں حل پیش کیا۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔'' محبّ اللہ نے بے بسی سے سر ہلایا۔

''انکار ہی تو نہیں کرنا۔''

چند لمحے لگے ان سب کو بات سمجھنے میں۔

''اوئے مولوی......!''

''یعنی کہ تو......''

''مطلب واقعی......؟''

مختلف طرح کی آوازیں اس کے کانوں میں گڈ مڈ ہوئیں۔

محبّ اللہ نے اپنا جھکا ہوا سر مزید جھکا لیا۔

''بڑا چھپا رستم نکلا تو، تو یار......'' عادل نے اس کے پاؤں پر پاؤں مارا۔

''وہ نہیں یار..... ! بس ابا جی کی مرضی ہے.....''

محبّ اللہ کچھ گھبراتے، تھوڑا شرماتے ہوئے بولا۔

اچھا.....

''انکار خود نہیں کرنا چاہتا۔ اور مرضی..... ابا جی کی ہے۔'' احسن کے چھیڑنے پر سر مزید جھک گیا۔

''منہ، اوپر اٹھالے بھائی، اب کیا ہمیں سجدہ کرے گا۔'' حیدر نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔

''نہیں نہیں نعوذ باللہ.....!'' محبّ اللہ نے کہتے ہوئے فوراً سر اٹھایا۔

''اب کوئی حل تو بتاؤ.....'' مدد طلب نظروں سے اس نے باری باری احسن اور عادل کو دیکھا۔

''میرا خیال ہے..... خالہ جی کو فون کر کے بتا دیتے ہیں کہ آپ کا بیٹا.....''

عادل نے ایک ڈرامائی توقف دیا۔ محبّ اللہ اسے سننے کو بے چین تھا۔

''نکل گیا ہاتھوں سے..... گیا دشمنوں کے قبضے میں.....'' محبّ اللہ نے کشن کھینچ کر اس کو مارا۔ جسے عادل نے ہنستے ہوئے کیچ کیا۔

☆☆☆

ہوا خاصی خوش گوار محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ یہ کہ آج آفس میں سیلری بڑھنے کا مژدہ سنا، پھر اپنی پروموشن سے متعلق کچھ باتیں بھی اڑتی اڑتی کانوں میں پڑیں سو سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ گھر تک پہنچنے کے لیے ابھی مزید پندرہ منٹ کی واک تھی۔

یونہی دل کیا، واک کو تھوڑا لمبا کیا جائے۔ سو موڑ سے واپس گھوم کر آنے کا پروگرام بنایا۔

اردگرد کے مناظر اور ہنستے کھیلتے بچوں کے درمیان سے گزرتے۔ اپنے نام کی پکار پر وہ بے ساختہ ٹھٹکا۔

کسی درخت کے پیچھے سے اچانک ہی سائیکل خان برآمد ہوا۔

''احسن بھائی.....! احسن بھائی..... شکر ہے آپ مل گیا۔''

''تم..... مجھے ڈھونڈنے کے لیے یہاں چھپے بیٹھے تھے۔''

احسن نے عین اپنے سامنے رستہ روکے کھڑے سائیکل خان کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''نہیں بھائی..... ام تو ٹیکسی کا انتظار کر رہا ہے اتنی دیر سے۔''

''تو، میں تمہیں ٹیکسی نظر آ رہا ہوں؟'' احسن نے آنکھیں سکیڑتے اس کو دیکھا۔

''احسن بھائی..... مذاق نہیں کرو یار۔'' اس نے دانت نکالے۔

''امارا مدد کرو۔''

''اچھا بتاؤ..... کہاں جانا ہے ٹیکسی میں؟'' احسن سنجیدہ ہوا۔

''گھر جانا ہے اور کدر جائے گا۔'' سائیکل کچھ برا مان گیا۔

''یہ..... چار قدم پر جانے کے لیے نواب صاب کو ٹیکسی چاہیے..... واہ جی۔'' احسن بس سوچ کر رہ گیا۔

''ٹیکسی کا کیا کرنا ہے.....؟ چلو، پیدل ہی چلتے ہیں۔ میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔''

''او..... صاب.....!'' سائیکل نے سر پر ہاتھ مار کر گویا اس کی کم عقلی کا ماتم کیا۔ ''امارا ساتھ میری باجی ہے۔ اس کا پاؤں میں موچ بھی آ گیا ہے اور اس کا جوتا بھی ٹوٹ گیا ہے اس لیے ٹیکسی کا تلاش تھا۔''

سائیکل ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

احسن نے اس سمت دیکھا جدھر سائیکل نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں درخت کے نیچے میرب بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔

یہ آج کے دن کا ایک اور خوش گوار واقعہ تھا۔ تب ہی سڑک پار دوسری طرف سائیکل کو ٹیکسی نظر آئی جس میں سے کچھ سواریاں اتر کر غالباً ڈرائیور کو کرایہ وغیرہ دے رہی تھی۔

''احسن بھائی! آپ اور رکو میری باجی کا پاس، ام وہ ٹیکسی لاتا ہے۔'' سائیکل بے اختیار اس سمت بھاگا۔

احسن چند قدم آگے بڑھ کر میرب کے قریب ہوا۔ سلام میں پہل میرب نے کی۔ احسن نے مسکرا کر جواب دیا۔

درخت کی اوٹ میں ایک جوتا پہنے، دوسرا ہاتھ میں پکڑے وہ احسن کی جانب متوجہ تھی۔

''آپ، اس دن اتنا بوکھلا کیوں گئے تھے۔ نام تک بتائے بغیر چلے گئے۔'' وہ شکوہ جو میرب کے دل میں تھا۔ زبان پر آ گیا۔

''نہیں..... بوکھلایا نہیں تھا۔ بس یونہی۔'' وہ خاموش ہوا۔ پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھا۔

''یہ دو، دو حادثات ایک ساتھ ہی پیش آ گئے؟''

احسن نے موچ اور جوتے کی طرف اشارہ کیا۔

''جی.....!'' وہ مسکراتی۔ ''جوتا نکل گیا تھا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ بس ایک دم ٹھوکر لگی اور پاؤں مڑ گیا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''ویسے آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔'' احسن بولا۔

''یہاں درخت کے نیچے بیٹھنے کا.....؟'' سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں.....'' ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ احسن کے ہونٹوں پر رینگ کر سمٹی۔

''میں پاکستان میں رہنے کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ آپ کی نانی کو یقیناً اس عمر میں کسی اپنے کے ساتھ کی ضرورت ہے۔''

''اچھا.....!''

میرب کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں ایک برائٹ فیوچر کو لات مار رہی ہوں ایسے پسماندہ ملک میں رہنے کا فیصلہ کر کے۔''

''یہ، جس کا بھی خیال ہے بالکل غلط ہے۔ مادی اور مالی اعتبار سے چاہے ہمارا ملک اتنا ترقی یافتہ نہ ہو، پر رشتوں ناتوں اور محبتوں میں ہم آج بھی سب سے امیر ہیں۔''

میرب نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر احسن کی سمت دیکھا۔

وہ اس کے ہاتھ میں پکڑے جوتے کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کو اچھا لگ رہا ہے تو آپ لے لیں۔'' اس نے جوتا احسن کی سمت بڑھایا۔ آنکھوں میں واضح شرارت کی چمک تھی۔

''نہیں شکریہ.....'' وہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرایا۔ ''کسی لڑکی سے جوتا وصول کرنا، پاکستان میں کچھ زیادہ اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا۔''

''اچھا! ایک بات بتائیں۔'' میرب بولی۔

''پوچھیں۔''

''آپ نے کبھی کوشش نہیں کی کسی فارن کنٹری جانے کی؟''

''نہیں..... بلکہ، اس سلسلے میں اگر کسی نے بات کی بھی تو میں نے سوچنے کے لیے دوسرا منٹ نہیں لیا فوراً انکار کیا۔''

''حالانکہ یہاں تو بہت سے لوگوں کا خواب ہوتا ہے۔ برائٹ فیوچر کے لیے باہر سیٹل ہونے کا۔''

''اپنوں کے بغیر تو انسان کا کوئی فیوچر ہی نہیں ہوتا، برائٹ ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ اور ویسے بھی میں اپنے گھر اور گھر والوں سے زیادہ دور نہیں رہ سکتا۔'' احسن نے بات ختم کی۔

''بہت اچھے خیالات ہیں آپ کے، جان کر خوشی ہوئی مجھے۔'' میرب واقعی متاثر ہوئی تھی۔

''میں خود بھی بہت اچھا ہوں۔ اپنے خیالات کی طرح مجھے جان کر آپ کو اور بھی زیادہ خوشی ہوگی۔'' وہ شرارت سے کہتا اٹھا کہ سائیکل ٹیکسی لے کر آ گیا تھا۔

میرب خاموشی سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔ جو بہت قریب آ کر دور ہو رہا تھا۔

☆☆

عائشہ نصیر

دل کا معاملہ ٹھہرا

''رحمہ..... کیا کر رہی ہو..... اظہر آ گئے ہیں آفس سے..... کھانا تیار ہوا کہ نہیں.....'' بھابھی تیز تیز بولتی کچن میں داخل ہوئی تھیں اور وہ جو چولہے کے سامنے کھڑی دیگچی میں جلی ہوئی پیاز پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ بول اٹھی۔

''زہر بنا رہی ہوں..... دکھائی نہیں دے رہا۔''

بھابھی کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

''ہاں..... اب تو اس کا زہر ہی بنے گا۔ کھانا تو بننے سے رہا۔'' ان کی نظر جلی ہوئی پیاز پر پڑ چکی تھی۔ اور اتنی دیر سے تم کر کیا رہی تھیں۔ میں نے تو سمجھیں

گیارہ بجے کا کہا ہوا ہے۔ اب اظہر کھانا مانگیں گے۔ کیا کہوں گی میں ان سے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ بلند ہوا۔ شوہر نامدار کے متوقع ردعمل کا سوچ کے جو گھر آ کے ہی لنچ کیا کرتے تھے اور جنہیں آتے ہی کھانا تیار چاہیے تھا۔

''تو آپ سے کس نے کہا تھا مجھے قورمہ بنانے کا کہیں۔ آملیٹ بنا دیجیے گا۔'' اس کے پاس پہلے سے حل موجود تھا۔

''اماں ہی ہر وقت مجھے اس مصیبت میں ڈالتی ہیں..... ورنہ میرا دماغ خراب ہے جو تمہیں کسی کام کا کہوں.....'' وہ بے پناہ سلگیں۔

''کل اظہر کی فیورٹ شرٹ جلا دی۔ میں نے تو الماری میں بہت چھپا کر رکھی تھی۔ سوچا تھا موقع ملنے پر صافیاں بنالوں گی مگر کل رات جانے کیسے اظہر کے ہاتھ لگ گئی۔ اور پھر جو انہوں نے ہنگامہ مچایا..... بس مجھے پھانسی دینے کی کسر رہ گئی تھی۔ اگر اماں اس وقت نہ آتیں تو وہ یہ بھی کر گزرتے۔'' بھابھی کو اچانک ہی کل والا ہنگامہ یاد آیا۔ اس کی لاپروائی پر ان کے پاس ایسی ہزار ایک داستانیں تھیں جن کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا تھا۔

اور وہ صرف یہ سوچ رہی تھی۔ ''اماں بھی ہمیشہ غلط موقع پر انٹری دیتی ہیں۔''

''اب نکلو یہاں سے۔ انہیں اس طرح گھور گھور کر مزید بھسم کرنے کا ارادہ ہے۔'' اس کے یوں

ساکت کھڑے رہنے پر انہیں مزید غصہ آ گیا۔

''جا رہی ہوں مگر آپ یہ قصہ اماں کو مت سنایئے گا کہ میں نے پیاز جان بوجھ کر جلادی۔ میں بس ڈرامہ دیکھنے لگی تھی۔ دھیان سے نکل گیا۔'' وہ کچن سے نکلتے نکلتے تاکید کرنا نہ بھولی لہجے میں کوئی شرمندگی نہ تھی۔

''ہونہہ..... تم اور تمہارے کام..... توبہ ہی بھلی.....'' بھابھی کی بڑبڑاہٹ واضح تھی حد درجہ بیزار ہو چلی تھیں وہ۔ جانتی تھیں اب آدھے گھنٹے کے مختصر سے وقت میں انہیں کچھ ایسا بنانا پڑے گا جو ڈھنگ کا بھی ہو اور جو ان سے اس تاخیر پر باتیں سننے کو ملیں وہ الگ۔

جبکہ رحمہ ہونٹوں میں شریر سی مسکراہٹ دبائے بڑی بے نیازی سے کچن سے نکل گئی تھی۔

آج بھابھی نے اسے قورمہ بنانے کا ٹاسک دیا تھا اور وہ پہلے ہی مرحلے پر فیل ہوگئی تھی۔ بیچاری بھابھی کا خیال تھا قورمہ بنانا بھلا کسے نہیں آتا ہوگا۔ خود ان کو لگتا تھا کہ اگر ان کی یادداشت بھی چلی جائے تب بھی یہ ایسی ڈش ہے جو وہ آنکھیں بند کر کے بنا سکتی ہیں مگر رحمہ نے ان کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔ یہ نہیں کہ اسے قورمہ بنانا آتا نہیں تھا۔ بلکہ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ اتنی آسان سی ڈش میں وہ کیسے اپنا پھوہڑ پن دکھائے کہ بھابھی کم از کم آئندہ ایک مہینے یا پھر اماں کے اگلے حکم تک اسے کچھ اور بنانے کا نہ کہیں۔ اسی لیے پہلے ایک گھنٹہ تو اس نے پیاز کاٹنے میں لگا دیا۔ پھر اسے تیز آنچ کے حوالے کر کے موبائل لے کر بیٹھ گئی۔ نتیجہ حسب منشا ہی نکلنا تھا اور اس وقت جب وہ اوپر آئی۔

☆☆☆

''تم نے قورمہ بنالیا.....؟ شاید اس کے انتظار میں تھی۔ اسے دیکھتے ہی سوال داغا وہ لمحہ بھر کو ساکت رہ گئی۔ ''تم سے کس نے کہا میں قورمہ بنا رہی ہوں۔''

''آپی نے.....'' ردا نے جواب دیتے ہوئے اس کے منہ کے بگڑتے زاویے دیکھے۔

''نہیں بنائی..... پیاز جل گئی مجھ سے۔'' وہ دھم سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

''جل گئی..... یا تم نے جلادی جان بوجھ کے۔'' ردا نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب ہے میں جان بوجھ کر کیوں جلاؤں گی۔'' اس کی عادت تھی چوری اور سینہ زوری۔

''جیسے کل اظہر بھائی کی شرٹ جلائی تھی۔'' ردا بخوبی سمجھتی تھی اس کی عادتیں۔ کزن پلس بچپن کی دوست جو تھی۔

''توبہ ہے..... کیسے پل پل کی خبریں دیتی ہیں تمہیں تمہاری بہن۔'' اس نے کھسیاہٹ جھنجھلاہٹ میں چھپائی۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس وقت اظہر بھائی اس شرٹ کے لیے آپی پر گرج رہے تھے میں نیچے ہی تھی۔'' ردا کو اس کی بات پر غصہ آیا۔

''میں نے ان کی شرٹ جان بوجھ کر نہیں جلائی تھی سچ کہہ رہی ہوں۔'' رحمہ نے اس کا ناراض چہرہ دیکھ کے صفائی دی۔ ''مگر بھابھی کو پتا تو ہے کہ مجھے استری کرنے سے کتنی کوفت ہوتی ہے پھر بھی مجھے اس کام پر لگا دیا۔''

''ذرا بتاؤ تو..... تمہیں کون سا کام کرنے سے کوفت نہیں ہوتی۔'' ردا کا انداز استہزائیہ تھا۔

''تمہیں پتا بھی ہے اظہر بھائی غصے کے کتنے تیز ہیں پھر بھی تم..... تمہیں بہت مزہ آتا ہے ناں آپی کو ان سے ڈانٹ پڑوا کر.....؟''

ردا کی متاسفانہ نظریں خود پر محسوس کر کے وہ کسی قدر شرمندگی میں گھر گئی۔

''نہیں..... مجھے بھلا کیوں مزہ آئے گا۔'' وہ دھیرے سے منمنائی۔ ''اچھا چھوڑو..... آج سے مکمل دھیان لگا کر ہر کام کروں گی پرامس.....'' کام بعد کی بات تھی وعدہ تو وہ کر ہی سکتی تھی۔

''بہت مشکل ہے۔'' ردا اس کی مزاج آشنا تھی سو مایوسی سے سر ہلایا۔

''اف.....'' رحمہ نے غصے سے دیکھا۔ ''ٹھیک ہے مت مانو۔ بھاڑ میں جاؤ۔''

''ثابت کرو۔'' ردا نے اثر نہیں لیا اس کے غصے کا۔

''کردوں گی۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''ردا..... ایک کپ چائے بنادو اچھی سی۔''

شاویز کی بھاری — آواز ان دونوں کو چونکا گئی وہ پلٹ گیا تھا۔

رحمہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''شاویز بھائی آج آفس نہیں گئے۔''

''اپنے کسی دوست کے والد کی عیادت کو جانا تھا۔'' ردا بتاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''رکو ردا! میں بنادیتی ہوں ان کے لیے چائے۔'' کچھ دیر پہلے ردا سے جو وعدہ کیا تھا اس کا اثر تھا۔

ردا نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔ ''معاف کردو بہن۔ شاویز بھائی غصے میں اظہر بھائی سے چار ہاتھ آگے ہیں۔'' ردا متوقع صورتحال کا سوچ کر ہی دہل گئی۔

''ارے..... یہ ایک کپ چائے بنانے میں، میں کتنی گڑبڑ کرسکتی ہوں بھلا۔'' ردا کی اس قدر بے اعتباری پر وہ برہم نہ ہوتی تو اور کیا ہوتی۔

ردا کچھ دیر سوچتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر بادل نخواستہ سر ہلایا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔''

''اور وہ خوش ہوتی اس سے پہلے ہی کچن کی سمت بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن ردا کو اچانک بخار نے آگھیرا تو شامت اس کی آئی کہ پہلے اوپر کی صاف صفائی اور اس کے لیے دلیہ، اور شاویز کے لیے کھانا اوپر پہنچانا اس کی ذمہ داری تھی اور آج تو سنڈے بھی تھا، اس لیے شاویز کے لیے ہر دو منٹ بعد چائے کا کپ بھی اس کا پیمانہ صبر بس لبریز ہونے کو تھا۔ جب وہ رات کے کھانے کے برتن نیچے لے کر آئی تو بھابھی نے اسے آواز دے کر پھر سے روک لیا۔

''رکو رحمہ چائے بنائی ہے، شاویز کے لیے لے جاؤ۔''

''بھابھی.....'' اس نے حیرت اور جھنجلاہٹ سے انہیں دیکھا۔ ''ابھی تو آئی ہوں نیچے..... مار ہی ڈالیے مجھے یہ اوپر نیچے کے چکر لگوا لگوا کر یا پھر بول دیجیے۔ اپنا بوریا بستر لے کر اوپر ہی سیٹ ہوجاتی ہوں۔ ردا کی تو مجبوری ہے سیڑھیاں نہیں اتر سکتی۔ ان مہاراج صاحب کی کیا پریشانی ہے نیچے آکر نہیں کھاپی سکتے۔'' شدید بیزاری اور جھلاہٹ میں کہتے ہوئے وہ کچن میں داخل ہوتی اماں کو دیکھ ہی نہیں پائی تھی۔ نتیجتاً ان کا زوردار تھپڑ ہی اس کی زبان کو بریک لگا لیا۔

''کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔'' اماں نے دانت پیسے۔ ''یہاں گرمی میں چولہے کے آگے کھڑے ہوتے ہوئے بھی موت آتی ہے۔ دو چکر اوپر کے کیا لگا لیے ٹانگیں ٹوٹنے لگیں مہارانی کی۔ رہنے دو ندرت، تم یہ چائے صرف اظہر کے لیے ہی بنادو۔ شاویز کے لیے اب یہ چائے اوپر جاکر ہی بنائے گی بھلے اسے موت آئے یا ٹانگوں پر فالج گرے۔''

''اماں.....! کمر سہلاتے ہوئے وہ روہانسی ہوکر اتنا ہی کہہ سکی۔

''رہنے دیں اماں میں خود ہی اوپر لے جاؤں گی۔'' بھابھی نے دبے لہجے میں منع کیا۔ انہیں بخوبی پتا تھا رحمہ سے زبردستی کام کروانے کا کیا نتیجہ ہوتا تھا۔

''جاؤ۔'' اماں نے ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے کڑے لہجے میں اسے جانے کا حکم دیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے باہر نکل آئی۔

''یا اللہ..... خیر ہی رکھنا۔'' اس کے بادل نخواستہ انداز دیکھ کر بھابھی یہی دعا مانگ سکتی تھیں۔

''یہ کیا ہے.....؟'' اس نے پہلا گھونٹ لیتے ہی جس طرح منہ بنایا۔

رحمہ نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی ''یخنی ہے۔'' دھیمے سے بڑبڑ کر کہا۔

''شیرے میں دودھ ڈال کر لے آئیں تم۔'' چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کا لہجہ ناگواری سے بھرپور تھا۔

''نہیں..... چینی، پتی اور پانی میں دودھ ڈال کر لائی تھی۔'' اس نے سوچ سوچ کر بتایا۔ ''چھ سات بار جوش دیا۔ اب چائے سوکھ گئی اور چینی زیادہ ہوگئی تو اس میں میرا کیا قصور۔'' وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

''اس دن کیسے چائے بنائی تھی.....؟'' سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

''وہ تو ردا تھی ناں پاس، وہ بتاتی رہی تھی۔ ورنہ مجھے چائے بنانا تھوڑی آتا ہے۔ کبھی چینی زیادہ ہوجاتی ہے تو کبھی پتی بھابھی سے پوچھ لیں۔'' ناخن کترتے ہوئے وہ بے نیازی کی انتہا پر تھی۔

''تمہیں چائے بنانی بھی نہیں آتی۔'' اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو بے یقینی ابھر کے معدوم ہوئی۔

''نہیں مگر اب سے اماں نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ جب جب آپ چائے مانگیں میں آپ کو بنا کر دے دیا کروں۔ میری پریکٹس ہوجائے گی تو میں چائے بنانا سیکھ لوں گی۔'' وہ جیسے اسے تسلی دے رہی تھی مسکراہٹ ضبط کیے۔

''مجھے چائے بہت پسند ہے۔'' اس کا انداز اطلاع دینے والا تھا۔

''جانتی ہوں۔'' رحمہ کو حیرت سی ہوئی وہ اسے یہ کیوں جتا رہا تھا۔

''اس لیے تو کہہ رہی ہوں جب چائے پینی ہو بتا دیجیے گا..... میں ردا کے کمرے میں ہی ہوں۔'' وہ اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر باہر نکل گئی۔

شاویز نے ایک گہری سانس لے کر کپ کو دیکھا۔ اس کی خوشنما رنگت دیکھتے ہوئے پھر سے ایک گھونٹ بھرنے کی خواہش ابھری تھی۔ تب ہی آپی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''شاویز..... رحمہ نے چائے بنا کر دی؟''

اس نے بنا کچھ کہے کپ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھمایا۔

وہ ناسمجھی میں کبھی اسے تو کبھی کپ کو دیکھنے لگیں۔ دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہی تھی چائے۔

''آپ پی لیجیے اپنی نند کی بنائی ہوئی چائے اور میری مانیے تو اب اسے چائے بنانا سکھا ہی دیجیے۔'' اکھڑ سے لہجے میں کہتا وہ اپنا سیل اٹھا کر کمرہ چھوڑ گیا تھا۔

ہکا بکا ہوتے ہوئے انہوں نے چائے سے ہلکا سا گھونٹ لیا اور جیسے منہ میں شکر گھل گئی ہو ان کی سمجھ میں نہیں آیا خود کو کوسیں یا پھر رحمہ کو۔

☆☆☆

آج دعوت تھی پھپھا اور پھپھی جی کی۔ جو عمرہ کر کے آئے تھے۔ سارا انتظام بھابھی نے سنبھالا۔ پھر ردا بھی تھی ان کی مدد کرنے کو۔ اسے صرف سلاد بنانے اور سرو کرنے پر لگایا گیا تھا۔ بلکہ بھابھی تو اس سے وہ بھی نہ کرواتیں اگر اماں کی ناراضی کا خیال نہ ہوتا۔ ڈنر کے بعد جب کچن میں سنک میں برتنوں کا ایک ڈھیر جمع ہو چکا تھا اماں نے اسے حکم دیا انہیں دھونے کا۔ جہاں اس کے ماتھے پر سوسو بل آئے۔ وہیں بھابھی کی رنگت زرد ہو چلی۔

''نہیں اماں..... خدا کے لیے..... میں دھولوں گی.....'' آج کی دعوت کے لیے انہوں نے خاص طور پر اپنا نیا ڈنر سیٹ نکالا تھا لہٰذا انہیں فکر تو لاحق ہونی ہی تھی۔

''کوئی نہیں..... کچھ ہاتھ پیر۔ سے بھی ہلانے دیا کرو۔ یہ کیا کہیں کی مہارانی ہے جو بیٹھے بیٹھے مفت کی روٹیاں توڑے گی۔ تم ویسے بھی تھک گئی ہوگی۔ جاؤ..... جا کر آرام کرلو۔''

اماں کی اس بات پر وہ سرتاپا سلگ کر رہ گئی۔ کبھی کبھی اسے لگتا اماں بھابھی کی نہیں اس کی ساس ہیں۔ پھر اسے خیال آیا وہ ساس ہونے کے علاوہ ان

کی تائی اور خالہ بھی تو ہیں۔

''ٹھیک ہے۔ دھورہی ہوں اور باتیں نہ سنایئے۔'' وہ بے حد بگڑے تیوروں کے ساتھ سنک کے قریب آئی تھی۔

بھابھی متذبذب سی وہیں کھڑی تھیں۔

''ندرت..... تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا جاؤ اپنے کمرے میں تھوڑی کمر سیدھی کرلو۔'' اماں کو ڈر تھا کہ ادھر وہ کچن سے نکلیں اور ادھر بھابھی اسے ہٹا کر خود ہی برتن دھونے نہ کھڑی ہوجائیں۔ ان کی ڈانٹ پر وہ بادل نخواستہ کچن سے نکلی تھیں اور ان کے ساتھ اماں بھی نکل گئیں۔

''اف..... مصیبت..... مصیبت..... اگر مجھے پتا ہوتا کہ بعد میں برتنوں کا اتنا بڑا ڈھیر مجھے دھونا پڑے گا تو میں اسی وقت کوئی اور کام کرلیتی۔ خود تو آسان آسان کام کرلیے اور یہ مشکل کام میرے لیے رکھ چھوڑا۔ چالاک نہ ہوں تو.....'' وہ غصے سے جھلاہٹ کی انتہا پر تھی۔

اس کے لیے ہر وہ کام آسان تھا جو دوسرے کرتے تھے۔ ہر وہ کام مشکل جو اسے کرنا پڑتا۔ اسی جھلاہٹ میں وہ دھلے ہوئے برتن ایک دوسرے کے اوپر رکھتی جارہی تھی بہ پرواہ کے بغیر کہ ان اوپر تلے رکھے برتنوں میں کوئی ترتیب اور توازن نہیں تھا۔

آخری پلیٹ دھو کر اس نے جونہی اس مینار کے اوپر رکھی۔ برتن کا ڈھیر اس پلیٹ کا بوجھ نہ سہار سکا۔ اور نتیجتاً وہ سارے برتن سنک سے زمین پر آرہے تھے۔ کافی زوردار آواز آئی تھی۔ اظہر بھائی نے لاؤنج ہی سے چلا کر پوچھا۔

''کیا ہوا؟'' اماں اور بھابھی دوڑتے ہوئے کچن میں آئیں۔

اپنے ڈنر سیٹ کے نازک اور نفیس برتنوں کو کچن کے فرش پر تباہ حالوں میں دیکھ کر بھابھی کی آواز ان کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

''رحمہ..... تیرا ستیاناس ہو۔'' اماں کی آواز صدمے سے چور تھی۔

''اماں..... میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا بھابھی میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' بھابھی کی اڑی رنگت اور اماں کا غضبناک چہرہ دیکھ کر اس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''تم کبھی بھی..... کچھ بھی جان بوجھ کے نہیں کرتی ہو رحمہ'' بھابھی کی آواز دھیمی پڑی تھی۔ پہلی بار ان کی آنکھوں میں نمی جھلملائی تھی۔ اور وہ اماں کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھتی کچن سے باہر نکل گئی تھیں۔ اماں نے ہاتھوں میں سر پکڑ لیا۔

☆☆☆

''بڑی مامی کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ اگلے ہفتے بات پکی کرنے آنا چاہ رہے ہیں۔'' چائے کا کپ انہیں پکڑاتے ہوئے رداان کے مقابل بیٹھی۔ تو آپی نے اسے اطلاع دی۔

''بالآخر.....'' اس کے ہونٹوں پر شرمگیں مسکراہٹ ابھری۔ اس کی اور یاسر کی محبت دو سال بعد بڑوں کی رضامندی پا گئی تھی۔

''میں نے کہا جب جی چاہے آئیں۔ بلکہ جتنی جلدی آئیں اچھا ہے۔ پھر مجھے شادیز کی بھی فکر کرنی ہے۔'' چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو رداچونک گئی۔

''بھائی کی کیا فکر کرنی..... لڑکی تو گھر کی ہی ہے۔''

''ہاں.....'' انہوں نے طنزیہ ہنکارا ابھرا سے تو بھول ہی جاؤ بی بی۔ سر جھٹکتے ہوئے ان کے چہرے پر یکدم پتھریلا سا تاثر ابھر آیا۔

ردا سیدھی ہو بیٹھی۔ ''کیا مطلب آپی، آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اسے لگا شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''یہ بیل اب منڈھے نہیں چڑھ پائے گی..... میں نے بہت کوشش کی کہ میں اس لڑکی کو تھوڑا سدھار لوں۔ مگر میں مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہوں۔ اللہ بخشے اماں نے ایک بات کہی تھی اس بات کا پاس ہی تھا کہ میں خلوص نیت سے اسے سکھانے کی سمجھانے کی

کوشش کرتی رہی اس کی تمام تر بدلحاظیوں اور بدمزاجیوں کو برداشت کرنے کے باوجود تم نے کبھی دیکھی ہے ایسی بھاوج جو نند کے ہر قسم کی نخرے برداشت کرتے ہوئے اسے سر پر بٹھائے رکھے۔''

''ہاں مگر..... وہ تھوڑی لاابالی ہے۔'' ردا بے اختیار اس کا دفاع کر گئی۔

''لاابالی نہیں ہے ردا۔ وہ لاپرواہ، بے حس اور خودغرض بھی ہے۔ تم بھی تو ہو اس کی ہم عمر، تم کیوں نہیں ہو اس کی طرح لاابالی۔'' وہ پوچھ رہی تھیں۔

''میری بات الگ ہے آپی، اس نے وہ وقت نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا اماں کی ڈسپتھ اور آپ کی شادی کے بعد گھر کی ذمہ داری مجھے ہی اٹھانی تھی۔ مگر اسے دیکھیں۔ پہلے فضا آپی تھیں ان کی شادی ہوئی تو آپ بیاہ کے چلی گئیں۔ اسے کسی ایسی صورت حال کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا ابھی جو اسے اس کی ذمہ داریوں سے روشناس کرواتا۔'' وہ ردا کے بچپن کی ساتھی تھی۔ ردا کے پاس بہت سی وجوہات تھیں اسے رعایت دینے کی، مگر آپی کا معاملہ یکسر مختلف تھا۔

''تم اسے نہیں بھگتیں ردا۔ اس لیے تم یہ باتیں کہہ سکتی ہو۔ ایسی نندیں جب بیاہ کے جاتی ہیں تو بھاوجیں سکھ کا سانس لیتی ہیں۔ میرا کیا دماغ خراب ہے کہ اسے بھابھی بنا کر اپنے لیے عمر بھر کا عذاب مول لے لوں۔'' وہ جیسے بھری بیٹھی تھیں۔

''مگر آپی..... یہ اماں کی خواہش تھی ناں.....؟'' ردا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیسے انہیں سمجھائے۔

''اماں اب اس دنیا میں نہیں ردا۔ اور بھگتنا انہیں نہیں۔ ہمیں پڑے گا۔ نہ ماں نہ باپ، اکلوتے بھائی کے دم سے میکہ آباد ہے ہمارا۔ رحمہ کو اس کی بیوی بنا کر مجھے اپنے بھائی سے ہاتھ نہیں دھونے۔'' وہ شاید اس معاملے پر پہلے ہی کافی غور خوض کر چکی تھیں جبھی تو ان کا لہجہ اتنا بے لچک تھا۔

''اور تائی اماں؟ ان سے کیا کہیں گی آپ.....؟'' ردا نے ان کی توجہ دوسرے پہلو کی طرف دلائی۔

''یہ کوئی طے شدہ رشتہ نہیں تھا۔ بس اماں کی خواہش تھی۔ میں کہہ دوں گی اماں سے اشاروں کنایوں میں یا پھر یہ کہ ہم شاویز کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے ہیں وہ ضرور سمجھ جائیں گی ویسے بھی اپنی بیٹی کے رنگ ڈھنگ کوئی ان سے چھپے تو نہیں۔ اس کے باوجود اگر وہ ایسی کوئی خواہش رکھیں گی تو خودغرضی ہی دکھائیں گی۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''اور شاویز بھائی.....؟'' ردا نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتیں شاویز اندر داخل ہوا۔

''کیا باتیں چل رہی ہیں سر جوڑے..... کہیں میری غیبت تو نہیں چل رہی.....؟'' اس نے شاید اپنا نام سن لیا تھا۔ اس لیے شرارت سے پوچھتے ہوئے ان کی سامنے والی نشست پر براجمان ہوا۔

''آپ کی تو نہیں مگر آپ کی نہ ہونے والی کی ضرورت رہی تھی۔'' ردا ہنسی۔

''آپی اس وقت اسے دیکھ رہی تھیں۔ بلیک شرٹ میں آستینیں فولڈ کیے، وجیہہ چہرے پر مسکراہٹ لیے وہ بلاشبہ چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا۔ من موہنی رحمہ کے ساتھ اس کی جوڑی ایک مکمل جوڑی ہوتی۔ مگر زندگی صرف خوب صورتی کے سہارے تو نہیں گزرتی جبکہ رحمہ میں کوئی ایک بھی اچھی لڑکیوں والے گن نہیں تھے۔

''کچھ نہیں شاویز.....'' آپی نے بات بدلی۔ ''ہم تمہارے لیے لڑکی دیکھنے کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

اس کے چہرے پر حیرانی کے آثار آئے تھے۔

''میرے لیے لڑکی کس لیے.....؟''

''افوہ شادی کے لیے اور کس لیے.....'' آپی جھنجھلائیں۔

''اوہ اچھا..... مگر میں تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا۔'' وہ دھیرے سے بولا تو آپی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ جبکہ ردا نے جتانے والی نظروں

سے انہیں دیکھا تھا۔

''کیا..... کیا سمجھ بیٹھے تھے تم؟'' وہ اضطراری انداز میں پوچھنے لگیں۔

''یہی کہ ارادہ بدل لیا آپ لوگوں نے.....؟''

آپی کے مضطرب انداز نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیری وہ کسی حد تک سمجھتا تھا ان کا مسئلہ۔

''وہ ارادہ نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اماں کا تھا اس وقت جب انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ تبدیلیاں آتی ہیں انسانوں میں بھی اور وقت کے تقاضوں میں بھی۔ لیکن اگر..... تمہارے لیے اس بات کی اتنی اہمیت ہے تو ٹھیک ہے جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔'' سنجیدگی سے بات سمیٹتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں آپی، مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑا۔ وہ بھی اس صورت میں..... جب میری کوئی ذاتی پسند بھی نہیں میری طرف سے یہ معاملہ کلی طور پر آپ کے سپرد ہے۔ جو بھی چاہے کریں۔''

یہ بالکل ایسی بات تھی جو ایاں نے اپنی جٹھانی پلس، پہن سے صرف ایک بار کی تھی یا پھر اپنے بچوں سے رحمہ کو تو اس بات کی بھنک بھی نہیں تھی۔ اور اس وقت بھی شاویز عشق وعاشقی سے کوسوں دور تھا۔ اور آج بھی۔ اس کی سوچ تھی۔ ٹھیک ہے جب اس کی زندگی میں آئے گی تب دیکھا جائے گا۔ اور یہ ایک لحاظ سے اس کے لیے اچھا بھی ثابت ہوا۔ کہ اب آپی کی بات پر اسے زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی اس معاملے سے اپنا دامن جھاڑنے میں۔

''جیتا رہ میرا بھائی۔'' آپی کھل اٹھی تھیں اس کی بات پر۔ اور ردا کسی قدر مایوسی سے وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

☆☆☆

''ردا..... کیا مسئلہ ہے، کیوں منہ پھلائے گھوم رہی ہو۔ کیا بھابھی نے پھر سے تمہیں میرے خلاف بھڑکایا ہے.....؟''

ردا نے دو دن سے نیچے سے نہیں جھانکا تھا، اوپر اس سے الگ روٹھی روٹھی تھی۔ اس وقت بھی جب نیچے فضا آپی اور جواد بھائی آئے بیٹھے تھے وہ اس کی ناراضی کی وجہ جاننے میں لگی تھی۔ کچن میں کھڑی ردا نے دیگچی کے نیچے آنچ دھیمی کی اور پھر اسے گھورنے لگی۔

''تم کیا میری بیوی ہو جو وہ مجھے تمہارے خلاف بھڑکائیں گی.....؟''

''تو پھر کیا ہے.....؟'' وہ عاجز آ گئی۔ ''بھابھی کی ڈنر سیٹ کی وہ پلیٹیں میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑی تھیں۔''

''اف بند کرو۔ اپنا یہ گھسا پٹا جملہ۔'' ردا کا لہجہ بیزاریت لیے ہوئے تھا۔ ''اور ویسے بھی میں اس بات پر ناراض نہیں ہوں۔ وہ تم جانو اور تمہاری بھابھی۔''

''پھر..... پھر کیا کیا ہے میں نے.....؟'' حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ذہن کے گھوڑے دوڑائے تو پچھلے دو دن میں اسے اپنی کوئی قابل گرفت حرکت یاد نہیں آئی۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ بھابھی نے ان دو دنوں میں اس کے ذمے کوئی کام نہیں لگایا تھا۔

''کاش..... تم جان سکتیں، تم نے کیا کیا ہے۔'' ردا نے ملول ہو کر سوچا تھا۔ ''تم نے کبھی سوچا ہے رحمہ کہ ایک دن تمہاری شادی بھی ہونی ہے؟''

ردا کے سوال پر رحمہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

''پاگل ہو گئی ہے ردا..... یہ کیا سوال ہے؟''

''یہ بالکل ایسا ہی سوال ہے کہ جب میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے فکر ہونے لگتی ہے کہ تم شادی کے بعد کیا کرو گی یا پھر تمہارا یہ غیر ذمہ دارانہ رویہ دیکھ کر کون تمہیں اپنائے گا۔'' رحمہ کا گلابی چہرہ سرخ پڑ گیا۔ بلاشبہ ردا کا یہ جملہ اس کی توہین پر مبنی تھا۔

''تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے کوئی میرا رشتہ لینے آیا ہو اور میرے رویے کی وجہ سے مجھے ریجیکٹ

کر کے چلا گیا ہو۔'' اس کا لہجہ چٹخا۔

''ایسا ہی ہوا ہے۔ تم ریجیکٹ ہو چکی ہو۔'' ردا نے بمشکل خود کو یہ کہنے سے روکا ایک بار تو دل چاہا بتا ہی دے۔ مگر پھر خیال آیا کیا فائدہ جب وقت پر اسے اس بات کی بھنک بھی نہیں لگنے دی تھی ورنہ صورت حال مختلف ہو سکتی تھی۔

''کیا بات ہے میرے رویے میں، کیا جنگلی ہوں۔ پاگل ہوں۔ لوگوں کو پتھر مارتی پھرتی ہوں۔'' غصے سے پوچھتے ہوئے اس نتھنے پھڑک اٹھے۔

''بس جانے دو رحمہ..... تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔'' ردا نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

وہ مزید بپھر گئی۔ ''اور تمہارا بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ہی پاگل تھی جو نیچے مہمانوں کی آمد کے باوجود اوپر تمہیں منانے چلی آئی۔''

''لو بھلا مہمانوں کے آنے یا جانے سے تمہارا کیا سروکار۔ تم کون سا ان کے لیے خوان سجائے بیٹھی رہتی ہو۔'' اس بات پر تو ردا کو اپنی حماقت بھول کے ہنسنا ہی پڑا۔ لب بھینچے ناراضی سے اسے گھورتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ ردا سمجھ گئی اب وہ ایک ہفتے تک اوپر کا رخ نہیں کرے گی۔

☆☆☆

''اماں! آپ بھی حد کرتی ہیں بھابھی نے آپ سے یہ کہا اور آپ خاموش بیٹھی رہیں آپ کو انہیں یاد دلانا چاہیے تھا کہ خالہ جی نے آپ سے کیا کہا تھا۔''

وہ بڑی بیزاری کے عالم میں اماں کے کمرے کی طرف آئی تھی مگر اندر سے آئی فضا آپی کی غصے بھری آواز نے اسے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کر دیا۔

''تھوڑا تو عقل سے کام لو فضا! میں بھلا اس سے کیا کہتی۔ بیٹیاں کیا زبردستی کسی پر تھوپے جانے والی چیز ہیں؟ اور سچ تو یہ ہے رحمہ کا مزاج دیکھ کر مجھے پہلے ہی اس طرف سے کھٹکا لگ گیا تھا اور ہوا بھی وہی۔'' اماں کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

''تو اس میں کون سی بڑی بات ہے اماں.....

شادی سے پہلے ساری لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ شادی آتے ہی سر پر ذمہ داری پڑتی تو رحمہ بھی ٹھیک ہو جاتی۔''

''ذمہ داری الگ بات ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر تیوریاں چڑھا لینا۔ اول تو کام نہ کرنا، کرنا تو پھر ایسے طریقے سے کرنا کہ آئندہ کوئی کام ہی نہ کہے۔ ہوتی ہوں گی لڑکیاں غیر ذمہ دار شادی کے بعد ذمہ دار بھی ہو جاتی ہوں گی مگر اس صورت میں جب لڑکی بیاہ کر کسی اور گھر جائے جہاں پہلے سے اس کی عادتوں اور مزاج سے کوئی واقف نہ ہو۔ یہاں تو ندرت صبح وشام جھیلتی ہے اس کی بدسلیقگی، زبان درازی اور پھوہڑ پن، اب اگر وہ شاویز کے لیے باہر لڑکیاں دیکھنا چاہ رہی ہے تو میں اسے موردالزام نہیں ٹھہراؤں گی۔'' اماں نے ایمانداری سے تجزیہ کیا تھا۔ آپی آگے سے جانے کیا کہنے لگی تھیں۔ وہ ساکت کھڑی اس طوفان سے انکشاف کے زد میں تھی۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ کچھ کھو چکی تھی۔ بھلا کیا۔ نظروں کے سامنے وہ اپنی تمام تر وجاہت سمیت آموجود ہوا۔ اس کا ڈوبتا دل مزید بیٹھ گیا۔ وہ نجانے کیسے اپنے کمرے تک آئی تھی اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

☆☆☆

ردا کا رشتہ طے ہو گیا تھا بڑے ماموں کے ہاں اس نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ وہ لوگ بات پکی کرنے آئے تھے جب سب گھر والے اوپر تھے اس نے تب بھی اوپر قدم نہیں رکھا۔ ردا اسے فون پر فون، میسج پر میسج کرتی رہی۔

''گھنی مسینی کہیں کی دعوے دوستی کے اور اتنی بڑی بات کی منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔'' سیل اسکرین کو دیکھتے ہوئے اسے کوستے اس نے موبائل آف کیا تھا۔ احساس زیاں تھا جو دن بدن گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اپنی اب تک کی زندگی میں بس ایک دو بار ہی ایسا ہوا ہوگا کہ اس نے شاویز کے بارے میں سوچا ہو۔ ورنہ اسے لگتا تھا وہ اکثر دانستہ اس کی پہنچ سے کافی دور ہے پھر اس کے بارے میں سوچ کر اپنا دل

اور دماغ کیوں خراب کروں۔ اور اب جب علم ہوا تھا کہ وہی اکڑو انسان اس کے ہاتھ آتے آتے رہ گیا وہ بھی اس کی اپنی بیوقوفیوں کی وجہ سے تو اس کا دل چاہ رہا تھا ایک ایک سے جا کے جھگڑے، رداسے، بھابھی سے حتیٰ کہ اماں سے بھی کیوں نہیں بتایا مجھے پہلے، کیوں..... تاکہ وہ اپنی ناقابل برداشت عادتوں کو تبدیل کرتی اپنی بیوقوفیوں کو بروقت لگام دیتی۔ ایک بھابھی ہی تو تھیں جن کے پاس اس فیصلے کا اختیار تھا اور ایک بھابھی ہی تھیں جن کا اس نے ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

''اس نے سوچا وہ اب کچھ کر سکتی ہے۔'' اور پھر خود ہی اپنا خیال رد کر دیا۔ جو چھاپ وہ سب کے ذہنوں پر اپنی چھوڑ چکی تھی۔ وہ اتنی آسانی سے تو مٹنے والی نہیں تھی۔

''رحمہ.....!'' شاویز کی آواز تھی یا پھر اس کا واہمہ..... برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی، گھٹنوں میں سر دیے۔ اس کی آواز پر چونک کر دیکھا تو اسے اپنے سامنے کھڑا پایا۔

پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے وہ کسی قدر جھک کر اپنی گہری سیاہ آنکھوں میں حیرت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''یہاں کیوں بیٹھی ہو.....؟''

اس کے چہرے کے وجیہہ نقوش پر بھٹکتی اس کی نظریں جھک گئیں کیونکہ آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

''ویسے ہی.....'' اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ بلند آواز میں بولتی تو کپکپاتے لہجے کا راز نہ کھل جاتا۔ اسے اپنی کیفیت خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دل کیوں بکھرا جا رہا تھا۔ اور اسے بھی آج ہی اس کے سامنے آنا تھا۔ اسے مزید حسرتوں میں دھکیلنے کے لیے کہ وہ اپنا ضبط چھوڑتا محسوس کرنے لگی تھی۔

''کیا مہمان نہیں آئے.....؟'' اس کے یہاں بیٹھنے پر وہ یہی سمجھا آج جلدی فارغ ہونے کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے آفس سے اٹھتے اٹھتے بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔

''کیوں نہیں، آئے تو ہیں.....'' سر جھکائے وہ اب اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ وہ اس کے بھاری لہجے پر چونکا۔ اور بغور اسے دیکھنے پر مجبور ہوا۔

سنہری بالوں کی موٹی سی چٹیا اس کے دائیں شانے پر آگے پڑی تھی۔ جسے وہ اضطرابی انداز میں سہلا رہی تھی۔ گلاب سے رخساروں پر سایہ فگن اس کی گھنیری پلکیں جانے کیوں اسے بھیگی بھیگی سی لگیں۔

''رحمہ..... یہاں دیکھو میری طرف..... تم کیا کسی سے ناراض ہو۔''

''نن.....نہیں تو.....وہ گھبرا سی گئی۔

''تو پھر اتنی اداس کیوں بیٹھی ہو۔'' اس نے پوچھا تھا۔

''وہ.....اماں نے کپڑے استری کرنے کا کہا تھا۔ میں بھول گئی۔ تو اماں نے ڈانٹا بس۔'' بولتے بولتے لہجہ گلوگیر ہوا تو وہ چپ کر گئی۔ دل کے درد کو اس بہانے میں چھپانا ہی پڑا تھا۔

''تائی اماں بھی حد کرتی ہیں..... اتنی سی بات کے لیے ڈانٹنے کی کیا ضرورت تھی۔'' اس کا مرجھایا چہرہ دیکھ کر وہ جیسے دل ہی دل میں ان پر خفا ہوا تھا اور پھر جیسے ہی احساس ہوا ساکت سا رہ گیا۔

مزید کچھ کہتے کہتے اس نے ارادہ بدل لیا تھا۔ اور اس کی سائیڈ سے ہو کر اندر چلا گیا۔ ایک گہری سانس لے کر اس کی پرفیوم کی مہک اندر اتارتے اس کی آنکھیں چھلکی تھیں کے احساس سے۔

☆☆☆

''اگر تم میری بچپن کی دوست نہ ہوتیں تو میں بھی یہی سمجھتی کہ تم مجھ سے جل رہی ہو۔'' رداآج خود ہی اس کے کمرے میں چلی آئی تھی اور اب شرارتی لہجے میں کہتے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھی۔

''ہاں..... میری تو جیسے عمر نکل گئی ناں اور ویسے بھی میری حرکتیں دیکھتے ہوئے کون مجھے اپنے سر لے گا۔'' وہ کلس کر رہ گئی۔

''ارے.....'' رداسے پہلے تو قدرے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر ہنسنے لگی۔

''تم اس بات پر ناراض ہو اب تک.....؟ اور میں سمجھی پتا نہیں کیا بات ہوگئی ہے۔ وہ بات تو میں نے تمہارے بھلے کے لیے کہی تھی۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ میں تم پر طنز کرسکتی ہوں کیا۔'' وہ اب سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''بھلا..... ہونہہ..... منافق..... دوغلی.....''

دل ہی دل میں سوچتے ہوئے حد درجہ متنفر تھی۔

''مجھے نہیں ضرورت تمہارے بھلے کی۔ ایسا بھلا اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھو، کسی کو کیا پتا میں کسی ہوں اور بقول اماں یوں تو ویسے بھی کوئی نہ کوئی مجھے بیاہنے آ ہی جائے گا۔ جو میری عادتوں سے ناواقف ہو۔'' آخری بات اس نے دل میں سوچی تھی۔

''کسی کو نہیں پتا۔ مگر تمہیں تو پتا ہے ناں۔''

''چھوڑو ردا.....'' اس نے بیزاری سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم لوگوں نے اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھی.....؟'' پوچھتے ہوئے اس کا لہجہ عجیب ہی استہزا لیے ہوئے تھا۔ ردا نے نوٹ ہی نہیں کیا کہ اس نے شاویز بھائی کے بجائے تمہارا بھائی کہا تھا۔''

''نہیں..... آپی کو رشنا پسند ہے۔'' بجھے بجھے لہجے میں کہتے ہوئے ردا نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

''رشنا.....'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ پھپھو کی رشنا جو ہمیشہ نک سک سے تیار رہتی تھی۔ رحمہ نے آج تک اسے کوئی کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اب اسے شاویز کے ساتھ سوچا تو دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا وہ ردا پر یہ راز نہیں کھول سکتی تھی کہ اسے اپنے ریجیکٹ کیے جانے کا پتا چل چکا ہے ورنہ اب ضرور کہتی کہ جس پھوہڑ پنے کی وجہ سے مجھے چھوڑا تو رشنا خود کہاں کی کوکب خواجہ ہے۔ مگر بھابھی کے اپنے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ پھپھو کی چہیتی تھیں اور یہ اس کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔

''اچھی ہے۔'' اس نے دھیرے سے بس اتنا ہی کہا۔

''مگر مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' ردا تڑخ کر بولی۔

''کیوں.....'' وہ متعجب سی اسے دیکھنے لگی۔

''میٹھی چھری ہے بس..... ایسے لوگ مجھے بڑے خطرناک لگتے ہیں اوپر سے میٹھے۔ اندر سے نیم۔'' ردا نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے ناں..... ہم جیسے تو نہیں۔ اندر سے بھی نیم اور باہر سے بھی۔'' رحمہ کے لہجے میں یاسیت در آئی۔

''نہیں انسان کو اندر باہر ایک جیسا ہونا چاہیے۔ ایسا تضاد رکھنے والے منافق کہلاتے ہیں اور باتی داوے..... تم سے کس نے کہا کہ تم اندر سے بھی نیم ہو؟'' وہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کہا کسی نے نہیں۔ مگر سب ہی سمجھتے ہیں۔'' وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

''سب کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے سب کے ذہن ان کے اپنے حساب سے سوچتے ہیں۔ دنیا میں ہر کوئی تو ہمیں نہیں سمجھ سکتا۔'' ردا کا انداز سمجھانے والا تھا۔

اسے اتنے دنوں سے اس کے لیے اپنی متنفر سوچوں پر شرمندگی ہونے لگی۔

ردا بے چاری کا اس میں کیا قصور بلکہ قصور تو شاید کسی کا بھی نہیں سوائے میرے۔ پہلی بار اس نے اس زاویے سے سوچا تھا اور گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

اس شام اس کا ایک دیرینہ دوست اس سے ملنے چلا آیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ آپی اور ردا کی تب تک شاپنگ سے واپسی نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کرے رحمہ کے ہاتھ کی چائے سے اسے یاد تھی۔ پھر تائی اماں کا خیال ہی اسے یہاں کھینچ لایا۔ تائی اماں تو نظر نہ آئیں۔ وہ لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھتے ضرور نظر آ گئی۔ پیر ٹیبل پر رکھے تھے۔ دوپٹہ سائیڈ پر پڑا تھا سنہری کھلی زلفیں اس کے سینے پر بکھری تھیں۔

''آہم.....'' نظر چراتے ہوئے وہ ہولے سے کھنکارا۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی۔ پیر سمیٹے۔ دوپٹہ اٹھا کر وجود ڈھانکا اور ٹی وی بند کر دیا۔

''تائی اماں کہاں ہیں؟'' اب اس نے قدرے تسلی سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''نماز پڑھ رہی ہیں کوئی کام تھا مجھے بتائیں۔'' دوپٹے کا پلو سر پر ڈالتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آں نہیں رہنے دو۔'' اس نے کچھ سوچ کر نفی میں سر ہلایا۔ اس کا دماغ خراب نہیں تھا جو وہ اسے چائے بنانے کا کہتا۔

''بتا بھی دیں۔'' وہ ٹھنکی۔

اس نے کچھ ہچکچاہٹ سے اسے دیکھا۔ ''میرا ایک دوست آیا ہے چائے کا کہنا تھا۔''

''میں بنا دیتی ہوں۔'' اس نے فوراً چپل پیروں میں ڈالی۔

''نہیں میں اسے کسی کیفے ہی لے جاتا ہوں۔'' وہ گھبرا کر اسے روک گیا۔

''کیا مطلب.....گھر آئے مہمان کو کیفے لے کر جائیں گے؟'' اس نے اچنبھے سے دریافت کیا۔

''ڈریں مت مجھے چائے بنانا آ گئی ہے۔'' اسے سمجھ میں آ گئی اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ اس لیے دھیرے سے کہتے وہ اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کچن میں چلی آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز پر وہ ڈرائنگ روم سے لاؤنج میں آیا تو نہ صرف چائے بلکہ ساتھ کئی لوازمات بھی تھے۔ اس کی حیران سی نظر ان پر سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔ نم سے چہرے کی گلابی رنگت میں سرخیاں سی بکھر گئی تھیں۔

''چاہیں تو ایک گھونٹ لے کر چائے چیک کر لیں۔'' پیشانی پر آئی لٹوں کو ہاتھ سے ہٹاتے وہ اس کی گہری نظروں کو اس کی بے یقینی سمجھی۔

''نہیں اب جیسی بھی ہے ٹھیک ہے۔'' اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ ٹرے اٹھا کر پلٹ گیا۔

رحمہ الجھی ہوئی سی اس کی بات ہی سوچتی رہ گئی۔

☆☆☆

''رحمہ.....'' اماں کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے جلدی سے موبائل تکیے کے نیچے گھسایا۔ وہ اس کی تصویر دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ وقت کا دھیان ہی نہ رہا تھا۔ اس کی تصویروں کا یہ البم اس نے حال ہی میں بنایا تھا۔ کچھ اس کی آئی ڈی سے لے کر اور کچھ ردا کے موبائل سے۔ ایک وقت تھا جب وہ سامنے ہی ہوتا تو اسے کوئی خواہش نہ ہوتی اسے دیکھنے کی۔ حالانکہ تب دسترس میں تھا۔ وہ انجان ہی سہی اور اب باؤلی ہوئی پھرتی تھی۔ اسے دیکھنے کو سوچنے کو پانے کو۔

''ندرت کی طبیعت ٹھیک نہیں، رات کے لیے دال چڑھا دے اور تو کچھ بنے گا نہیں تجھ سے۔'' اماں دروازے سے ہی پلٹ گئیں کہ کہیں وہ کوئی بہانہ ہی نہ بنا لے۔

وہ خاموشی سے کچن میں چلی آئی۔ اماں کی ہدایت کے برعکس کوکر میں گوشت چڑھا دیا۔ جانتی تھی اظہر بھائی دال کھانے کے بالکل شوقین نہیں اور یہ بھی جانتی تھی کہ اماں نے صرف اس کی سہولت کی خاطر دال بنانے کا کہا تھا۔

گھنٹہ بھر بعد ہی وہ سب کے لیے میز لگانے سے پہلے جلدی سے مٹن کڑاہی سے پلیٹ بھر کر اوپر چلی آئی۔

''کیا میں لیٹ ہو گئی۔'' وہ کھانا شروع کر چکے تھے اسے تاسف ہوا۔

''ارے نہیں بس ابھی بیٹھے ہیں کیا لائی ہو دال؟'' ردا نے اس کے ہاتھ میں پلیٹ دیکھ کر شرارت سے پوچھا۔ اس کا منہ بنا۔

''جی نہیں۔'' نروٹھے پن سے کہتے ہوئے اس نے پلیٹ شاویز کے سامنے رکھی۔

''ارے واہ کڑاہی۔'' ردا کے منہ میں پانی بھر آیا ''شام کو جب آپی کو ڈاکٹر کے پاس جاتے دیکھا تو یہی سوچا کھانا آج تم بناؤ گی۔''

شاویز کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ آئی۔ وہ اب کڑاہی ٹیسٹ کر رہا تھا۔

''کھانا میں نے ہی بنایا ہے۔'' اس نے دانت

پیسے۔ شاویز کی موجودگی کے باعث اس نے بڑی مشکل سے خود کو گالی دینے سے باز رکھا۔

''ارے نہیں سچی۔'' ردا نے بے یقینی سے پہلے اسے اور پھر پلیٹ کو دیکھا۔

''اور بنایا بھی کیا خوب ہے۔'' شاویز نے حقیقی تعریف کی۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرا۔ ''شکریہ۔'' اسے خوشی نہیں ہوئی پتا نہیں کیوں۔

''واؤ یہ تو آپی سے بھی اچھی بنائی ہے۔'' ردا نے چکھتے ہی جس طرح کہا۔

وہ سمجھی اپنے مذاق کا اثر زائل کرنے کے لیے کہہ رہی ہے۔ ''جھوٹ مت بولو اب'' اسے غصہ آیا۔

''سچ کہہ رہی ہوں کیوں بھائی؟'' اس نے تائید طلب نظروں سے شاویز کو دیکھا۔

''آپی سے اچھی۔'' اس نے کچھ دیر سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کان کھجایا۔ ''ہاں واقعی مجھے لگتا ہے یہ اس نے اپنی سیکرٹ ریسپی سے بنائی ہے۔'' وہ جانے کیوں آج اسے چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔

ردا کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ جو مذاق سہنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی اس کی آنکھیں پل میں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ لگا دونوں بہن بھائی مل کر اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔

''رحمہ.....'' شاویز نے جو اس کے نین کٹورے چھلکتے دیکھے تو گھبرا کر اس کے قریب چلا آیا۔

''مذاق کر رہے تھے بھئی تم تو رونے لگیں۔'' وہ نادم سا ہو گیا۔

ردا بھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ کب سے اتنی جذباتی ہو گئی۔

''جانتی ہوں سوری۔'' اسے خود ہی اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے اور پلٹنے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' شاویز نے بے اختیار اس کا بازو پکڑا۔

''کھانا لگانے جا رہی ہوں ہم نے ابھی نہیں کھایا۔'' اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔

''سچی ناں؟'' وہ یقین چاہ رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آج کل کیوں اس کے آنسو دیکھ کر وہ اندر ہی اندر بھیگنے لگتا ہے۔

''ہاں.....'' وہ چلی گئی اسے احساس نہیں ہوا تھا۔ اس کے اوجھل ہونے تک شاویز کی بے چین نظریں اس کے قدموں سے لپٹی رہی تھیں۔

☆☆☆

بھابھی شدید حیرت میں تھیں۔ رحمہ میں یکا یک آنے والا یہ بدلاؤ انہیں سوچنے پر مجبور کر گیا تھا کہ اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے۔ ہمیشہ بے تکان بولنے والی ترکی بہ ترکی جواب دینے والی، ایک کام کے لیے سو سو بہانے گھڑنے والی آج کل بہت چپ چپ رہنے لگی تھی اور سب سے بڑھ کر ان کے بلائے بتائے بغیر کچن کے بہت سارے کام اپنے ذمے لے لیے تھے اور انہیں خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ بغیر کسی توڑ پھوڑ کے اس کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا یہ بھی بھابھی کو انہی دنوں پتا چلا تھا۔

اس دن شام کو جب وہ کچن میں آئیں تو اسے پہلے سے موجود پایا۔

''چائے بنا رہی ہو رحمہ۔'' انہوں نے دیکھ لیا تھا وہ چائے کا پانی چڑھا چکی تھی۔

''جی بھابھی۔'' وہ چونکی ان کی آواز پر۔

''تھوڑی زیادہ بنا لو..... شاویز اور سرمد ابھی ابھی آئے ہیں۔'' سرمد چھوٹے ماموں کا بیٹا تھا شاویز سے اس کی کافی دوستی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ الجھن بھری حیرانی میں کچن سے نکل گئی تھیں۔

اور کچھ دیر بعد جب وہ چائے لے کر آئی تو کچھ اتنی ہی حیرت سرمد کی آنکھوں میں بھی امڈ آئی تھی۔ شاویز کی طرف اس نے دیکھا نہیں ورنہ اس پر نظر

پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں جو بے نام سی بے قراری ابھری تھی اس کی دھڑکن لمحے بھر کو تھمتی ضرور۔

''ارے واہ کتنی اچھی لگ رہی ہیں ہماری کزن صاحبہ اس گھریلو اور سکھڑ روپ میں۔'' ہنستے ہوئے کہتے سرمد کا انداز شرارتی ضرور تھا مگر تمسخر اڑانے والا بالکل نہیں تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ جب بھی آتا۔ چائے سے لے کر کھانے تک بھابھی کو ہی ہلکان ہوتے دیکھتا۔ اس کے چہرے پر خفت چھائی تھی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے اس کی سمت چائے بڑھائی۔

''ارے بھئی اب سمجھ دار ہوگئی ہے ہماری رحمہ۔'' بھابھی مسکرائیں۔

''اور میں سمجھا پھپھو کی صلواتوں کا نتیجہ ہے۔'' وہ ہنس رہا تھا۔

وہ سرمد کے مذاق کا جواب دیئے بغیر چلی گئی۔ یہ سرمد کے لیے ایک اور حیرت کا جھٹکا تھا۔ ان کے درمیان بے تکلفی تھی اور ایسی باتوں پر تو وہ اس سے اکثر جھگڑ پڑتی تھی۔ سرمد حیرت کا اظہار کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

''رحمہ بہت بدل گئی ہے۔'' اپنے کمرے کی سمت آتے ہوئے اس نے آپی کا یہ جملہ سنا اور چونکتے ہوئے اس کے قدم تھم سے گئے۔

''تو اچھا ہے ناں پہلے آپ ہی اس کے دکھڑے روتی تھیں۔ اب سدھر گئی ہے تو آپ اور طرح سے پریشان ہو رہی ہیں۔'' ردا کی اچنبھے بھری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''پریشان کہاں میں تو حیران ہوں۔'' وہ سر جھٹکتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

''شاویز میں سوچ رہی تھی اس ہفتے کو ہم پھپھو کے ہاں جا کر باقاعدہ طور سے رشنا کا رشتہ مانگ آئیں۔'' تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنا لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ آپی چلی آئیں۔ آپی اس سے پہلے ہی رشنا کی بابت پوچھ چکی تھیں اس لیے اب اس کے نام پر اسے حیرانی تو نہیں ہوئی مگر عجیب سی بے چینی ضرور ہونے لگی۔

''اس ہفتے کو ضروری ہے؟'' وہ پوچھتے ہوئے ان کی طرف سے گریز کر رہا تھا۔

''مطلب.....؟'' وہ اس سوال پر الجھیں۔

''مطلب ردا کی منگنی تو ہونے دیں پہلے۔ پھر اس معاملے کو آگے بڑھایئے گا۔'' لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اب وہ پوری طرح ان کی جانب متوجہ ہوا۔

''مگر شاویز میں تو چاہ رہی تھی ردا کی منگنی میں ہم تمہاری بھی بات پکی کر دیں اور ویسے بھی ردا کی رخصتی سے پہلے میں تمہاری دلہن اس گھر میں لانا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے شاید پہلے سے سب سوچ رکھا تھا۔

لب بھینچتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے کہا ناں۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ معاملہ مت چھیڑیئے۔''

''کچھ دنوں بعد۔'' تعجب سے کہتے ہوئے انہوں نے یکا یک ہی اس کے سخت ہو جانے والے تیور دیکھے۔ ''اور کچھ دنوں بعد بھلا کیا ہوگا؟ میں نے تم سے پوچھا تھا اور تب تم نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا پھر ایسے جان چھڑانے والے انداز میں کیوں بات کر رہے ہو۔'' انہیں حقیقتاً تشویش ہونے لگی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' نظریں چراتے ہوئے اس کی آواز دھیمی پڑی۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ رحمہ نے اس کی توجہ تب ہی کیوں کھینچی جب آپی اس سے اس کے نام کا ٹیگ ہٹا چکی تھیں۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا۔

''چلو کچھ دنوں بعد ہی سہی۔'' اس کے مضطرب چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے وہ ہتھیار ڈال گئیں۔

''مگر یاد رہے شاویز! میں پھپھو کے کان میں بات ڈال چکی ہوں۔ اب مجھے ان کے سامنے شرمندہ مت کرنا۔''

بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بے خیالی میں انہیں دیکھنے لگا۔ وہ کس قدر ناراضی سے کمرہ

چھوڑ گئی تھیں۔

اگر وہ ان لوگوں میں ہوتا جو اپنی زندگی میں اپنے آس پاس اپنی قیمتی اور اہم چیزوں کی پہچان رکھتے ہیں۔ اسے اپنے دل کے قریب رکھتے ہوئے اس کی موجودگی سے خود کو اطمینان دلاتے رہتے ہیں تو آج اسے اس بے چینی اس اضطراب میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی پیش آتی۔ مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں کھو جانے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا تھا اور اب اسے اس مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ تک نہیں سوجھ رہی تھی۔

☆☆☆

گھر میں ردا کی منگنی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ رشنا تین پہلے ہی آ گئی تھی بقول رحمہ آ ٹپکی تھی۔ ماموں کا گھر اب متوقع سسرال بھی بننے والا تھا۔ اس کا مالکانہ انداز دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ رحمہ دیکھ دیکھ کر کلستی رہتی۔ خاص کر شاویز کا ہر کام وہ بڑھ چڑھ کر سرانجام دیتی تھی۔ اتنی دلچسپی شاید اس نے اپنے گھر میں اپنے کاموں کے لیے نہ دکھائی ہو۔ رحمہ ان ہی اپنی خیالوں میں جلتے کڑھتے اس کا خون آدھا رہ گیا تھا۔ ہمہ وقت بنی سنوری، گھر میں پھرکی کی طرح گھومتی وہ اسے بالکل انڈین سوپ سریلز کی کوئی بہو لگتی۔

''اف شاویز کے کمرے کی بیڈ شیٹ کب سے چینج نہیں کی تم نے اتنی میلی ہو رہی ہے۔'' وہ ردا سے مخاطب تھی۔ ہونٹوں پر شوخ کلر کی لپ اسٹک لگائے وہ اپنے کھلے بالوں کو ایک ادا سے جھٹکتی تو کلائی میں پڑی چوڑیاں کھنک اٹھتیں۔

رحمہ دیر پہلے ہی اوپر آئی تھی اور اس وقت کچن میں کھڑی دودھ کے پتیلے پر نظریں جمائے کھڑی تھی جس کی چوکیداری پر ردا اسے لگا گئی تھی۔ وہ دونوں کچن کے باہر کھڑی اسے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

''کل ہی چینج کی تھی میں نے۔ اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو الماری میں پڑی ہے جا کے چینج کر لو ہونہہ میلی ہے۔'' ردا کو یقیناً اس کا انداز غصہ دلا گیا تھا رشنا کا پہلے تو منہ بنا پھر اپنی ہنسی سے وہ اسے مزید سلگا گئی۔ ردا وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔ اور تب ہی اس کی نظر رحمہ پر پڑی۔ سو بے ساختہ چلا کر اسے آواز دی۔

''او بے ہوش! کن خیالوں میں گم ہو چولہے کو دیکھو، دودھ ابل رہا ہے۔'' اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دودھ ابل ابل کر چولہے اور سلیب کو بھگو چکا تھا۔ اس نے گھبرا کر چولہا بند کر دیا۔

''کن خیالوں میں ہوں تم کو دیکھ رہی ہوں، سوچ رہی ہوں، جل رہی ہوں اور کام ہی کیا ہے میرا۔'' اندر ہی اندر بہتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

''ردا۔'' شاویز کی آواز آئی تھی۔

اس نے دروازے کی سمت دیکھا۔ رشنا جا چکی تھی مگر شاویز دروازے میں کھڑا اسے دیکھ کر رک گیا۔

''کیا ہوا.....؟'' وہ اس کا بھیگا چہرہ دیکھ چکا تھا فکر مندی سے پوچھتے وہ بے اختیار اندر چلا آیا۔ نظریں کوکنگ رینج پر کسی آبشار کی طرح بہتے دودھ پر تھیں۔

''کچھ نہیں۔'' اس کے پرتکلف لہجے پر آنسو کچھ بے قابو ہو چلے۔

''پھر رو کیوں رہی ہو اس وجہ سے؟'' اس نے دودھ کی سمت اشارہ کیا۔

''نہیں ہاتھ جل گیا ذرا سا۔'' اس وقت وہ یہی جھوٹ بول سکتی تھی۔

''ہاتھ جل گیا کیسے دکھاؤ تو.....'' وہ سنتے ہی جتنا بے چین ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ دوپٹے میں چھپائے کیونکہ ہاتھ جلا ہوتا تو وہ اسے دکھاتی۔ اس کا تو دل جل رہا تھا۔ لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر وہ اسے دکھا نہیں سکتی تھی۔ بس خاموش آنسو بہتے جا رہے تھے مزید سے مزید تر۔ سبز دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ کسی خوشنما گلاب کا عکس لگ رہا تھا۔ اس پر مستزاد بھیگی پلکوں سے رخساروں پر بکھرتے آنسو شاویز کا

دل کوئی مٹھی میں لے کر مسلنے لگا۔

''کیا ہاتھ بہت جل رہا ہے؟'' بے قراری سے پوچھتے ہوئے وہ اس کی جھکی پلکوں کو دیکھنے لگا۔

''ہاں بہت، بہت جلن ہو رہی ہے۔'' اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس کا لہجہ ٹوٹا تھا۔ وہ ساکت سا اس کی انگارہ آنکھوں میں دیکھتا رہ گیا۔ وہ ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کرتے مزید اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آئی تھی۔

☆☆☆

''میں تو تنگ آ گئی ہوں اس رشنا کی بچی سے۔''

وہ اس وقت اپنے بیڈ پر نیم دراز ایک میگزین میں دھیان لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب ردا نے کمرے میں آ کر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس کا سارا دھیان تتر بتر کر ڈالا۔

''کیوں..... کیا ہوا؟'' اس نے میگزین سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر نائٹ کریم اٹھائی۔

''کمرے کی سیٹنگ اور صفائی کے نام پر بھائی کی ساری ضروری فائلیں ادھر ادھر کر ڈالیں۔ اور اب انہوں نے آ کر میرا وہ جلوس نکالا ہے کہ پوچھو مت۔'' وہ روہانسی ہوگئی بتاتے بتاتے۔

''تو تم نے ان سے یہ نہیں کہا کہ یہ تمہارا کام نہیں ہے؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''بتایا ناں اور غصہ ہو گئے کہ تمہیں بس کام سے جان چھڑانے کا بہانہ چاہیے۔ اسی لیے اسے اس کام پہ لگا دیا۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ اتنے غصہ میں نے بھائی کو آج تک نہیں دیکھا یا پھر شاید کسی اور بات کا غصہ مجھ پہ نکال دیا۔'' تپ کر کہتے ہوئے وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''اب کہاں ہے؟'' وہ ہاتھوں کا مساج کرنے لگی۔

''اپنے کمرے میں۔'' ردا نے بتایا۔

''اوہ یعنی تمہارے بھائی کے کمرے میں۔'' اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا ردا ابھی تک نوٹ نہیں کر پائی تھی شاویز کے لیے اس کا بدلا ہوا طرز تخاطب۔

''ہیں کس کی بات کر رہی ہو۔'' وہ ہونق بن کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

''اس چھمک چھلو کی اور کس کی۔'' اس نے شریر لہجے میں کہا۔

''بکواس ہی کرنا بس۔'' ردا جھنجھلا کر اسے ایک دھپ لگا گئی۔ ''ہوگی کہیں آپی یا تائی اماں کے کمرے میں، مس چاپلوس۔'' ردا کچھ زیادہ ہی جلی بھنی بیٹھی تھی۔

''عادت ڈال لو اب تو تمہاری بھابھی بننے جا رہی ہے۔'' ردا کے چہرے سے پھسلتی برہمی کچھ اور گہری ہوئی۔

''آپی پر غصہ آ رہا ہے۔'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''مجھے رشنا کبھی پسند نہیں رہی۔''

''مگر تمہارے بھائی کو تو پسند ہے۔'' اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے کناروں پہ گلابی پن پھیلنے لگا۔

''تم سے کس نے کہا؟'' وہ بے تحاشا چونکی۔

''کسی نے نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن اگر انہیں پسند نہ ہوتی تو وہ ہامی کیوں بھرتے۔'' رخ پھیرتے ہوئے اس نے اپنے لہجے پر بمشکل قابو پایا۔

''ہونہہ۔'' ردا ایک ہنکارا بھر کے رہ گئی۔ اسے خود سخت شکایت تھی شاویز سے، اس کی صفائی کیا پیش کرتی۔

''اچھا ہے شاویز بھائی اس میٹھی چھری کے قابل ہیں۔'' اس وقت بھی جل کر اس نے یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

''یہ ڈریس اچھا تو ہے ناں میرا مطلب مجھ پر اچھا تو لگے گا ناں۔''

منگنی کا دن کل تھا رشنا اپنے لیے ڈریس بھی

سلیکٹ کر چکی تھی۔ اس وقت لاؤنج میں وہ اپنا خوب صورت اسٹائلش سا ڈریس کسے دکھا رہی تھی، رحمہ متذبذب تھی۔ کیونکہ رحمہ کے علاوہ وہاں صرف شاویز تھا جو ابھی ابھی آیا تھا۔ ردا اس وقت کچن میں تھی۔

''اچھا ہے۔'' رحمہ نے کہا ہی تھا مگر رشنا نے سنا کب۔ وہ تو اپنی تمام تر ساعتیں شاویز کی جانب لگا چکی تھی۔ جو کہہ رہا تھا۔

''اتنا لائٹ کلر.....''

''مطلب اچھا نہیں ہے؟'' اس کا چہرہ پھیکا پڑا۔

''آں..... تم پر ڈارک کلرز زیادہ سوٹ کرتے ہیں۔'' شریر سی مسکراہٹ لبوں میں دبائے وہ تو اپنی کہہ کر یہ جا وہ جا اور پیچھے رشنا کے چہرے کے رنگ کھل گئے تھے۔ اس نے اسی وقت گھر فون کر کے تاکید کی تھی کل علی کے ہاتھ اس کا نیوی بلیو کلر کا سوٹ بھجوا دیا جائے۔ جسے ابھی تک وہ پہن نہیں پائی تھی۔ چلو موقع تو بنا۔

''اور یہ سوٹ؟'' رحمہ پوچھنے لگی۔

''مجھے بھی یہی لگا تھا کہ یہ کلر مجھ پر سوٹ نہیں کرے گا اور دیکھو شاویز نے بھی کہہ دیا۔'' وہ جیسے شکر ادا کر رہی تھی بروقت پتا چلنے پر۔

''تم پاگل ہو۔'' رحمہ جل تو پہلے ہی رہی تھی چڑ بھی گئی۔ ''اچھا خاصا کلر ہے یہ اور انہیں کیا پتا لڑکیوں کی ڈریسنگ کے بارے میں۔''

''کیوں شاویز جنگل سے آئے ہیں..... جانور ہیں؟'' وہ اسے گھورنے لگی۔ ''ان کی اپنی ڈریسنگ دیکھی ہے؟''

''ہاں..... مگر فرق ہوتا ہے۔ لڑکیاں ہمیشہ بلیک یا گرے کلر نہیں پہن سکتیں۔'' وہ یہ اس لیے بھی کہہ رہی تھی کہ کل کے دن کا اس کا ڈریس بھی لائٹ پنک کلر کا تھا۔

''کچھ بھی ہو..... اب تو میں صرف ڈارک کلرز ہی پہنا کروں گی۔'' اس کی بات کی نفی کرتے شوخی سے کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر اسے سلگا گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

''میں برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھ سے اب اور نہیں دیکھا جاتا۔'' وہ رو رہی تھی اور ردا ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا نہیں دیکھا جاتا رحمہ..... کس کی بات کر رہی ہو.....؟''

''وہی جو ہونے جا رہا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی یا مر جاؤں گی۔'' سر جھکائے آنسوؤں کے درمیان کہتے ہوئے اس کا لہجہ لرز رہا تھا۔

''کیا ہونے جا رہا ہے۔'' ردا نے الجھ کر کہا اور اچھل پڑی۔ ''میری منگنی؟'' ملاکی دوڑ مسجد تک کے مصداق اس کی سوچ یہیں تک جا سکتی تھی۔ اور رحمہ جو آج دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ چونکی تک نہیں۔

''میں نے بہت ضبط کیا۔ خود کو سمجھایا۔ ایسا کیا ہے۔ اس انسان میں۔ جس نے آج تک مجھے غور سے دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ جسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ اس کا رشتہ میرے بجائے کسی اور سے کیا جا رہا ہے۔ میں صرف اس بات کو دل پر لے رہی ہوں کہ مجھے چھوڑ دیا گیا مگر پھر میں نے سوچا میں یہ بات دل پر کیوں لے رہی ہوں جب مجھے اس میں دلچسپی ہی نہیں تو مجھے اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ مجھے چھوڑے یا اپنائے۔ مگر میں ہار گئی۔ میں نے دل سے ہار مان لی۔''

''رحمہ.....'' ساکت بیٹھی ردا اس کی بات پر کانپ کر رہ گئی وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اتنے دنوں سے رحمہ یہ بات دل میں لیے بیٹھی تھی۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' اس کا چہرہ اٹھاتے ہوئے وہ تاسف اور ناراضی کی ملی جلی کیفیت میں تھی۔

''تب مجھے اس بات کی خود خبر نہیں تھی۔'' اس نے بھیگے لہجے میں کہا۔

''اور اب کیسے ہوئی.....؟'' وہ بغور اسے دیکھنے لگی۔

''بس ہوگئی.....'' اس نے نظریں چرائی تھیں۔
''میں بھائی سے بات کروں گی۔''
''نہیں.....'' وہ ایکدم تڑپ سی گئی۔
''مگر کیوں.....؟'' ردا کے لہجے میں تحیر سمٹ آیا۔ ''تم ہی تو کہہ رہی ہو کہ تم یہ سب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں تو.....؟''
''کیا کہو گی تم ان سے ..... مجھے ہمدردی کی بھیک نہیں چاہیے۔ یونہی تمہارے سامنے کمزور پڑ گئی۔''
اس نے آنسو صاف کیے۔
''مگر تم انہیں پسند کرتی ہو۔'' ردا پھر سے بولی۔
''رشنا بھی انہیں پسند کرتی ہے۔ اور اگر بات پسندیدگی کی بنیاد پر ہو تو ان کی ترجیح رشنا ہوگی کیونکہ وہ ان کی بہن کی بھی پسند ہے۔'' اس نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔
ردا چپ سی ہوگئی۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی اسی وقت کوئی ان کی باتیں سن کر خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا۔

☆☆☆

منگنی کا سارا ارینجمنٹ لان میں کیا گیا تھا۔ تیز روشنی میں ڈارک پرپل کلر کے ڈریس میں بنی سنوری ردا ایک شیر میلی مسکان لبوں پر سجائے آج بے حد اچھی لگ رہی تھی رشنا الگ نیوی بلیو کلر کے لباس میں چمکتی پھر رہی تھی۔ توجہ تو اس نے بھی خود پر دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مگر اسے لگ رہا تھا شاید ہی اس کا اندرونی اضطرار دلگرفتگی اس کے چہرے پر وہ رنگ نہیں آنے دیں۔ چو وہ ردا رشنا یا باقی لڑکیوں کے چہروں پر دیکھ رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ کب سے کسی کی پرشوق نگاہوں کی گرفت میں تھی۔ گلابی رنگ کے لباس میں سجا اس کا نازک سا وجود کبھی اس کی توجہ کا مرکز بنتا۔ تو کبھی اس کے کانوں میں ہلکورے لیتے خوب صورت سے جھمکے اس کا دل دیتے کبھی اس کی کاجل بھری آنکھیں اس کے دل میں کھبتیں۔ تو کبھی اس کے ہونٹوں کی لالی اسے اپنا تن من رنگی محسوس ہوئی۔
''یہاں کیوں اسٹیچو بنی کھڑی ہو..... اسٹیج پر نہیں آؤ گی۔'' رشنا کی آواز اسے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو وہ پاس ہی کھڑی تھی۔
''نہیں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ..... میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' اس نے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے محسوس کیے۔
''ردا بلا رہی ہے تمہیں۔'' وہ اسے ردا کا پیغام دے کر چلی گئی۔
''اس نے ایک نظر اسٹیج کی سمت دیکھا۔ اسے اپنی طبیعت واقعی ٹھیک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔
''وہاں جا کر تماشا بننے سے بہتر ہے۔ پہلے کچھ پی لوں.....'' اس خیال کے آتے ہی وہ گھر کی اندرونی سمت بڑھ آئی۔ ابھی وہ لاؤنج کے دروازے کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا تھا۔ اس نے سہارے کے لیے ہاتھ لہرائے اور تب ہی کسی کی بہت مضبوط گرفت میں اسے اپنا وجود جکڑا محسوس ہوا تھا۔ بڑی مانوس سی خوشبو تھی۔ اس کا ذہن مزید کچھ سوچنے سے پہلے ہی تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔
آنکھ کھلتے ہی دھندلائے منظر میں جو سب سے پہلے واضح ہوا تھا وہ اس کا چہرہ تھا۔ پریشان متفکر سا۔ ہاتھ میں گلاس پکڑے وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔
''کیسی طبیعت ہے رحمہ.....؟'' وہ بے چینی سے پوچھ رہا۔
اس نے اپنا جائزہ لیا تو وہ لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز تھی یقیناً وہی اسے یہاں تک لایا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بے اختیار اٹھ بیٹھی۔
''تمہارا بی پی کچھ زیادہ ہی لو ہوگیا تھا۔ میں کال سننے اس طرف آیا تھا۔ اچھا ہوا تمہیں دیکھ لیا۔ یہ کیل سی پی لو تاکہ طبیعت تھوڑی سنبھل سکے۔'' گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بغور اس کا رنگ اڑا

روپ دیکھ رہا تھا۔ بھیگے چہرے پر پانی کے موتی کہیں کہیں جھلملا رہے تھے۔ کاجل پھیلا ہوا۔ نچلا لب دانتوں تلے دبائے وہ اس کے دل کی دنیا زیروزبر کر رہی تھی۔ اس نے جھکے سر کے ساتھ اس کے ہاتھ سے گلاس لیا۔

''میں نے ابھی کسی کو بتایا نہیں۔ سوچا خواہ مخواہ سب پریشان ہو جائیں گے۔ اگر تم بہتر محسوس نہیں کر رہیں تو کسی کو بلاؤں..... آپی یا تائی اماں کو؟'' وہ کھڑے ہوئے پوچھنے لگا۔ رحمہ چونک گئی مطلب ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

''نہیں..... میں ٹھیک ہوں، آتی ہوں تھوڑی دیر میں باہر۔''

''ٹھیک ہے'' وہیں کھڑا رہا کچھ کہنے اور نہ کہنے کی کشمکش میں رحمہ نے کسی قدر حیرت اور استفہامی نظروں سے اسے دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ ''کچھ اور بھی کہنا ہے؟'' اور اس پل جب شاویز نے اندرونی کشمکش سے آزاد ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ رشنا کی آمد نے وہ پل شاویز کا ارادہ اور رحمہ کا موڈ بھی غارت کر دیا۔

''ارے آپ دونوں یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اس کی آواز حیرت سے بھرپور تھی۔ اور آنکھوں میں عجیب ہی کیفیت۔ شاویز کو اس کے یوں قریب کھڑا پا کر۔

شاویز کی آنکھوں کے لودیتے جذبے انتہائی سرعت سے سرد مہر تاثر میں بدلے تھے۔ وہ رشنا کی بات کا جواب دیے بغیر وہاں سے نکل گیا تھا۔

پیچھے رحمہ پھنس گئی رشنا کے مشکوک سوالوں کے جواب دینے کو۔

☆☆☆

میری سمجھ میں نہیں آتا شاویز، تم کیا چاہتے ہو۔ اب تو ہو گئی ناں منگنی..... اب کہو' الفاظ کے برعکس آپی کا لہجہ بہت ٹھنڈا تھا۔ ان کی نظریں اس کے چہرے کے بدلتے تاثر پر تھیں اس نے جس بے چینی سے پہلو بدلا تھا آپی کی نظروں سے چھپا نہ رہ سکا۔

''تو میں کل چلی جاؤں پھپھو کے ہاں؟''

''نہیں۔'' ان کی بات ختم ہوتے ہی اس نے جس تیزی اور قطعیت سے کہا تھا آپی حق دق سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''وجہ.....؟'' وہ استہزائیہ لہجے میں پوچھنے لگی۔ ''رحمہ کو پسند کرنے لگے ہو؟''

''پہلے نہیں کرتا تھا۔ اب کرنے لگا ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔'' لب بھینچتے ہوئے اس کا لہجہ بے بسی سے پر تھا۔

''ہم.....'' آپی نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو کیا چاہتے ہو پھر..... پھپھو سے بات نہ کروں..... اماں سے کروں.....؟'' وہ حیران ہوئیں نہ غصہ۔

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا۔ ''مجھے لگا آپ غصہ ہوں گی۔''

''کیوں ہونے لگی میں غصہ۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔ ''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جو آئیں بائیں شائیں کرنے لگے ہو یقیناً اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔ ہاں افسوس ضرور ہوا اس بات پر کہ تمہیں پہلے اس بات کا احساس کیوں نہیں ہوا۔'' وہ کچھ ملول سی ہو چلیں۔

شاویز نے خود کو سخت شرمندگی کے حصار میں محسوس کیا۔ یہ دل بھی کہاں کہاں انسان کو خوار کرواتا ہے۔

''آئم سوری..... آپ پھپھو سے بات بھی کر چکی ہیں اور.....'' اسے اچانک ہی یاد آیا جب آپی نے اسے تنبیہ کی تھی۔

''بات صرف وہ نہیں ہے۔ پھپھو سے میں کوئی بہانہ بنا بھی لوں بلکہ رشنا جاتے ہوئے مجھے خود کہہ گئی ہے کہ شاویز رحمہ کو پسند کرتا ہے۔'' انہوں نے انکشاف کیا تھا۔

حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''یہ کام تو اچھا کیا اس نے۔''

آپی نے اسے سخت نظروں سے گھورا تھا۔ اس

نے مسکراہٹ دبائی۔

''مگر اماں سے اب کس منہ سے بات کروں۔ بڑے زعم سے کہا تھا ان کے سامنے..... شاویز کے لیے باہر لڑکیاں دیکھوں گی۔'' انہیں تو سوچ کر ہی خفت ہو رہی تھی۔ وہ ان کی بات سن کر پریشان سا ہو گیا۔

''کیا مطلب..... وہ نہیں مانیں گی.....؟'' آس وزراس کی کیفیت میں پوچھتے ہوئے دل کو کئی خدشے لاحق ہوئے۔

انہوں نے حیرانی سے اس کی ہراساں صورت دیکھی۔ ''مانیں گی کیوں نہیں ہاں مگر..... شاید تھوڑا ٹائم ضرور لیں گی۔'' پہلے تسلی اور پھر اس جملے سے وہ اس کی بے چینی مزید بڑھا گئیں۔ وہ مضطرب سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میری غلطی ہے۔'' کھڑکی کے پاس آ کر تاریکی پر نظریں جماتے وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

''اور میری بھی.....'' آپی نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے سمجھنا چاہیے تھا۔ اتنا عرصہ اس کا نام تمہارے ساتھ جڑا رہا۔ تم جانتے تھے تو تمہیں نہ کہیں تمہارے دل میں اس کے لیے جذبات بھی ہوں گے۔ چاہے اس وقت تم سمجھ نہ پائے ہو۔ مگر اب ابھر کر سامنے آ گئے ناں وہ دبے ہوئے جذبے۔'' وہ خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً صحیح تھیں۔

''خیر شکر کرو..... ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔'' انہوں نے کہا تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔

''مجھے یقین ہے..... مجھے اپنی یہ غلطی سدھارنے کا ایک موقع ضرور ملے گا۔'' وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہوا تھا۔

☆☆☆

''کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ تم نے اتنی اچھی چائے بنانی کب سیکھی.....؟'' چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہی اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی کلائی تھامی، اسے اپنے سامنے بٹھا کر پوچھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے کیسی وارفتگی میں چھلکی تھی۔

''بچپن میں.....'' سر جھکائے کہتے ہوئے دھیرے سے ہنسی۔

''پھر اس دن کیا کہا تھا.....؟'' وہ جانتا تھا پھر بھی مسکراہٹ دبائے استفسار کر رہا تھا۔

''کیونکہ.....'' وہ کہتے کہتے رکی۔ ''کیونکہ کام چور تھی۔'' شرمندگی سے اعتراف کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ پڑا۔ ''مجھے لگتا تھا اچھی طرح کروں گی تو روز کرنا پڑے گا۔''

''مگر اب تو روز کرنا پڑے گا۔'' شاویز کو یقین نہیں آ رہا تھا وہ پھر سے اس کی بن گئی تھی۔

''جانتی ہوں اور کرلوں گی۔'' رحمہ نے نروٹھے پن سے کہتے اسے دیکھا۔ خود پر جمی اس کی والہانہ نگاہیں دیکھ کر دل میں اندر ہی اندر کلیاں چٹکنے لگی تھی۔

''مثلاً کیا کیا کرلوں گی؟'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''سب..... کھانا پکانا، صفائی ستھرائی، آپ کا ہر کام، آپ کے جوتے بھی میں ہی پالش کیا کروں گی۔'' وہ نہایت سنجیدہ تھی شاویز ہنس پڑا۔

''مجھے اپنے لیے بیوی چاہیے، ماسی نہیں۔'' گہری نگاہیں اس پر جمائے وہ اسے نروس کر گیا۔

''اب تو ماسی بن کے ہی دکھاؤں گی۔ اس وجہ سے تو مجھے چھوڑنے چلے تھے۔'' کب سے دل میں دبی یہ بات شکوہ بن کر لبوں پر آ ہی گئی۔ شاویز چونک گیا۔

''نہیں..... میری غلطی بس اتنی ہے کہ میں وقت پر اپنے احساسات نہیں سمجھ پایا..... اور تم بھی'' اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔۔

''میں کیوں.....!'' دل ہی دل میں اس سے متفق ہونے کے باوجود وہ پوچھ بیٹھی۔

''اگر تم وقت پر اپنے احساسات سمجھتیں تو آپی کا ناک میں دم نہ کرتیں۔'' اس نے کیا بات کی تھی اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ''آئم سوری میں بہت بری ہوں۔''

''نہیں..... بہت اچھی ہو۔ جبھی تو وقت پر

سب کچھ سدھار لیا۔'' اس نے ہنس کر اسے تسلی دی۔
''سچی.....؟'' رحمہ نے رونا بھول کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔
''اف .....'' اس کے اس معصومانہ انداز پر شاویز نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔ ''اب جاؤ۔''
''کیوں.....'' وہ ٹھنکی۔
''کہیں کھانہ جاؤں تمہیں۔'' اس نے جتنی معنی خیزی سے کہا۔ رحمہ کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ بنا ایک لمحہ ضائع کیے کمرے سے نکلتے اس کے چہرے پر بے حد دلکش مسکان تھی۔
اس کے لیے بے حد حیرت انگیز دن تھا وہ دن۔ جب اسے اماں سے پتا چلا تھا کہ بھابھی نے ان کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا۔ اماں تھوڑی متذبذب ضرور تھیں مگر انکار کے امکانات کہیں بھی ان کے رویے میں نظر نہیں آئے تھے۔ اور یہ بات اس کے دل کو سنبھالا دینے کے لیے کافی تھی۔ اماں نے فضا آپی کو بتایا تو وہ فون پر ہی غصے سے لال پیلی ہونے لگیں۔
''انکار کر دیں اماں..... فوراً انکار کر دیں۔ مذاق بنایا ہوا ہے ہماری رحمہ کا..... جب جی چاہا ریجیکٹ کر دیا۔ جب جی چاہا منہ اٹھا کر آ گئے رشتہ مانگنے۔''
اس کا دل پھڑ پھڑ اٹھا۔ بس کر دو آپی وہ سو بار بھی مجھے ریجیکٹ کر کے اپناتا مجھے قبول ہوتا۔ بھلا محبت میں کہاں کی انا۔ مگر وہ صرف سوچ سکتی تھی کہتی کیسے۔
''باؤلی ہوئی ہو فضا! ایک بات ندرت نے اپنی جھونک میں کہہ دی ہو گی میں کیا اس بات کو دل کی پھانس بنالوں۔ شاویز اتنا ہونہار میری آنکھوں دیکھا گھر کا بچہ ہے۔ میرے لیے یہی ایک وجہ کافی ہے۔ ویسے بھی ایک بات کہی تھی ندرت نے کہیں اور رشتہ تو طے نہیں کیا تھا تم بھی بھول جاؤ اس بات کو رحمہ ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے گی مجھے اور کیا چاہیے۔'' اماں نے بڑی قطعیت سے آپی کا اعتراض رد کیا تھا۔
اس کا دل چاہا جا کر اماں سے لپٹ جائے۔
اور پھر اسے دیر نہیں لگی تھی شاویز کے نام کی انگوٹھی اپنی انگلی میں سجانے میں۔
اور ادھر ردا حیران سی آپی سے پوچھ رہی تھی۔
''کیا بات ہے آپی۔ میں تو سوچ رہی تھی رحمہ آپی کی لاسٹ چوائس بھی نہ ہو گی۔ پھر آپ نے اسے رشنا پر فوقیت کیسے دے دی کیا بھائی نے کہا تھا۔'' وہ یہی ایک وجہ سوچ سکتی تھی۔
ان کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ آئی۔
''شاویز نے بعد میں کہا تھا میں نے پہلے سوچ لیا تھا۔ رحمہ کی حرکتوں سے میں جتنا زچ ہوئی تھی وہ ساری کوفت ایک طرف لیکن میں اتنی ظالم تو نہیں کہ اس ایک وجہ کے بدلے میں اس سے اس کی محبت چھین لیتی۔''
''مطلب؟'' ردا اچھل پڑی۔
''میں نے اس دن اس کی اور تمہاری باتیں سن لی تھیں۔'' آپی نے اس کی جانب دیکھتے انکشاف کیا۔
''رحمہ کا وہ رونا تڑپنا۔ تب مجھے عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ رحمہ میں بہت بچپنا ہے۔ لاابالی پن ہے۔ تم نے کہا تھا تب مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر اس دن اسے یوں روتا دیکھ کر میں نے کچھ دنوں سے اس میں آئی تبدیلی کو سوچنا شروع کیا اور مجھے سمجھ میں آ گیا۔ اس نے مجھے بڑی معقول وجہ دی تھی۔ اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کی اور مجھے ہٹنا پڑا۔''
''اوہ آپی یو آر گریٹ۔'' ردا خوش ہو کر ان سے لپٹ گئی۔
آپی ہنس پڑیں۔ ''ہاں..... تم سے زیادہ خوش بھلا اور کون ہو گا۔ تم تو چچی ہو ناں اس کی۔''
ردا بھی ہنسنے لگی۔
''اچھا..... اب دعا کرو..... رحمہ اپنی یہ تبدیلی برقرار بھی رکھے۔ ورنہ پھر شاویز کی شامت آئی ہے۔'' انہوں نے شرارت سے کہا تھا۔
''رکھے گی ضرور کیونکہ یہ تبدیلی صرف دکھاوے کی نہیں۔ محبت کی بدولت ہے۔'' ردا نے طمانیت سے سوچا تھا۔
☆☆

عمارہ جہاں

دائرہ

"سونیا نے ہی مجھے بتایا تھا یہ سب، تمہیں تو پتا ہے، ہم دونوں بچپن سے دوست ہیں۔"

"کل اس نے مجھے اپنا فیس بک اکاؤنٹ دکھایا جو وہ سب سے چھپا کر چلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بہت سے مرد بھی ایڈ ہیں۔ اس نے مجھے وہ پیارا سا سوٹ بھی دکھایا، جو اس کے ایک آن لائن دوست نے بھیجا تھا۔"

میرے ذہن میں وہی خوب صورت شیشوں کی کڑھائی سے مزین سندھی سوٹ تھا جو سونیا نے آن لائن کہیں سے خریدا تھا۔

میں نے بات کرتے کرتے آزر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی سرخ رنگت اندرونی خلفشار کا پتا دے رہی تھی۔ میں نے تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر کمان پر گرفت مضبوط کی۔

''خوب صورت سوٹ ہے، پانچ ہزار سے کم کا نہیں ہوگا۔''

میں نے اشتیاق سے کہتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔

زہر آہستہ آہستہ پلایا جاتا ہے تاکہ وہ رگ رگ میں پہنچ جائے، یہ میرا پہلا اصول تھا۔

''اچھا، سونیا سے یہ ساری باتیں مت پوچھنا، ویسے بھی اس نے مجھے منع کیا تھا کہ تمہیں یہ ساری باتیں نہ بتاؤں۔ اب اگر تم اس سے پوچھو گے تو وہ مجھ سے ناراض ہوجائے گی اور شاید دوستی بھی ختم کردے۔''

میں نے محتاط انداز اپناتے ہوئے کہا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی بگڑ جائے۔

آزر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''تم نے اس کی تصویریں دیکھیں؟''

دو دن بعد جب تیز دھوپ چلچلا رہی تھی، میں نے گیٹ سے اندر آتے ہوئے اسے پکڑا۔

ہم دونوں کزنز تھے اور ہمارے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ سونیا میری دوست تھی اور آزر کزن تھا لیکن پھر دونوں کی منگنی ہوگئی اور میں کہیں کی نہیں رہی۔ ان دونوں کی منگنی کو چار ماہ ہوچکے تھے اور ہر گزرتا دن میرے حسد میں اضافہ کررہا تھا۔

''کون سی تصویریں؟''

آزر کا لہجہ بالکل سرد تھا۔ میرے دل کے آخری کونے تک ٹھنڈ پڑ گئی۔

''تمہاری سونیا سے بات نہیں ہوتی کیا؟''

میں نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

''نہیں، ہماری بات نہیں ہوئی کچھ دنوں سے۔''

وہ مجھے کچھ الجھا ہوا لگا۔

''ویسے کتنی پیاری ہے نا سونیا؟ تمہارے ساتھ بہت جچے گی، میں بہت خوش ہوں تم دونوں کے لیے۔''

میں نے مصنوعی مسرت سے اسے دیکھا۔

''کون سی تصویریں؟'' آزر کی سوئی تصویروں پر اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

سونیا رحیم! تم بھول ہی جاؤ کہ تم کبھی اس گھر کے آنگن میں دلہن بن کر آسکو گی۔

میرے اندر زہر پھیلتا ہی جارہا تھا۔

میں نے اپنا موبائل نکالا۔

''سونیا کے دوست کی مہندی کی ہیں تصاویر، مجھے لگا اس نے تمہیں دکھائی ہوں گی۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ساتھ کھڑا یہ لڑکا کون ہے؟''

آزر کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہوتی جارہی تھیں۔ میں مسکرائی۔ میں جانتی تھی، اس ایکسپرٹ نے زیادہ پیسے دے کر یہ تصویر ایڈٹ کرکے دی تھی مجھے۔

''ہوگا وہیں مہندی پر کوئی لڑکا۔''

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''تمہیں تو پتا ہے وہ آزاد خیال لڑکی ہے، ایسی باتوں کا بالکل برا نہیں مانتی۔''

''نہیں، ایسی تو نہیں تھی سونی پہلے۔''

اس کی آواز میں بے یقینی، نفرت، غصہ سب کچھ تھا۔

''وہ شروع سے ایسی ہے، میں جانتی ہوں اسے۔''

میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

آزر موبائل ہاتھ میں لیے تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

''میرا موبائل تو واپس دو۔''

میں پیچھے سے لپکی۔

اندر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ

بھابی اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے ان کی نظروں میں اپنے لیے واضح ناپسندیدگی دیکھی۔ وہ مجھے شروع سے پسند نہیں کرتی تھیں لیکن اس بات سے فرق کسے پڑتا تھا۔

کلہاڑے کا آخری وار لگ چکا تھا، درخت پورے قد کے ساتھ زمین پر گرنے والا تھا، یہ میں جانتی تھی۔

☆☆☆

منگنی کی انگوٹھی واپس کردی گئی تھی۔

امی حیران پریشان مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

''اچانک کیا ہوگیا ان کو، تمہیں کچھ پتا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آزر نے کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر ہی منگنی ختم کردی تھی۔

سب کچھ ویسے ہی ہورہا تھا، جیسے میں چاہتی تھی۔ اس رات میں شاداں و فرحاں باہر لان میں ٹہل رہی تھی۔ کھیل بالکل میرے مطابق چل رہا تھا، میں جیت سے فقط دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ میں ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ سونیا کی کال آئی۔

''فرحین! تم نے یہ کیوں کیا؟''

اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''کیا کیا ہے میں نے؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''تم جانتی ہو کہ تم نے کیا کیا ہے۔''

اس کی آواز سرد ہوگئی۔

''اور تم اپنے کیے کا صلہ پاؤ گی فرحین! تم دیکھنا۔''

میرا دل مضطرب ہوچکا تھا، کال کٹ چکی تھی لیکن میں فون کان سے لگائے بیٹھی تھی۔ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا، میں نے خود کو تسلی دی۔

''اس جیت کو محسوس کرو فرحین!''

ہلکی ہلکی ہوائیں میرے موڈ پر اچھا اثر ڈال رہی تھی لیکن جانے کیوں اس کی بھیگی آواز میری سماعتوں میں اٹک گئی تھی۔ میں نے سر جھٹکا۔

کیا اسے معلوم تھا کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟

آزر اس سے ساری باتیں کہہ چکا تھا شاید، اب سونیا اسے لاکھ اپنی صفائیاں دیتی لیکن وہ کبھی بھی یقین نہیں کرتا، یہ میں جانتی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں ہر لمحہ آزر کے ساتھ رہ کر اس کو اس غم سے نکالنے کی کوشش کرتی۔

☆☆☆

میں پارلر میں بیٹھی تیار ہورہی تھی۔ بیوٹیشن نے کئی بار مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا اور پھر آخر کار بول پڑی۔

''آپ بہت خوب صورت ہیں۔''

میں نے بے نیازی سے مسکرا کر اسے دیکھا اور شکریہ کہا۔

یہ جملہ میں کئی لوگوں سے سن چکی تھی۔ آج ہماری منگنی تھی اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

وقت لگ گیا تھا لیکن بالآخر جیت میری ہوئی تھی۔ میں گھر آگئی تھی۔ منگنی کے فنکشن کا اہتمام ہمارے مشترکہ لان میں کردیا گیا تھا۔

''آزر ابھی نہیں آیا، کسی کام سے شاید باہر گیا ہے۔ تم اندر اپنے کمرے میں ہی بیٹھو ابھی۔''

گاڑی سے اترتے ہی امی نے آگے بڑھ کر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناول

بساطِ دل

اقشاں آفریدی

بھی عجیب شے ہے

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

سرگوشی کی۔ بھابھی طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے نخوت سے سر جھٹکا اور نزاکت سے فراک کو چٹکیوں میں پکڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھی سیلفیز بنا رہی تھی کہ ایک دم دھڑام سے دروازہ کھلا۔ امی کا حق دق چہرہ سامنے تھا۔

''وہ نہیں آرہے منگنی کے لیے۔''

''کیوں؟'' میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ ''کیا ہوا؟''

میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ انہوں نے اپنا سر تھام لیا۔

''اب کیا ہوگا؟'' وہ کانپ رہی تھیں۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں بڑبڑائی۔ باہر سے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں، باہر شور ایک دم بڑھ گیا تھا۔

''کال کریں آزر کو۔''

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا، اگلے لمحے میں تیورا کر زمین پر گر گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں جان گئی کہ کھیل آخری لمحے میں پلٹ دیا گیا تھا۔ میں جیت کے بالکل قریب تھی کہ منہ کی کھا کر گر گئی۔ کہیں بھی کوئی بھی شک کا امکان نہ ہونے کے باوجود آزر ساری سچائی جان چکا تھا اور اس نے سب کو بتا دیا تھا کہ کیسے میں نے سونیا کی تصویر ایڈٹ کرائی تھی اور پھر اس کو دکھایا تھا۔ سونیا کی اصل تصویر اور ایڈٹ شدہ تصویر سب دیکھ چکے تھے۔ سن ہوتے دماغ کے ساتھ میں سب کو دیکھ رہی تھی۔ لوگ مجھے لتاڑنے کے بعد واپس گھروں کو جا چکے تھے۔

☆☆☆

ابو اور بھائی نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی لیکن کوئی بھی یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ آخر آزر کو ساری سچائی کیسے پتا چلی سوائے میرے۔

میں جانتی تھی وہ بھابھی تھیں جنہوں نے اس کو ساری بات بتائی پھر اس کو ایڈٹ شدہ تصویر بھیج دی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں سونیا کی تصویر ایڈٹ کروانے کے لیے اس ایکسپرٹ سے کال پہ بات کر رہی تھی۔ اس بندے کو میں نے انسٹاگرام پر ڈھونڈا تھا۔ تب پیچھے ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ میں پیچھے مڑی تو کوئی نہیں تھا لیکن اب..... ساری گرہیں ایک ایک کر کے کھل رہی تھیں۔ امی مجھے لعن طعن کرنے میں مصروف تھیں۔ میں ایک ہی دن میں آسمان سے زمین پر آگئی تھی۔

دن گزر رہے تھے، بھابھی روز آزر کے گھر جا رہی تھی وہ بھی اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لے کر۔

''تو اب بھابی بھی میرے ساتھ وہی کریں گی؟ جو میں نے سونیا کے ساتھ کیا تھا۔''

میں نے شکست خوردہ قہقہہ لگایا۔

لیکن پھر میری اور بھابی کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ گئیں اور ایک دن خبر آئی کہ سونیا رحیم، آزر کے ساتھ رخصت ہو کر آگئی ہے۔

اس دن ساتھ والے گھر میں خوب ہنگامہ تھا اور ہمارے گھر میں گہرا سناٹا۔

سب کی چالیں بیکار گئی تھیں اور آخری چال آسمان سے چل دی گئی تھی۔

دو دن بعد مجھے واٹس ایپ پر ایک تصویر ملی۔ میں نے خالی خالی آنکھوں سے کھول کر دیکھا، دونوں ساتھ کھڑے مسکراتے ہوئے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ میں نے نمبر پر نام چیک کیا تو سونیا آزر لکھا ہوا تھا۔ میرے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

مکافات شاید ایک گول دائرے کی طرح ہے، ہم صرف اس دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ دائرہ وہی ہے، بس لوگ بدل رہے ہیں، میں کسی کو گرا کر پوری شان سے آگے بڑھ گئی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آکر مجھے گرا دیا اور قطار سے ہی نکال دیا۔ یہ دائرہ ہمیشہ یونہی رہنے والا تھا تاکہ مکافات کے لیے ترتیب برقرار رہے اور یہ بات کرما کے شروع ہوتے ہی میرے سمجھ میں آگئی تھی۔

☆☆

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اورکہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ　　ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن　　عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

فرح بخاری

وہ نازنین

عبدالواسع کوئٹہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اپنے باغ کے حصول نے واسع کو وکالت کی طرف مائل کیا ہے۔ واسع کی بہن رباب پھوپھی زاد نصیر سے محبت کرتی ہے، لیکن گلشن پھپھو دونوں کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کے ہاں بنا وٹے سٹے کے شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ سیف اور نغمہ کی شادی کو چھ برس بیت چکے ہیں لیکن ان کی کبھی ایک دوسرے سے نہیں بنی۔ پشمینہ سیف کی بہن ہے، وہ رئیس کی بچپن کی منگ تھی لیکن چھ برس پہلے ایک واقعے نے ان کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیے تھے۔ نازنین کوئٹہ شہر میں اپنے بابا کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بابا کسی بیوہ عورت سے چوری چھپے شادی کر چکے ہیں اور اس کا رشتہ اپنے ایک رنڈوے دوست کے ساتھ طے کر دیتے ہیں۔ نازنین عین نکاح کے وقت شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دولہا والے دلہن کو زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں۔ ادھر واسع کوئٹہ سے گھر واپس جا رہا ہے۔ بس میں ایک مسافر لڑکی تمام راستہ روتی ہوئی ملی، واسع کو شبہ گزرا کہ اس کی ساتھی عورت اسے اغوا کر کے لے جا رہی ہے لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر پایا۔ اگلے روز اسے اپنے کمرے میں اچانک سامنے پا کر واسع کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ معلوم ہوا وہ لڑکی اس کے چچازاد سیف اللہ کی سالی نازنین ہے اور اب یہیں رہنے والی ہے۔ نازنین کو اس کی بہن نغمہ نے مصیبت سے نکالا تھا۔

اب آگے پڑھیے۔

گیارہویں قسط

ناولٹ

''کیا ہوا اماں! پھر سر پکڑے بیٹھی ہو۔ نہ رات کھانا کھایا، نہ ناشتا کیا۔'' نیلم پریشان ہو کر ماں کے نزدیک آ بیٹھی۔

''چائے بنوا دو، فضیلت سے کہہ کر۔'' نگار کی آواز میں سستی کا غلبہ تھا۔

''چائے ہی پیتی جا رہی ہیں۔ کچھ کھا بھی لیں۔''

''کچھ نہیں کھایا جاتا۔ ہاہ۔'' وہ جیسے خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔

''رات میری آنکھ کھلی، آپ تسبیح پڑھے جا رہی تھیں۔ کب سوئیں؟''

''نیند کہاں آتی ہے آج کل۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں کہتے اپنی جگہ سے اُٹھ گئیں۔

نیلم نے خاموشی سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ نیلم کو وہ زیادہ تفصیل سے تو نہیں بتاتی تھیں لیکن اُسے اندازہ ضرور تھا۔ اماں کی شبنم سے جب بھی فون پر بات ہوتی، اس کے بعد وہ یونہی پریشان ہو جاتیں۔

شبنم کی کچھ مہینہ بھر ہوا طبیعت ذرا زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ ہر وقت نیند، کراوٹ، اُلٹیاں اور ایکدم نڈھال سی۔ یوں تو ایسی حالت میں ان علامتوں کا ہونا ایسا کوئی اچنبھے کا باعث نہیں تھا لیکن نگار کو پریشانی اس کے سسرالیوں کے رویے پر تھی۔

پانچواں مہینہ آ گیا تھا لیکن وہ لوگ اُسے ایک مرتبہ بھی کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے گئے تھے۔ نگار نے دبے دبے اس کی ساس سے خود بھی کہا کہ ایک بار کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھی لے جائیں لیکن اس نے آگے سے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ان کی خاندانی دایہ زیادہ اچھی دیکھ بھال کر رہی ہے۔

''خان۔'' جبار کو تیار ہو کر باہر نکلتے دیکھ نگار جلدی سے جگہ چھوڑ کر پیچھے آئیں۔ ''خان۔''

''ہوں؟'' وہ بیزاری سے پلٹے جیسے رُکنے کے موڈ میں نہ ہوں۔

''خان۔ وہ آپ سے کہا تھا، ایک بار شبنم کے سسر یا اس کے شوہر سے بات کر لیں۔''

''کیا بات۔ کس لیے؟'' وہ تو کسی اور ہی معاملے پر سوچ رہے تھے۔ غائب دماغی سے رُک کر نگار کو دیکھا۔

''خان! آپ سے کہا تھا، شبنم کی طبیعت خراب ہے۔ وہ لوگ نہ اُسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں نہ ہی یہاں آنے دے رہے ہیں۔ میرے پاس ہی آ جاتی کم از کم تو میں خود اُسے۔''

''ارے تو میں کیا بات کروں۔ اب یہ کیا میرے بولنے کی باتیں ہیں۔''

''خان! کسی ڈھنگ سے تو بات کریں، نہ روپے پیسے کی کوئی کمی ہے، نہ موٹروں کاروں کی، ایک آدھ بار ڈاکٹر کو دکھا لینے میں کیا حرج ہے، پہلے بچے کا معاملہ ہے، وہ بے چاری تکلیف سے بے حال ہے۔''

''تمہاری بات ہوئی؟ کیا کہتی ہے وہ بلال کی ماں۔'' وہ ذرا دیر کو رُک ہی گئے۔

''کہتی ہے خاندانی دایہ دیکھ رہی ہے، ہاضمہ ٹھیک نہیں ہے، چورن بنا دی ہے، بتاؤ اب یہ کیا علاج ہے۔''

''ہاں، تو ٹھیک ہی کرتی ہے۔ اب ایسے میں دوائیں کیا دینا۔ تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو، وہ لوگ اندھے تو نہیں۔''

''ارے آپ ایک بار.....''

''نا۔'' انہوں نے ہاتھ کھڑا کیا۔ ''یہ مردوں کے کرنے کی باتیں نہیں ہیں۔ مجھے اپنا مذاق نہیں بنوانا۔ اور یہ ذکی اُٹھا کہ نہیں۔'' اب کہ انہوں نے نیلم کی طرف دیکھا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی اپنے کمرے میں ناشتا کر رہا ہے۔''

''ہوں۔ بلاؤ۔''

''جی بابا۔'' ذکی شاید ناشتہ کر چکا تھا۔ بابا کی آواز پر رومال سے ہاتھ صاف کرتا خود ہی باہر آ گیا۔

''یہ کیا سن رہا ہوں میں۔ کیا معاملہ ہے عبدالقادر کا؟'' وہ بغور ذکی کو دیکھتے تفتیش کے انداز میں پوچھ رہے تھے اور عبدالقادر کے ذکر پر ذکی اپنی معنی خیز مسکراہٹ کو بمشکل ہی دبا پایا۔

''آں۔'' وہ ذکا نے یاد آنے کی ایکٹنگ کی۔ ''ہاں مجھے بھی پتا چلا۔ واسع کے متعلق سن کر تو ابھی

تک حیرت میں ہوں۔ توبہ۔'' ذکی نے جھرجھری لے کر شانے جھٹکے۔

''اچھا۔'' جبار نے آنکھیں چندھیا کر ذکی کو دیکھا۔ ''تم بھی حیران ہونے والوں میں سے ہو؟'' انداز میں بے یقینی تھی ذکی دانت دبا کر ہنس پڑا۔

''خوش'' ہونے والوں میں سے ہونا چاہیے نا؟''

''واسع کا نام آنے پر تو چلو ٹھیک ہے لیکن وہ لڑکی۔'' جبار کہتے کہتے ذرا دیر کو رُکے۔ ''نازنین۔ اس کا تو رشتہ لے گئی تھی نا تمہاری ماں۔'' بات کے دوران تصدیق کے لیے نگار کی طرف بھی دیکھا۔ نیلم اور وہ بھی ان کی مبہم باتوں کی طرف اب مکمل متوجہ تھیں۔

''تو اُس نے کون سا میرے نام کی انگوٹھی پہن لی، انکار ہی بھیجا تھا واپس۔'' ذکی نے بے ساختہ اپنے جذبات کا شفر سے اظہار کر دیا اور جبار کے لیے سمجھنا آسان ہو گیا۔ ذکی کے جواب سے ان کے اندازے کی تصدیق ہوئی تھی۔

''تم پر شک تو نہیں ہو گا کسی کو؟'' لہجہ کچھ دھیما سا تھا۔

نیلم کا دکھ اور شرمندگی سے دل بھر آیا۔ کل سے جو باتیں وہ گاؤں والوں کی زبانی سن رہی تھی، زندگی میں شاید پہلی بار اس کا کانچ سا نازک دل واسع سے بدگمانی میں چٹخا تھا۔ وہ اس محبوب نام سے متعلق تصور میں بھی ایسی ناپسندیدہ بات کبھی سوچ نہیں سکتی تھی۔ وہ محبت جو اب محبت کی سیڑھی سے ایک قدم اوپر جاتے عقیدت کی منزل کو چھو چکی تھی، اپنے محبوب کے ایسے چہرے کا سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بھلے وہ کبھی اس کا نہیں تھا اور شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ کسی ''اور'' کی محبت میں ''ایسا'' بھی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

اور اب یہ کیا انکشاف ہوا تھا۔ اس کے واسع کے شفاف دامن کو داغدار کرنے والا اس کا اپنا بھائی تھا۔ اور بابا..... وہ بے یقینی سے اپنے باپ کے بدلتے انداز دیکھ رہی تھی۔ ذکی کے اقرار کے بعد تو وہ ڈنڈا اُٹھا کر ایسی ناخلف اولاد کی تواضع کرتے۔ ناحق جس نے ایک شریف انسان پر جھوٹا بہتان باندھا اور اب خوش بھی ہو رہا تھا۔

''میں وہاں نہیں تھا۔ مجھ پر کیسا شک۔'' ذکی نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''تو بے وقوف لڑکے۔ عبدالقادر کو بھی ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی تیسرے چوتھے بندے سے رقم دے کر کام کروا لیتے۔ بلاوجہ خود کو شک کے دائرے میں۔

''کسی نے میرا نام لیا؟'' ذکی نے بھنویں سکیڑیں۔

''نہیں۔ لیکن سوچیں گے تو ضرور۔ تم مشورہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس پر غصہ کھا گئے۔

''کچھ نہیں ہو گا۔ آپ بس واسع کا تماشا لگتا دیکھیں اور خوش ہوں۔'' وہ ہاتھ ہوا میں لہراتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''اکا جان، واسع، نازنین اور رباب کو سن چکے تھے۔ سیف اللہ اب بھی شکی لہجے میں بدل بدل کر سوال کر رہا تھا۔ نتیجہ البتہ اس کا بھی توقع کے برعکس ہی رہا۔

''کیا ہمارا جرگہ انہیں انصاف دلا سکتا ہے اکا جان؟''

''کیوں نہیں نصیر۔ جرگے انصاف کے لیے ہی بنے ہیں۔

''لیکن سیف لالہ کا لہجہ بتاتا ہے جیسے بنا آنکھوں دیکھے سے کم پر مصالحت کرنے والے نہیں۔'' نصیر کے لہجے میں بھی سیف کا رویہ دیکھتے ہلکی سی خفگی در آئی۔

''تو پھر سیف بھی سن لے اور تم بھی جان لو نصیر! کہ جرگے میں کلام پاک پر فیصلے کروائے ہی اسی لیے جاتے ہیں کی جس واقعے کو ہم نے آنکھوں سے دیکھا نہیں اور کانوں سے سنا نہیں، اس پر اللہ کے کلام سے سچ اور جھوٹ کو پرکھ لیا جائے۔ اور یہ پھر اگلے کے ایمان پر ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے یا کلام الٰہی کو اپنے نفع نقصان پر مقدم جانتا ہے۔''

عبدالرحمن نے بھی گہری سنجیدگی سے دونوں پر واضح کیا۔ دونوں کا لہجہ ہی کچھ دیر ہوئی سرد جنگ کا تاثر دینے لگا تھا۔

''لیکن ماضی میں کچھ قسمیں بنا اگلوں کو سنے

بھی اُٹھوالی گئیں۔صرف اندازے کی بنیاد پر۔''

نصیر نے اس بار معنی خیزی سے واسع کو دیکھا جو نصیر کی بات پر بے طرح چونکا تھا۔ یہ نصیر کیا کرنے جارہا تھا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوا نصیر!'' بنا معاملے کو جانچے پرکھے ہم نے کبھی ایسا کام انجام نہیں دیا۔ اس بار اکا جان بھی ترش ہوگئے۔

''کیا نگینہ اور احمد کو سنے بغیر اُن کو قتل کردینے کی قسمیں جرگے میں نہیں کھائی گئیں؟'' نصیر نے سیدھے سیدھے نام لے کر سوال کردیا اور سیف کے لیے تو یہ دو نام ہی بچھو کے ڈنک سے کم نہیں تھے۔

''یہ کون سا موقع ہے نصیر!'' عبدالرحمن نے ایک چور نظر سیف اللہ پر ڈالتے نصیر کو گھرکا۔

''یہ وہ سچ ہے اکا جان! جو سیف لالہ کے لیے سننا بہت ضروری ہے۔ ہم جو اپنے ہر چھوٹے بڑے گناہ پر اللہ پاک سے بخشش کے طالب ہوتے ہیں۔ خود تو معافی کا بس اتنا ظرف رکھتے ہیں کہ بعض اوقات محض اندازے کی بنا پر جان تک لے لینے کی قسمیں کھالیتے ہیں۔''

''مت بھولو نصیر! کہ احمد اور نگینہ کا واقعہ کوئی اندازہ نہیں، آنکھوں دیکھی حقیقت ہے اور ان کی حرکت پر آنے والا جرگے کا فیصلہ نہایت معتبر اور عین جرگے کے اُصولوں کے مطابق تھا۔''

''گستاخی معاف اکا جان! لیکن جرگے کے فیصلوں میں ذرا سے ردوبدل کی اشد ضرورت ہے۔''

''اسے چپ کروائیں بابا جان! اس کے لہجے سے بغاوت کی بُو آرہی ہے۔'' سیف کا پھر سے چہرا لال ہونے لگا۔

''نصیر! تم اپنا دھیان موجودہ معاملے کی طرف لگاؤ، پرانے قصے چھیڑنے میں کچھ نہیں رکھا۔'' اکا جان کو دبی دبی تنبیہ کرنا پڑگئی۔

''پچھلی رات میں نے آپ سے کہا تھا کہ صبح جب آپ نازنین اور واسع کو سنیں تو سیف لالہ کو بھی درمیان میں ضرور بٹھائیں۔''

نصیر نے بنا نصیحت کا اثر لیے بات جاری رکھی اور واسع نے دل ہی دل میں اس کی ہمت کی داد دی۔

''اب مجھے سیف لالہ سے صرف ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہیے۔''

''ہوں پوچھ سکتے ہو'' انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اجازت دی اور نصیر نے خفا بیٹھے سیف کی طرف اپنا رخ موڑا۔

''میرے سامنے قرآن پاک نہیں ہے کہ میں اس پہ ہاتھ رکھ کر آپ سے سچ جانوں، لیکن کچھ سچ قرآن پاک پر نہیں دل پہ ہاتھ رکھ کر بولے جاتے ہیں۔'' نصیر نے دھیمے دھیمے کہنا شروع کیا اور وہاں موجود سب ہی افراد ہمہ تن گوش ہوگئے۔

''رات جب آپ کو نازنین کی گمشدگی کا علم ہوا تو آپ نے غصے میں بندوق نکال لی۔ اور کچھ گھنٹوں بعد جب آپ آدھی رات کو اسے میرے ساتھ واپس آتا دیکھتے تو بنا مجھے اور نازنین کو سنے اُسے بھون ڈالتے۔۔اور آج کی اس صبح میں ہم سب اس کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے سے سچ جھوٹ جاننے کے بجائے خدانخواستہ نازنین کا جنازہ تیار کررہے ہوتے، لیکن رباب کی بروقت کال کی وجہ سے میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ جس کی وجہ سے آج یہ زندہ سلامت ہمارے سامنے بیٹھی ہے۔۔اور اب سب کو سن لینے کے بعد کل پیش آئے واقعے کی اصل حقیقت بھی سب کو معلوم ہوگئی۔ اب ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کر بتائیں واسع اور ناز کی زبانی جو کچھ آپ کے علم میں آیا آپ کو کیا لگتا ہے یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں یا اس سب پر مزید کسی تحقیق کی کوئی ضرورت ہے۔''

نصیر نے ڈائریکٹ سیف اللہ سے سوال کیا تھا اور وہ حقیقتاً اپنا سامنہ لے کر رہ گیا تھا۔

احمد اور نگینہ کا آج اس موقع پر ذکر کرنا آپ کو غیر مناسب لگ رہا ہے لیکن میں نے یہ ذکر اس لیے چھیڑا کیونکہ وہ دونوں بھی گھر سے بھاگے نہیں تھے۔ اُن کا قصور کچھ اور تھا۔ جو انہوں نے کیا وہ بھی اپنی جگہ پہ غلط تھا لیکن گھر سے بھاگنے پر اُنہیں آپ کی

ان ہی گولیوں، بندوقوں نے مجبور کیا۔ آج اگر وہ گاؤں خاندان اور برادری کے لیے ایک بری مثال ایک دھبہ ہیں تو صرف اس لیے کہ جان کا خوف ان کے قدم پلٹنے میں مانع آ گیا تھا۔

''تمہیں وہ کہاں ملے؟'' اکا جان کے تیور بدلنے لگے، انہیں ابھی بھی یہ موضوع قطعی پسند نہیں آ رہا تھا۔

نصیر نے واسع کو ابرو کا اشارہ کیا۔ واسع سمجھ گیا کہ نصیر آج یہاں ایک نہیں ایک ساتھ کئی محاذوں پر لڑنے کی نیت سے اُترا ہے۔ اور یہ تحریک اسے ملی بھی تو واسع کی طرف سے تھی، وہ تو تقدیر نے درمیان میں ایک ایسا قیامت کا دن لا کھڑا کیا کہ واسع کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔

نصیر سنبھالنے کے لیے آگے نہ بڑھتا تو اس بار وہ ایسا گرتا کہ زندگی بھر اس چکنا چور وجود کو سمیٹنا مشکل ہو جاتا، تقدیر کی ستم ظریفی نے گزرے اٹھارہ بیس گھنٹوں کے دوران اس پر زندگی سے مکمل مایوسی جیسا غلبہ کیا تھا۔ گزرے چند دنوں میں یہ دوسری مرتبہ ہوا تھا کہ اس نے کامیابی کی ہر راہ خود پر بند ہوتی محسوس کی تھی۔ لیکن نصیر کے ساتھ اور اس کی ہمت نے پہلی بار ابھی کچھ دیر پہلے اسے سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ ہاں شاید اس بار بھی روشنی کی ایک لکیر سی کہیں کسی راستے کے ہونے کی امید دلا رہی ہے۔

''جی اکا جان! نصیر صحیح کہہ رہا ہے۔ ہم نے بنا اُن دونوں کو سنے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جو قسمیں اٹھائی تھیں، ان پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ میں نے نگینہ اور احمد کو سنا ہے، بالکل سامنے بیٹھ کر۔ اور وہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے کیونکہ واپسی کی اب نہ انہیں کوئی امید تھی نہ امکان۔ اپنا سچ بتانے پر انہیں کسی غرض نے نہیں بلکہ ایک ''اپنے'' کے اچانک مل جانے نے مجبور کیا تھا۔ اور ساری بات سن کر آپ کو بھی ضرور یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ معاملات کو دیکھنے اور ان کو لاگو کرنے کے اصولوں میں اب تک کے وقت میں کس قدر سختی برتی جاتی رہی ہے۔ اور اس میں کہاں کتنی نرمی کی گنجائش ہوتی ہے۔''

واسع نے رک کر گلا کھنکھار کر سلطانہ چاچی کے کوئٹہ لے جانے کا اپنا سارا احوال کہہ سنایا وہ احوال جو نہ صرف نگینہ احمد کے سچ سے پردہ چاک کرنے کا باعث بنا تھا بلکہ واسع کی ڈوبتی نیا کو پار لگانے میں بھی معاون ثابت ہوا تھا۔

''سنا ضرور تھا اکا جان کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے لیکن میں نے اسے ہوتے دیکھا ہے۔ ایک مختصر ترین سفر جو میری زندگی بدل دینے جیسا مددگار ثابت ہوا۔ جہاں تک بات ہے نگینہ اور احمد کے سچ کی۔ وہ صرف اپنے کیے پر نادم ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہم سے کچھ نہیں چاہتے۔ انسان کو اپنی کچھ غلطیوں کی سزا اسی دنیا میں بھی بھگتنا پڑ جاتی ہے۔ وہ دونوں بھی یہی سوچ کر اس داغدار زندگی کو جیے جا رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں کے ساتھ جو ہوا اس کی روشنی میں نصیر اور میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے، میں جرگوں کی مخالفت نہیں کرتا، اور کر ہی نہیں سکتا کیونکہ میں نے اپنا حق بنا کسی دباؤ کے اپنی مرضی اور خوشی سے جرگے کی راہ سے حاصل کیا ہے۔

ضرورت صرف وقت کے بدلتے تقاضوں اور دین و شریعت سے اسے ہم آہنگ کرنے کی ہے۔ جس کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر پوری ایمان داری سے سچ بولے جاتے ہیں، اسی قرآن پاک کے اندر ہمارے ہر سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ کیا ہمارا دین مذہب ہمیں یہ نہیں کہتا کہ جب تک ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں، کانوں سے سن نہ لیں، معاملے کو پرکھنے کا مکمل حق نہیں رکھتے۔ سچ کچھ بھی ہو سکتا ہے جسے ہم اپنی نادانی میں کچھ اور سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہی نہیں ہم تو رشتوں کو بھی جذبات نہیں اصولوں کی کسوٹی پر ناپتے آئے ہیں۔

انسان کے لیے اپنے خاندان اپنے رشتوں سے جڑنا ہمیشہ ہی راحت و سکون کا باعث ہوتا ہے نسل در نسل رشتے زیادہ مضبوط زیادہ قریب آتے ہیں۔ لیکن ہم نے اسے بھی اپنے لیے زحمت بنا دیا ہے۔ صدیاں بیت گئیں، رشتوں کو ہم اپنی مرضی اور مفاد کے کھونٹوں سے جانوروں کی طرح باندھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر یہ سوچ کر نبھائے بھی جا رہے ہیں کہ یہی روایات بنالی گئی

تھیں۔ تو آگے بھی ان ہی نے چلنا ہے۔ چاہے اس روایت کا شکار ہو کر کوئی خیر بانو پاگل ہو جائے، کوئی لیلیٰ زندگی بھر کنواری بیٹھی رہے، کوئی میمونہ اپنے محبت کرنے والے شوہر سے جدا کر دی جائے، کوئی پشمینہ بلاوجہ بدلئی کی سزا پاتے اپنی محبت سے دست بردار ہو جائے یا کوئی نگینہ بھاگ جائے۔

جبکہ دین و مذہب میں اس طرح رشتے کرنے کا کوئی پیمانہ درج نہیں ہے۔ پھر آپ ہی بتائیں ہم کیوں صدیوں سے اپنے پیاروں کو لولے لنگڑے رشتوں میں باندھتے ذہنی مریض اور جسمانی لاچار بنا رہے ہیں۔''

''اکا جان! صدیوں پہلے ہمارے باپ دادا نے جو اصول بنائے تھے تب وہ بھی اسی گدی پر بیٹھے تھے۔ جس پر آج آپ بیٹھے ہیں۔'' نصیر نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''تب انہوں نے بھی اپنی عقل سمجھ اور اپنے ماحول کے مطابق روایات ترتیب دیں۔ لیکن آج جہاں آپ بیٹھے ہیں۔ وقت، قدریں، ماحول روایات کچھ اور ہو چکی ہیں۔ اللہ پاک آپ کا سایہ تادیر سلامت رکھے، اس ہاتھ آئے وقت سے ہماری تقدیر میں کچھ اچھا لکھ جائیں، تاکہ فیصلے بندوق کی نال سے نہیں۔ قلم کی نوک سے لکھے جائیں۔''

''سیف لالہ! آپ خود بھی پڑھے لکھے ہیں ماشاء اللہ۔ اور ہمارے خاندان کی نئی پود میں سب سے بڑے ہیں، آنے والے وقت میں یہی جگہ آپ نے سنبھالنی ہے، ہماری ہاتھ جوڑ کر آپ سے عرض ہے اُس آنے والے وقت کو ایسا ہونا چاہیے جو تاریک رات کے گزر جانے پر روشن دن جیسا ہوتا ہے۔''

میں نے اور واسع نے سوچا تھا اکا جان کہ ہم ان روایات کو کبھی تبدیل نہیں کر سکتے اس لیے ہم چپکے سے اپنی حکمت عملی سے ان میں دھیرے دھیرے تبدیلیاں لانے کی کوشش کریں گے لیکن قدرت شاید یہ نہیں چاہتی تھی، تبھی واسع اور نازنین کے ساتھ وہ ہوا جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ قدرت ضرور کوئی بڑی تبدیلی چاہتی ہے اکا جان۔ اور اسے لکھ ڈالنے کے لیے قلم اللہ پاک نے آپ کے ہاتھ میں دیا ہے۔

خدارا نسلوں کو اس طرح تباہ مت ہونے دیں کہ آنے والے وقت میں انسان اولاد کو دنیا میں لانے سے بھی خوف زدہ ہو کہ نجانے ہماری اولاد یہاں کی کس صدیوں پرانی روایت کی بھینٹ چڑھ جائے۔

نصیر باقاعدہ ہاتھ جوڑے عبدالرحمٰن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور وہ بڑی دیر تک واسع اور نصیر کو سنتے رہنے کے بعد اب سیف کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''واسع اور نازنین کے سچ نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے نصیر! اور یہ حقیقت ہے کہ بعض دفعہ ہم واقعی وہی دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو ہمیں دکھایا جاتا ہے۔ اور یہ ایک بات ہمیشہ میرے لیے دلی درد کا باعث ہوتی ہے، جب کوئی کسی بے قصور اور معصوم پر بے جا تہمت لگائے۔ میں نہ واسع سے کبھی بدگمان ہونا چاہتا تھا نہ ہی گھر آئی اس سیدھی سادی نیک بچی کے متعلق کچھ ایسا ویسا سننا چاہتا تھا۔ لیکن جو کچھ مجھے دکھایا گیا، اب وہ گاؤں والوں کی نظر کا دھوکا تھا یا ذکی کی کوئی سازش لیکن میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ زندگی میں دو موقعوں پر مجھے بحیثیت خود اپنے گھر کا ایسا فیصلہ درپیش آیا جس نے میری گردن جھکا دی۔ اور آج میں سب سے زیادہ حیران بھی اس بات پر ہوں کہ یہ اللہ پاک نے مجھے کیا دکھایا۔ کیونکہ ان دونوں مرتبہ ہی حقیقت کچھ اور نکلی۔ مجھے نہیں پتا سیف اللہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے لیکن میں یہ سوچ کر لرز رہا ہوں کہ آج اگر سیف کے ہاتھوں نازنین قتل ہو گئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ اور اس سے بھی زیادہ لرزا دینے والی سوچ یہ ہے کہ اگر نگینہ اور احمد کی ملاقات بجائے تمہارے مجیب، اسفند، رئیس یا داؤد کے گھر کے کسی فرد سے ہوئی ہوتی تو نتیجہ ان دونوں کی موت تھا۔ جس کا فرمان بھرے جرگے میں میری رضامندی سے جاری ہوا۔

عبدالرحمٰن اپنے سرخ و سفید ہاتھوں کی ہتھیلی سامنے کھولے اس وقت انہیں کم خود اپنے آپ کو زیادہ سنا رہے تھے۔ نصیر اور واسع نے سیف اللہ کی طرف دیکھا تو اس کا سر بھی جھکا ہوا تھا۔ رباب اور نازنین ابھی تک کمرے کے کونے میں کرسیوں پر

بیٹھی یہ ساری گفتگو سن رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے نصیر!'' اکا جان نے سر اُٹھایا۔ ''واسع اور نازنین کے دامن پر لگے اس داغ کو مٹانے میں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ واسع کی عزت اس کا وقار اور ہماری گھر آئی مہمان پر لگی بے جا تہمت اب تب ہی مٹائی جاسکتی ہے جب فیصلہ کھلے جرگے میں ہو۔ اور جہاں تک بات ہے بدلئی کی رسم ختم کرنے کی۔''

انہوں نے رک کر کچھ دیر سوچا، اور ان کا اس طرح رک کر سوچنا بیک وقت نصیر اور رباب کی دھڑکنیں روکنے کا باعث بنا تھا۔

''ہمارے جرگے کے سب ہی ممبران اسی خاندان سے جڑے ہیں۔ سب ہی اولاد رکھتے ہیں اور سب ہی نے اب تک ہوئی ان سب زیادتیوں کو نہ صرف قریب سے دیکھا ہے بلکہ بہت سوں نے جھیلا بھی ہے۔ اس رسم کے ختم کردینے کے لیے چند ایک نام لے دینا ہی کافی رہے گا۔ میں یہ بات بہت قریب سے جانتا اور سمجھتا ہوں کہ یہاں اس حوالے سے ہر دل میں درد کے سوا کچھ نہیں۔ اس رسم نے تکلیف تو بہت دی ہے، خوشی ایک بھی نہیں دی۔ ہاں لیکن اس کے باوجود ہم روایت پرستی کا شکار ہوئے اور یہی سوچ کر آگے بھی اس کو چلائے جارہے ہیں کہ شاید ہم کچھ نہیں کرسکتے، یہ قبیلے کی روایات ہیں اور انہیں قیامت تک نبھانا ہی ہے۔ مجھے یقین ہے میرے باقی مشران سے بس ایک بار ہی اس معاملے کو اٹھانے اور اس پر سوچنے کی نوبت آئے گی اور سب اس تبدیلی میں میرا ساتھ دینے کو تیار ہوجائیں گے، اور تم دونوں کا بہت شکریہ واسع، نصیر! تلوار تباہی لاتی ہے، اور سوچ تبدیلی۔ مجھے خوشی ہے تعلیم ہماری نسلوں کو شعور دے رہی ہے۔''

''اور اس کے لیے ہم آپ بڑوں کے ممنون ہیں۔ اگر کوئی پرانی روایت ہمارے پڑھنے میں بھی رکاوٹ ڈال دیتی تو آج ہم یہ قدم اٹھانے کے قابل نہ ہوتے۔'' واسع نے پہلی مرتبہ مسکرا کر اکا جان کو دیکھا۔ جواباً وہ بھی نرمی سے مسکرا دیے۔

''میں آج ہی جرگے کا اعلان کردیتا ہوں۔ کل صبح گاؤں کے جرگے میں تم اور نازنین قسم کھا کر اپنے سچ کی گواہی دوگے۔ خود کو ہر طرح کے سوال کے لیے تیار رکھنا۔''

''ہمارا سچ بس یہی ہے اکا جان! آپ بے فکر رہیں۔ ہم ہر سوال کے لیے تیار ہیں۔''

واسع نے بھرپور اعتماد سے سر ہلاتے ایک سرسری نظر نازنین پر ڈالی کیونکہ ''ہم'' سے مراد وہی دو تھے۔ اور وہ بھی سر جھکائے بغور ان سب کو سنتی یقیناً اگلے دن کے جرگے کے لیے تیار تھی۔

''اور پریشان نہ ہو نصیر! یہ کل کا اہم ترین فیصلہ اچھی طرح نمٹ جانے دو۔ پھر آہستہ آہستہ باقی سب باتیں بھی دیکھ لیں گے۔''

''جی اکا جان۔ میرے نزدیک بھی فی الحال سب سے اہم نازنین اور واسع کا معاملہ ہے۔''

''سیف! تم کل کے جرگے کے بارے میں سب کو اطلاع دو۔ اور وہ تمام لوگ موجود ہونے چاہئیں جو درے کی طرف گئے تھے۔ اور ہاں۔ ذکی کو بھی بلانا۔'' وہ حکمیہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور تعظیماً باقی سب بھی اٹھ گئے۔

☆☆☆

نغمہ نے کوئی تیسری مرتبہ کمرے کے دروازے کے قریب آکر دستک دینے کی کوشش کی لیکن ہمت نہ پڑنے پر پھر وہیں رُک گئی۔ صبح بڑی دیر تک بیٹھک میں ایک طویل نشست کے بعد وہ سب باہر آئے تو چاچا جی ڈیرے پر چلے گئے۔ رباب اور واسع درمیان کے راستے اپنے گھر اور نصیر نے نازنین کو اس کے اور اباں کے پاس لاکر مختصراً اندر ہوئی ملاقات کا احوال بمع تسلی اور اگلے دن کے جرگے بتا کر اپنے گھر کی راہ لی تھی۔

کچھ دیر بعد سیف بیٹھک سے باہر نکلا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند کرکے وہ تب سے کمرے میں ہی بیٹھا تھا۔ نجانے نغمہ کو وہ باقیوں جیسا پرسکون اور مطمئن کیوں نہیں لگا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اندر ہوئی کسی بات سے ضرور اسے اختلاف ہوا ہے۔ وہ بار بار اس کے پاس جانے کی کوشش کرتی لیکن اس کے غصے سے گھبرا کر رُک جاتی۔ لیکن اب اتنی دیر ہوجانے پر

گھبراہٹ بھی ہونے لگی تو دروازہ بجا ہی دیا، کچھ دیر بعد سیف نے چٹخنی گرادی، اور واپس جا کر پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے سیف! سب خیریت تو ہے نا؟'' نغمہ کا دل تو ابھی تک نازنین کے معاملات میں الجھا تھا۔

''سیف!'' جواب نہ ملنے پر اس نے ہلکا سا شانے پہ ہاتھ رکھا۔ سیف کی آنکھیں بھی سرخ سرخ سی لگیں۔ لیکن بجائے غصے کے چہرا اداس رویا رویا سا معلوم ہوا۔ اور اس بات سے نغمہ کا اور زیادہ دل بیٹھنے لگا۔

''بتاؤ نا سیف! کیا بات ہے، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

''سب میرا قصور ہے، سب میری غلطی ہے، میں ہوں اس کے بھاگنے کا ذمہ دار۔''

''کس کے بھاگنے کا؟'' فوری طور پر نغمہ کے ذہن میں پشمینہ اور نازنین کے واقعے گھوم گئے۔ دل نئے سرے سے ڈر گیا۔

''کیا کہہ رہے ہو سیف! وہ دونوں ہی گھر پر ہیں۔ ابھی تو.....''

''وہ بھی یہیں آس پاس ہی تھی، گھر واپس آرہی تھی۔'' سیف نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہتے سامنے دیوار پر ایک منظر تازہ ہوتے محسوس کیا۔ ''میں نے پستول اُٹھانے کا مشورہ دے کر اسے وہاں سے، ہم سب سے بہت دور کر دیا۔''

''کون؟'' نغمہ کو اس کی دماغی حالت پہ شبہ سا ہونے لگا، بمشکل دھیمی آواز میں پوچھا اور سیف یہ تک بھول گیا کہ وہ کہاں ہے اور پوچھنے والی کون ہے۔

''نگینہ۔'' وہ زیرلب کہتے ابھی بھی خالی خالی نظروں سے دیوار کو تک رہا تھا۔

''نگینہ۔'' وہ حیرت سے تھوڑی پیچھے ہوئی۔

تو وہ اتنی دیر سے اس کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے لیے رویا تھا۔ اس کی باتوں کا سر پیر سمجھنا اگرچہ ابھی بھی مشکل تھا لیکن نغمہ کا دل درد کی آگ سے آج برسوں بعد ویسے سلگنے لگا جیسے شروع شروع کے دنوں میں رات دن اس بے وفا کے قصے سنتے سلگا کرتا تھا۔ سیف اسے باوجود اس کی دھوکا دہی کے کسی شہزادی یا پری کی کہانی جیسا سناتا رہتا۔ وہ اپنے اندر کی جلن کو اس کی باتیں کر کے کم کرنے کی کوشش کرتا اور نغمہ اس آگ میں روز نئے سرے سے راکھ ہوتی۔ اور پھر برداشت کی حد ختم ہونے پر شیرنی کی طرح بپھر جاتی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ سیف نہ صرف اس موضوع پر چپ ہوتا گیا بلکہ ہر معاملے میں ریزرو اور کم گو ہوتے بالکل ہی اس سے لاتعلق ہو گیا۔

نغمہ نے اُبھر کر آتی اپنی سلگتی سوچوں کو دھکیل کر خود ہی پرے دھکا دیا۔ ماضی میں جو غلطیاں وہ کر چکی تھی اب انہیں کبھی دوہرانے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

''پوری بات آرام سے بتاؤ سیف! اتنی پرانی بات پر آج کیوں اپ سیٹ ہو گئے۔''

اس روز مجیب چاچا اور رئیس مسجد میں احمد کو دیکھتے پھر رہے تھے۔ میں ان کی گھبراہٹ دیکھ کر پیچھے پیچھے چلا آیا۔ لامحالہ انہیں بتانا پڑا کہ نگینہ رات سے گھر میں نہیں ہے۔ اور اس لیے وہ احمد کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ احمد کے گھر بنا اسلحے کے نہ جائیں۔ کہ شاید وہ کوئی بہانہ گھڑ دیں۔ کاش میں ایسا نہ کہتا۔ میں ہی اس کی رسوائی کا سبب بن گیا۔ قسمیں بھی جرگے میں، میں نے اُٹھوائیں۔

''کس نے بتایا یہ سب؟'' نغمہ نے خاموش رہ کر اسے بولنے دیا اور پوری بات سن کر بھی لہجہ معمول سے بالکل دھیما رکھا۔

''واسع کو ملے تھے دونوں کوئٹہ میں۔'' اس نے ذرا سی گردن گھما کر پہلی مرتبہ نغمہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''سنو گی ان کے ساتھ اصل میں کیا ہوا تھا؟ وہ اس وقت بڑی تکلیف سے مسکرایا۔

نغمہ نے سر اثبات میں ہلایا اور سیف نے کچھ دیر پہلے سنی سب باتیں دوہرا دیں۔

''اوہ۔'' نغمہ بھی شاک میں بیٹھی رہ گئی۔ ''تم بھی تو آؤ دیکھتے نہ تاؤ فوراً بندوق تان لیتے ہو، اسی لیے تو ہر وقت اسے خالی رکھتی ہوں۔'' وہ اسے شکوہ بھری

نظروں سے دیکھنے لگی اور سیف حیران ہوا۔
''تم بھی پچھتا رہی ہو۔ کیوں؟''
''ہاں نا۔'' نغمہ نے ہاتھوں کو گود میں گرایا۔ چہرے پر آزردگی چھائی تھی۔ ''وہ تمہاری محبت تھی سیف! تمہیں مل جاتی تو تمہاری لائف سکھی ہو جاتی، ہم نے تو آدھی ادھوری زندگی جی ہے۔ وہ ہوتی تو تم خود کو مکمل تصور کرتے۔'' نغمہ کا لہجہ حقیقی رنج میں گھلا تھا۔
سیف اسے بے یقینی سے دیکھتے ایک دم ہنس پڑا۔
''جانتی ہو، مجھے رونا کیوں آیا؟''
''ظاہر ہے اپنی غلطی کی وجہ سے، اور اسے کھو دینے پر۔'' نغمہ نے صاف گوئی سے کہا تو سیف نے سر نفی میں ہلایا۔
''میں سات برس لگاتار یہ سوچتا رہا کہ وہ دھوکے باز تھی۔ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئی، لیکن آج پہلی بار یہ سوچ کر درد ہو رہا ہے کہ اگر وہ نہ بھاگتی تو دھوکے کی زندگی تو میں اب جی رہا ہوتا۔ سات برسوں سے وہ میری بیوی ہوتی اور صرف اس لیے کہ احمد نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ وہ اس کا کہا مان کر میری طرف پلٹ رہی تھی۔ تو اگر یہی سچ ہے تو میں شادی کر کے بھی کیا پالیتا۔ زندگی بھر یہ تک جان نہ پاتا کہ جیت تو پھر بھی احمد کی ہوئی۔''
''خود کو ہلکان مت کرو۔ ذرا اُن کے بارے میں سوچو سیف! برسوں سے کیسی سزا بھگت رہے ہیں۔''
''غلطی تو انہوں نے بھی معمولی نہیں کی تھی۔''
''ہاں لیکن بے چارے چاچا چاچی کا کیا قصور، اور احمد کے ماں بابا۔ بات صرف دو لوگوں کی تو نہیں ہے۔ پورے دو خاندان ہل کر رہ گئے۔ کاش کہ یہ سب کچھ بڑوں کی رضامندی سے ہو جاتا۔'' نغمہ نے ایک آہ بھر کے خود کلامی کی۔
''کیونکہ ملنا تو انہوں نے تھا ہی۔ نصیب جو وہیں جڑا تھا نگینہ کا۔'' وہ تاسف سے کہہ کر اُٹھ گئی اور سیف حیرانی سے اس کی پشت کو دیکھنے لگا۔
☆☆☆
وقت کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ہر دن کی اپنی شکل اپنا مزاج ہوتا ہے، کبھی ایک کے موافق تو کبھی دوسرے کے۔ محض دو ہی دنوں میں حالات نے واسع اور نازنین کے حق میں رُخ بدلا، واسع اگر نصیر کا دل سے شکر گزار تھا تو نصیر اس بدلاؤ کو اُن دونوں کی نیک نیتی سے منسوب کر رہا تھا۔
اُن دونوں کی قرآن پاک پہ ہاتھ رکھ کر کھائی گئی قسموں نے سچ پورے گاؤں پر ظاہر کر دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنا تو دور وہاں ایک دوسرے کی موجودگی کی وجہ تک سے ناواقف تھے۔
پھر مشران کی طرف سے درے پر آپہنچنے والے ہر مرد سے آنکھوں دیکھے منظر کے متعلق پوچھا گیا۔ اور سب نے گواہی دی کہ نازنین مکمل برقع میں واسع سے چند قدم دور کھڑی تھی۔ کسی ایک شخص کی گواہی بھی کسی متنازعہ واقعے کو ظاہر نہ کر سکی۔
البتہ عبدالقادر کی عدم موجودگی نے بہت سے سوالات کھڑے کر دیے۔ اس پورے معاملے میں سب سے مستعد فرد آج جرگے میں غیر حاضر تھا۔ حتیٰ کہ ذکی نے بھی یہ کہہ کر جرگے میں آنے سے صاف انکار کر دیا کہ وہ چونکہ اس واقعے سے لاعلم ہے اس لیے اس کی موجودگی ضروری نہیں۔ باقی افراد نے یہ انکشاف بھی کیا کہ انہیں درے والے راستے سے آنے پر عبدالقادر نے اکسایا تھا اور وہاں پہنچ کر اشتعال بھی اسی نے پیدا کیا تھا۔ گاؤں والوں کے لیے عبدالقادر اور ذکی کی غیر موجودگی، نازنین کو ملنے والے خفیہ خط، واسع کو آنے والی مشکوک کال اور کلام پاک کی گواہیوں نے ہی ساری پول کھول دی۔
عبدالرحمٰن نے اُن دونوں پر بے جا الزام تراشی پر اعلانیہ برہمی کا اظہار کیا۔ باعزت انہیں اپنے گھروں کی طرف جانے کی اجازت دی۔ گاؤں والوں نے اپنی بے جا بدگمانی اور برے رویے پر واسع، نازنین اور جرگے کے مشران سے معافی مانگی۔
عبدالجبار نے جرگے کے ممبر کی حیثیت سے شرکت کی تھی لیکن وہاں جو کچھ پیش آیا، انہیں ذکی کی وجہ سے سخت خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ انتہائے جلے

بھنے گھر واپس آئے

''یہی تھا تمہارا انتقام۔'' انہوں نے سخت طیش میں چارپائی کو ٹھوکر ماری۔ ''واسع کو بدنام کرنے چلے تھے۔ تاکہ وہ گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہے۔ اور ہوا کیا؟ چوہے کی طرح خود ہی بل میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اب بھی آتے نا، سامنا کرتے اپنے پھیلائے اس تمام بکھیڑے کا۔ لیکن تم کیوں جاتے بھئی۔ باپ ہے نا۔''

وہ غصے سے واسکٹ، کہیں صافہ، کہیں ٹوپی پھینکتے کمرے میں آگئے۔ اور برآمدے میں خاموشی سے کھڑے ذکی نے چپ کر کے باپ کو سنا اور پیچھے پیچھے اندر آگیا۔

''کہاں مرگیا تھا تمہارا عبدالقادر؟'' وہ بپھرے ہوئے واپس پلٹے۔

''اسے میں نے ہی منع کیا تھا جانے سے۔ وہ جھوٹی گواہی کے لیے تیار نہیں تھا تو کیا سچ بتانے بھیج دیتا۔'' ذکی بھی ڈھٹائی سے جرح پر اتر آیا۔

''ہاں، اور اس طرح تو بڑی عزت افزائی ہوئی اس کی، سب ہنس رہے تھے۔ مذاق بنا رہے تھے۔ ارے کیا باقی رہ گیا۔ تمہاری بدولت رہی سہی عزت سے بھی گئے سمجھو۔''

''کیا ہوگیا؟'' نگار بوکھلائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''وہ واسع تو صرف باغ لے گیا تھا نا۔ وہ بھی اپنے ہی خاندان کے دو چار لوگوں میں۔ اتنا نقصان اس نے بھی میرا نہیں کیا۔ گاؤں والوں کو باوجود ہار جانے کے فخر سے کہہ بیٹھتا تھا کہ یتیم کو اس کا حق لوٹا دیا اپنی مرضی سے۔ پر آج تو تم نے وہ عزت بھی خاک میں ملادی۔''

''اب یہ کہاں پتا تھا کہ اتنی سی بات کو یہ لوگ جرگوں تک لے جائیں گے۔'' ذکی نے منہ پھلایا۔

''ہاں، تمہیں تو بس اتنا پتا تھا کہ تم واسع اور اس لڑکی سے اپنی ہتک کا بدلہ لینے کے لیے پوری طرح تیار ہو۔ سوچا سمجھا کچھ بھی نہیں۔''

''بگڑا تو ابھی بھی کچھ نہیں۔ اگر آپ مجھے ایک موقع اور دیں۔''

''تمہیں موقع دوں؟'' وہ غصے سے تلملائے ''اب کیا جان لوگے ہماری۔''

''جان تو جائے گی لیکن آپ کی نہیں۔'' وہ اسی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔ ''بس ایک موقع۔''

''یہ لو، اب یہی کسر رہ گئی تھی۔ یعنی اب تمہاری بدولت جیل کا منہ بھی دیکھنا پڑے گا۔''

''کوئی جیل ویل نہیں تو بہ۔ تحمل سے بات سن لیں۔'' وہ باپ کا لاڈلا اور منہ چڑھا تھا۔ ان کے غصے کے رعب میں آنا سیکھا ہی نہیں۔ اُلٹا انہیں رام کرنے کے ہر گر سے آگاہ تھا۔ جبار نے بھی اس بار جاننے کے انداز میں سوالیہ رُک کر اسے دیکھا۔

''صرف دو دن۔ اور یہی جرگہ مرے ہوئے واسع کو گالیاں نہ دے رہا ہو تو کہنا آپ۔''

''تم اگر نیند یا نشے میں نہیں ہو بیٹا تو پھر پکا صدمے میں ہو۔ آج کے جرگے نے تمہارے رہے سہے اوسان بھی خطا کردیے ہیں۔'' وہ ذکی کی بہکی بہکی باتوں پر افسوس کرتے وہاں سے جانے لگے۔

''ابھی یہ واقعہ نیا ہے اس لیے چار پانچ دن تو لازمی بچے بچے کی زبان پر رہے گا کہ کیسے واسع اور نازنین قسم کھا کر بے قصور و بے خطا ثابت ہوگئے۔ لیکن سوچیں ذرا۔ اگر ان ہی دو چار دنوں کے اندر واسع پر کوئی مصیبت آجائے وہ بھی قدرتی آفت اور حادثے جیسی۔ تو کیا خیال ہے یہی تعریف میں مگن لوگ اس کی قسم کے متعلق شک میں نہیں پڑ جائیں گے۔ گاؤں والوں کو تو ویسے بھی جھوٹی قسموں کا انجام نہیں بھولتا۔''

ذکی نے بڑے رسان سے اپنا آئیڈیا تفصیل کے ساتھ باپ کے گوش گزار کیا۔ آنکھوں میں شرارتی سی چمک اور لبوں پر مزا لینے جیسی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جبار خان کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''مطلب..... تم کہنا چاہتے ہو کہ واسع پر ناگہانی آفت کچھ یوں آئے گی کہ اسے جھوٹی قسم کا عذاب۔'' جبار حیرت سے انگلی منہ پہ رکھے زیرلب

اس کا آئیڈیا دوہراتے جیسے خود بھی کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ "اور اس طرح تو میری آج کی سبکی کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے وہ باغ کا زخم کیا کم تھا، اس خبیث کو تو میں باغ کا ایک دانہ بھی نصیب ہونے نہیں دینا چاہتا۔

جبار کی زبان نفرت کے شعلے اُگل رہی تھی تو آنکھوں میں کسی نئے نئے درد کی چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ نفس بھی تیز ہونے لگا۔ ذکی نے نچلا لب دبا کر باپ کی بدلتی کیفیت کو خاموشی سے دیکھا اور دل میں ایک سوچ آئی۔ ایک واسع ہی کیوں۔ وہ عزت دار بھی تو ہے نا۔ ایک بار اس واسع کا کانٹا نکل جائے نازنین بیگم۔ تمہیں اپنی عزت بنانا تو خیر اب ذکی کو ہی منظور نہیں۔ یہ بھی کسی ایک رات چپکے سے اُٹھوا کر اپنی توہین کا بدلہ لینے کا خواب تو ذکی ضرور پورا کرے گا۔

"اور وہ ناگہانی آفت کیا ہو گی ذکی؟" جبار اب از حد سنجیدگی سے یوں سوال کر رہے تھے جیسے دروازے پر آئے کسی مہمان کا پوچھ رہے ہوں۔

"وہ بھی بتا دوں گا۔ بس چند گھنٹے دے دیں مجھے۔"

"لیکن اس بار غلطی کی گنجائش نہیں ہے ذکی۔"

میں نے جن چبھتی ہوئی نگاہوں میں آج طنز اور غصہ دیکھا ہے، مجھے ان سب آنکھوں میں اپنے لیے پشیمانی اور شرمندگی دیکھنی ہے۔ جبار کے ذہن میں جرگہ کیا روشن ہوا، موت زندگی کا سودا صرف ایک کھیل محسوس ہوا۔ چاہے اس کھیل میں کسی اپنے کی جان ہی کیوں نہ داؤ پر لگ جائے۔

☆☆☆

"بہت ناراض ہو نازنین؟" رباب نے ایک نظر پشمینہ کو دیکھتے دھیرے سے ہاتھ نازنین کے شانے پر رکھا جس نے جبراً ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے رباب کو دیکھ کر سر نفی میں ہلایا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں نازنین! یہاں آنے کی ہمت بھی کتنی مشکل سے پیدا کی، مجھے لگ رہا تھا اب میں کبھی تمہارا سامنا نہیں کر پاؤں گی۔" رباب نظریں جھکائے بمشکل الفاظ کا چناؤ کر پا رہی تھی۔

"لیکن مجھے ایک بار تو ضرور تم سے معافی مانگنی تھی۔ اگرچہ میرا جرم اس معافی کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ میں نے جو کیا وہ تو شاید زندگی بھر مجھے کچوکے لگاتا رہے گا۔ میرے لیے اس پشیمانی سے نکلنا ناممکن ہے اب۔ لیکن میرا درد ذرا سا کم کرنے کے لیے ایک بار کہہ دو ناز کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔" رباب کی آنکھیں اپنی بات کے دوران ہی بھیگ گئی تھیں۔

سر اٹھا کر نازنین کی طرف دیکھا تو آنسو چھلک پڑے۔ دونوں ہاتھ نازنین کے سامنے جوڑے وہ روتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ نازنین نے اس کے بندھے ہاتھ بے اختیار ہاتھ میں لے کر نیچے کیے۔

"میں ناراض نہیں ہوں رباب! تم بھی مجبور تھیں شاید۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ان سب باتوں کا ایسا بھیانک نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

"بھول جاؤ وہ سب کچھ۔" نازنین اپنی ازلی مروت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اُلٹا رباب کا ہاتھ تھپک کر اسے تسلی دینے لگی۔

"کچھ حادثات شاید نصیب سے جڑے ہوتے ہیں۔" پشمینہ نے ایک گہری آہ کھینچ کر ان دونوں کی باتوں میں حصہ لیا۔ "اب معلوم نہیں وہ ہماری سزا ہوتی ہے، آزمائش یا پھر کوئی سبق۔ لیکن وہ ہو کر رہتے ہیں۔ پشمینہ اور نازنین کا دکھ بھی کچھ کچھ ملتا ہوا سا تھا، ہاں لیکن پشمینہ کسی حد تک اپنے دل اور اس کی مجبوریوں پر الزام دھر سکتی تھی پر نازنین۔ وہ کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی کہ انتقام کی آگ کو ایندھن پہنچانے کے لیے ہر بار اُسی کی ذات کو کیوں چنا گیا۔

"تم کہیں جا رہی ہو نازنین؟" رباب نے کمرے میں قالین پر رکھے سوٹ کیس، ایک چھوٹے بیگ اور کچھ بکھرے سامان کو دیکھتے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔

"نازنین واپس کوئٹہ جا رہی ہے۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔" پشمینہ نے خفا خفا سی ایک نظر نازنین پر ڈالتے منہ پھیر لیا۔

"لیکن تمہارے بابا تو سنا ہے جھگڑا کر کے گئے

تھے۔ وہ اُس رات.....'' رباب کو پشمینہ سے ہی معلوم ہوا تھا۔ صاف گوئی سے کہتے کہتے وہ ایکدم رک گئی۔

''میں اپنی خالہ کے گھر جاؤں گی۔'' نازنین اپنی جگہ سے اُٹھ کر سوٹ کیس کے قریب جا بیٹھی اور بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب دینے لگی۔

''پہلے وہاں نہیں جاسکتی تھی، لیکن اب ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔''

''پلیز نازنین! رُک جاؤ۔'' رباب بھاگ کر اس کے پہلو میں آبیٹھی۔ ''اگر تم چلی گئیں تو سچ کہتی ہوں میرے ضمیر کی چوٹیں مجھے کبھی چین نہیں لینے دیں گی۔ یہیں رہ جاؤ نازنین! ہمیں اپنی غلطیوں کے ازالے کا کچھ وقت تو دو، میرے بھائی کو چھوڑ کر مت جاؤ، ہم تو تمہارے حوالے سے کیا کیا سوچے بیٹھے ہیں۔''

''اچھا۔ مثلاً کیا؟'' نغمہ اسی وقت رباب کی بات سنتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو رباب نئے سرے سے شرمندہ ہوگئی۔ وہ نغمہ بھابی سے بھی نظریں ملانے کے کہاں لائق تھی۔ ان کی بہن کے ساتھ برا کرنے میں اس نے کسر ہی کیا چھوڑی تھی۔

''بتاؤ رباب! کیا سوچے بیٹھی ہو؟'' نغمہ سنجیدہ صورت لیے ذرا دور صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بھابی! میں آپ سب سے اپنے کیے کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن خدا کے لیے واسع لالہ کو تو سزا مت دیں۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ وہ اب بھی نازنین کا ساتھ چاہتا ہے۔ پلیز بھابی! آپ ہی نازنین کو جانے سے روک سکتی ہیں۔'' وہ اب بری طرح بے چین نظر آنے لگی تھی، نازنین کے پاس سے اٹھ کر نغمہ کے پاس آگئی اور باقاعدہ معافی کے لیے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن نغمہ نے اس کی معافی کو نظر انداز کیا۔

''کوئٹہ تو نازنین اب جائے گی۔ اس بار میں بھی اسے نہیں روکوں گی۔'' نغمہ کا لہجہ کچھ اور سخت ہوا۔ پشمینہ نے مایوسی سے سر نیچے ڈالا اور نازنین نے خود کو کام میں مصروف کیا۔

''کوئی بھی مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں۔ اب میں لالہ کو کیا جواب دوں گی، وہ پہلے ہی مجھ سے سخت خفا ہے۔ رباب کا اور تو کوئی بس نہیں چلا۔'' ہاتھوں میں چہرا دیے بلک بلک کر رونے لگی۔

''ارے بھئی، نازنین کوئٹہ نہیں جائے گی تو رخصت ہو کر واپس کیسے آئے گی۔'' نغمہ کا ایک دم لہجہ بدلا تو رباب نے روتی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

''خالہ حبیبہ نے کہا ہے کہ نازنین کی رخصتی ان کے گھر سے ہوگی۔'' نغمہ کے لبوں پر اب شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔ رباب نے حیرت سے پشمینہ اور نازنین کو دیکھا تو وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔

''ہیں..... کیا؟'' رباب نے بے یقینی سے نغمہ بھابی کو دیکھا۔

''کس دنیا میں رہتی ہو ہاں۔'' نغمہ نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ ''دادی صبح سے ہمارے گھر دھرنا دیئے بیٹھی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ''ہاں'' نکلوا کر گئی ہیں۔ اسے اپنے واسع کے لیے سوائے نازنین کے کوئی اور نہیں چاہیے۔ اور اِسے دیکھو۔'' نغمہ نے اپنے تیز دھار ابرو نازنین کی طرف اُٹھائے۔

''کیسی میسنی بنی بیٹھی ہے تمہارے سامنے۔'' دادی نے پیار سے گلے لگایا تو ان کے کان میں کہتی ہے۔ ''مجھے بھی آپ کے ساتھ رہنا ہے۔''

''اور..... اور..... میرے سامنے سب ایکٹنگ کر رہے تھے۔'' اس نے خفا نظروں سے پشمینہ اور نازنین کو دیکھتے پھر سے رونا شروع کر دیا اور اس مرتبہ تینوں کا قہقہہ بلند ہوا۔ یہ رباب تو بالکل ہی پاگل تھی۔

''ائے رومت مڑے۔ مذاق کر رہے تھے۔'' پشمینہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

''تو تم ابھی جا رہی ہو کوئٹہ؟'' وہ آنکھیں صاف کرتے اب نئی پریشانی میں پڑ گئی۔

''نہیں بھئی۔ پہلے شادی کی کوئی تاریخ پکی ہوگی، پھر اس کو بھیجیں گے وہ بھی بس ہفتہ بھر پہلے۔''

''اور پاگل۔ یہاں دیکھو۔'' نازنین اتنی دیر سے اپنا سامان بیگ کے اندر نہیں، باہر نکال رہی ہے۔ پشمینہ نے ہنس کر توجہ دلائی۔ ''یہ بیگ تو اس

نے کچھ دن پہلے خفا ہو کر تیار کیے تھے، جب بابا کے ساتھ جانا تھا۔ آج تو ہم اس کے بیگز واپس کھلوا رہے ہیں۔''

''تو تم نے مجھے معاف کر دیا نازنین!'' رباب اپنی جگہ سے اٹھ کر ایکبار پھر نازنین کے پاس آ بیٹھی۔

''ہاں۔'' نازنین نے کام چھوڑ کر مسکراتے ہوئے رہاب کی طرف دیکھا۔ ''لیکن شرط یہ ہے کہ اب آئندہ بھی ہمارے بیچ یہ ٹاپک نہیں آئے گا۔''

''اب تو تم ہمیں اپنے بیاہ کی خوش خبری سناؤ۔'' نغمہ نے مسکرا کر رباب کو چھیڑا لیکن اس کا چہرا اپنی شادی کے ذکر پر ایک دم بجھ سا گیا۔

''یہ اب ناممکن ہے بھابی۔'' وہ دھیمے سے اتنا ہی کہہ پائی۔

''ارے۔ کیوں؟'' نغمہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''ابھی تو دادی بتا کر گئی ہیں کہ گلشن پھوپھو رباب کا رشتہ لے کر آنا چاہتی ہیں۔ یعنی کہ اب تو وہ بھی راضی ہیں۔''

''لیکن اب نصیر راضی نہیں ہے۔'' وہ سر جھکائے اپنا پلو مروڑ رہی تھی۔ ''اس نے اپنی اماں کو منع کر دیا ہے۔''

''ہائے اللہ، کیوں۔'' پشمینہ، نازنین اور نغمہ اب حیرت سے رباب کو تک رہی تھیں۔

''نصیر مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں۔''

''کیا اسی وجہ سے جو.....'' نغمہ نے تصدیق چاہی۔

''ہوں۔'' رباب کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگی تھیں لیکن وہ ان سب کے سامنے کم از کم نصیر کے حوالے سے اپنا درد ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ غیر محسوس انداز میں آنسو اندر اتارتے فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''واسع لالہ کو جا کر بتاتی ہوں تم لوگوں نے مجھے کتنا تنگ کیا۔'' وہ ان کا دھیان بٹانے کو زبردستی ہنس دی لیکن ان تینوں میں سے کوئی بھی اسکا ساتھ نہیں دے پایا۔

''اچھا نازنین! چلتی ہوں۔ اور تمہارا بہت بہت شکریہ، مجھے معاف کرنے کے لیے اور میرے بھائی کا رشتہ قبول کرنے کے لیے۔''

وہ مسکرا کر اس کا ہاتھ دباتی واپسی کے لیے پلٹی۔

''رباب!'' نازنین نے سنجیدگی سے پکارا تو وہ چونک کر مڑی۔

''ایک منٹ رکو رباب!'' نازنین اپنی جگہ سے اُٹھ کر نغمہ کے قریب آئی۔ ''باجی! کیا میں آپ کے موبائل سے نصیر بھائی سے کچھ بات کر سکتی ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو.....''

''نصیر۔'' نغمہ کچھ دیر کے لیے تعجب میں پڑ گئی، پھر جیسے نازنین کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔

''ہاں ہاں ضرور۔''

''نہیں نازنین وہ نہیں مانے گا۔'' رباب بھی سمجھ گئی نازنین کیا کرنا چاہتی ہے۔

''میرا موبائل لے آؤ پشمینہ! ادھر سنگھار میز پہ رکھا ہوگا۔'' نغمہ ایک دم مستعد ہو گئی۔ پشمینہ بھی فوراً باہر لپکی۔

''بیٹھو رباب۔'' نغمہ نے اسے زبردستی بازو سے پکڑ کر قریب بٹھالیا اتنے میں پشمینہ بھاگتی ہوئی واپس آ گئی۔ نغمہ نے نصیر کا نمبر ملا کر کچھ دیر سلام دعا کی اور پھر اسے بتایا کہ نازنین اس سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے اور موبائل فون نازنین کی طرف بڑھا دیا۔

''السلام علیکم۔'' نازنین نے قدرے نروس ہو کر آغاز لیا اور پھر خود ہی کمرے کی ایک سائیڈ پر چلی گئی۔

''وعلیکم السلام، کیسی ہیں؟'' نصیر نے خوش اخلاقی سے آغاز لیا جرگے کے بعد اس سے دوبارہ سامنا بھی نہیں ہو پایا تھا، ورنہ جاننا وہ بھی چاہتا تھا کہ نازنین اب کس سوچ میں ہے۔

''جی اللہ کا شکر ہے، میں ٹھیک ہوں۔''

''اب پریشانی تو نہیں کسی قسم کی؟'' نصیر نے ہی سوال کیا تو نازنین ہلکا سا مسکرا دی۔

''جی نہیں اب سب ٹھیک ہے، آپ کے ہوتے مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ آپ نے ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا ہے۔''

''بہن کہا ہے تمہیں، پریشان کیسے رہنے دے

سکتا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں، آپ نہ ہوتے تو میرے لیے سر اٹھا کر جینا شاید زندگی بھر ناممکن تھا۔''

''اب شکریے ادا کر کے پرایا مت کرو۔'' نصیر نے ہلکے پھلکے انداز میں جتایا تو وہ بھی ہنس دی۔

''کیا میں آپ کو لالہ کہہ سکتی ہوں؟''

''بھائی جتھی ہو تو بالکل کہہ سکتی ہو، اجازت ہے۔'' نصیر کو خوشی ہوئی سن کر۔

''کیا میں اپنے لالہ سے کچھ مانگ سکتی ہوں؟'' نازنین نے ایک نظر گھبرا کر پیچھے بھی دیکھا۔ وہ تینوں تو جیسے دم سادھے اسے سن رہی تھیں۔

''ہاں بالکل، کہو۔'' نصیر کچھ متعجب ہوا۔

''رباب کو معاف کر دیں لالہ!'' وہ بہت شرمندہ۔

''یہ مت کہنا نازنین!'' اس کے شرمندہ ہونے سے ان غلطیوں کا ازالہ نہیں ہو جاتا جو اس سے سرزد ہوئی ہیں۔ وہ ایک درد بھری سانس کھینچ کر رہ گیا۔ رباب کے نام پر اسے سوائے ایک افسوس کے اب اور کچھ محسوس نہ ہوتا۔

''ازالہ تو اس نے کر دیا ہے اپنی غلطیوں کا، آج اگر میں زندہ سلامت آپ سب کے بیچ موجود ہوں تو یہ احسان رباب نے کیا ہے۔ بلکہ ایک نہیں دو بار اس نے میری جان بچائی ہے۔''

''دو بار۔'' نصیر فوری طور پہ سمجھ نہیں سکا۔

''مجھے آپ نے پہاڑ سے گرنے سے بچایا تب بھی آپ کو رباب نے کال کر کے بتایا تھا اور دوسری مرتبہ جب آپ مجھے گھر واپس لا رہے تھے، تب بھی رباب نے کال کر کے آپ کو گھر آنے سے روکا تھا کیونکہ سیف لالہ بندوق لیے کھڑے تھے۔ اور آپ بھی جانتے ہیں کہ سیف لالہ مجھے یا آپ کو سننے کی زحمت بھی نہ کرتے اور.....''

''لیکن تمہاری جان کو خطرے میں بھی اسی نے ڈالا تھا۔ آخر تمہارے جان دینے کی نوبت ہی کیوں آئی، اس کی ذمہ دار بھی تو.....''

''جب میں نے اپنا دل صاف کر لیا ہے تو آپ بھی کر لیں۔''

''ٹھیک ہے، تم نے بہن ہونے کے ناطے پہلی بار کچھ مانگا، اس لیے تمہارے کہنے پر میں اسے معاف کرتا ہوں لیکن بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' نصیر بھی سمجھ گیا کہ اس کے کال کرنے کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ آج صبح ہی تو اس نے اماں کو منع کیا تھا۔

''معاف کرنے کے بعد سزا تو مت سنائیں لالہ! نفرتوں کی عمر طویل نہیں کیا کرتے، کیونکہ حادثے جیسے بھی ہوں، وقت ہر اثر کو کم کر دیتا ہے۔ آپ بھی آج کے فیصلوں کو بلاوجہ تاعمر نبھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جبکہ یہ سچ ہے کہ نفرت اور غصہ دھیرے دھیرے خود بخود کم ہونے لگتے ہیں۔ بعد میں پھر ان ہی جذباتی فیصلوں پر صرف پچھتاوا ہوتا ہے۔ آپ بہن کا کہنا مان کر راضی ہو جائیں، میں یقین دلاتی ہوں کہ اس کڑے وقت سے نکل کر جب اچھے وقت میں داخل ہوں گے تو یہ تکلیف دہ باتیں یاد بھی نہیں رہیں گی۔''

نصیر اس کی جامع تقریر کا کوئی جواب نہیں دے پایا۔

''وعدہ کریں لالہ! آپ کھلے دل سے معاف بھی کر دیں گے اور رشتہ بھیجنے سے منع بھی نہیں کریں گے۔''

''تم بہت اچھی ہو نازنین!'' نصیر ہلکا سا مسکرا دیا۔ ''اوکے، مان لی تمہاری بات۔''

''شکریہ نصیر لالہ!'' نازنین نے بات کے دوران ہی مسکرا کر ان سب کو دیکھا تو پشمینہ بھاگ کر اس کے نزدیک آئی اور موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''سلام نصیر لالہ! میں ہوں پشمینہ۔''

''وعلیکم السلام، تم کیسی ہو شیطان کی خالہ۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ اور کہنا یہ ہے کہ آپ صرف مٹھائی کھلائیں گے نہیں، اپنی اس نئی والی بہن سے مانگیں گے بھی سہی، کیونکہ آج ہم نے واسع لالہ کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔''

''اچھا۔ واقعی؟'' نصیر کی حیرت اور خوشی سے آواز بلند ہوگئی۔ ''مجھے نہیں پتا تھا۔''

''جی ابھی کچھ دیر پہلے دادی سے بات ہوئی ہے۔''

''ہوں۔'' پھر تو تم فون رکھو، میں ذرا واسع کی خبر لے لوں۔ وہ دلی خوشی سے ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں اس وقت اکا جان کے سامنے بیٹھے تھے اور اپنی آمد کا مدعا بھی ان پر ظاہر کر چکے تھے، جسے سن کر عبدالرحمٰن کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہوگئے۔

''پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا واسع!'' وہ اپنی انگلیاں اضطراری کیفیت میں چٹخ رہے تھے۔ ''یہاں جب ایک بار قسمیں کھالی جائیں تو واپس پھرنا۔'' انہوں نے سر نفی میں ہلایا۔ ''ناممکن۔''

''اکا جان! اُس روز آپ کے ہاں جب ہمارا سچ سننے کے لیے آپ نے ہمیں بلایا، تب نصیر نے ایک بات کی تھی۔ آج میں اسی کو آگے بڑھاتا ہوں۔ نصیر نے کہا تھا جس کلام پاک پہ ہاتھ رکھ کر ہم قسمیں کھاتے ہیں، اس کے اندر ہمارے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ کچھ بہت سیدھی اور بظاہر سامنے کی باتیں جنہیں ہم بلاوجہ نظر انداز کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اپنے اندر بڑا اثر رکھتی ہیں۔

میں نے یہاں آنے سے پہلے باوضو ہوکر قرآن پاک کھولا، قسم اور اس کے کفارے سے متعلق کئی آیات بمع ترجمہ پڑھیں۔ اور جب اللہ کا کلام ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب دیتا ہے تو دل سکون سے بھر جاتا ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں اکا جان کہ اگر آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ایک بار کھائی گئی قسموں سے واپس پلٹا جائے تو اس کی وجہ ہمارے بڑوں کے مزاج کی سختی تھی۔ شریعت کی بندش یا ممانعت نہیں۔ تبدیلی صرف دین میں نہیں ہوسکتی، دنیاوی رسم ورواج تو وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے ہی رہے ہیں ہمیشہ سے۔ خصوصاً کوئی ایسا قانون جو وقت کی ضرورت اور انسانیت کے بھلے کے لیے ہو، محض یہ سوچ کر اسے رد کردینا کہ پہلے ایسا نہیں ہوا۔ نام نہاد اصولوں کی جیت اور انسانیت واخلاقیات کی ہار بن جاتا ہے۔

اکا جان! نگینہ اور احمد کا معاملہ ہمارے خاندان سے متعلق ہے، خاندان سے باہر اس میں صرف داؤد بابا کی فیملی شامل ہے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کی قسمیں جن لوگوں نے کھائیں، ہم ان سب کو اصل حقیقت سے آگاہ کردیتے ہیں۔ یہ سب ایک غلطی کا شاخسانہ تھا، اگر ہم یہ سچ سب پر ظاہر کردیں تو مستقبل کے لیے ایک سبق حاصل ہوجائے گا اور آئندہ ایسی غلطی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ وہ دونوں نہیں بھاگنا چاہتے تھے، لیکن ہم نے ان کے بھاگنے اور پوری دنیا میں اس بات کو اُچھالنے کی راہ ہموار کی۔

اور ہم اس وقت آپ سے صرف اتنی درخواست کررہے ہیں کہ قتل کی قسمیں ان پر سے ہٹوا کر ان کا کفارہ ادا کردیا جائے۔ اور..... اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو مجیب چاچا سے صلح.....'' یہاں آکر واسع تھوڑا ہچکچا گیا۔

''ہوں۔'' عبدالرحمٰن ہلکا سا سر ہلا کر رہ گئے۔ وقت اور ذمہ داریاں انسان کو موم سے پتھر کیسے بنا دیتی ہیں انہوں نے خود پر جھیل کر دیکھا تھا۔

ہفتوں سے انکا دل اندر ہی اندر سخت بے چین تھا۔ سلطانہ بھابی کی بیماری کا سن کر دل کو حقیقی دکھ پہنچا تھا۔ سلطانہ محض ان کی بھابی ہی نہ تھیں۔ ان کی بیوی شمیم کی گہری سہیلی اور ان کی منہ بولی بہن تھیں۔ شمیم نے ہی بڑی محبت سے اپنے دیور کا رشتہ اپنی سہیلی سے کروایا تھا۔ سلطانہ اس خاندان میں شمیم اور ان کی محبت اور خلوص کے سہارے ہی تو آئی تھیں۔ اور پھر وقت گزرنے پر بچوں کے آپس میں رشتے کروادینے کے بعد یہ محبت اور بھی مضبوط دکھائی دینے لگی تھی..... لیکن پھر وقت کی کروٹ اور اب جب سلطانہ بھابی کے السر کا سنا تو وہ اور شمیم ایک سا

تڑپے تھے سن کر۔ لیکن یہ اصولوں کی اونچی دیواریں۔ انہوں نے سیف کی وجہ سے اب ان سب گھر والوں کا نام بھی زبان پر لانا چھوڑ دیا تھا۔ اور آج یہ بچے۔'' انہوں نے محبت سے واسع اور نصیر کو دیکھا۔ یہ تو جیسے ان ہی کا پرتو تھے، ویسے ہی خلیق، نرم خو، اعلا ظرف، لچک رکھنے والے، وہ بنا ان کے کہے ان کی ایک ایک بات کے قائل تھے۔ خاندانوں کی دوریاں مٹ جائیں، سب ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ اس عمر کے آخری حصے میں ایسی خوشی کا بھلا کوئی نعم البدل ہوسکتا تھا۔

''میں سیف سے بات کروں گا۔'' وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آئے تو بس اتنا ہی کہہ پائے۔

''سیف لالہ!'' نصیر اچانک مؤدب سا اٹھ کھڑا ہوا تو واسع اور عبدالرحمٰن نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

''ارے آؤ آؤ۔ ماشاء اللہ لمبی عمر ہے۔ تمہارا ہی نام تھا میری زبان پہ۔'' عبدالرحمٰن نے مسکرا کر بیٹے کو پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ سوالیہ نظروں سے باری باری سب کو دیکھتا بابا کے قریب بیٹھ گیا۔

''اس روز تم بھی وہاں تھے نا سیف! جب واسع نے وہ سب باتیں بتائیں۔'' عبدالرحمٰن نے تمہید باندھتے اشارتاً اتنا ہی کہا۔ احمد اور نگینہ کا نام اس کے سامنے زبان پر نہ آسکا۔

''جی۔'' وہ جواباً یہی کہہ پایا۔

''اکا جان! وہ مجھے آپ کو بتانا تھا کہ زمرد کے لیے اسفند کا رشتہ آیا ہے۔ اور ہم نے ہامی بھر لی ہے۔'' نصیر نے بات کو ایک اور ڈھنگ سے شروع کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا ماشاء اللہ۔ بہت خوب سوچا۔ ''اسس..... فند.....'' انہوں نے ایک چور نظر سیف پر ڈالتے دھیرے سے کہنا شروع کیا۔ ''اچھا، سلجھا ہوا لڑکا ہے۔''

''کاش ہم نے زیبا کو بھی خاندان سے باہر جانے نہ دیا ہوتا۔''

واسع بھی سمجھ گیا تھا، سیف کے آگے ڈائریکٹ کچھ کہنے کے بجائے بالواسطہ بات کرنا زیادہ مناسب تھا۔

''بس بیٹا، اس کا نصیب۔'' شروع کے وقت میں غصہ اور نفرت بھی کچھ اور تھی۔ یہ تو وقت ہی ہوتا ہے جو قدرت کی طرف سے انسان کے لیے مرہم ثابت ہوتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی آہستہ آہستہ ہی کام کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ سلطانہ بھابی اُن دنوں بیمار ہوئی ہوئیں جب وہ واقعہ بالکل نیا تھا تو شاید یہی میں ہوتا جو یہ سوچتا کہ اچھا ہے ایسی اولاد کے ماں باپ کو تو مر ہی جانا چاہیے۔ لیکن ایک مدت گزر جانے پر جب ان کی تکلیف کا پتہ چلا تو پہلی بار احساس ہوا کہ نفرت تو اب اندر کہیں رہی ہی نہیں۔ جو باقی رہ جاتی ہے وہ صرف انا، اور اپنے بنائے اصولوں پر ہٹ دھرمی سے گردن اکڑائے رکھنے کی مجبوری ہوتی ہے۔''

''سیف لالہ! آپ ہمارا ساتھ دیں گے نا؟'' واسع نے مزید انتظار نہ کرتے آگے بڑھ کر جذباتی انداز میں سیف کا بازو تھام لیا۔ نصیر نے گھبرا کر تھوک نگلا تو عبدالرحمٰن اسے قائل کرنے کے جملے ترتیب دینے لگے۔

''کیا کرنا چاہتے ہو؟'' سیف کا لہجہ روکھا اور بے لچک تھا۔

''بیٹا یہ چاہتے ہیں کہ ایک تو خاندان میں آئندہ بدلی کے بغیر رشتے طے کیے جائیں۔ یہ تو چلو سب کے لیے قابل قبول ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔ دل سے کوئی بھی اس رسم کے حق میں نہیں۔'' اور وہ کہتے کہتے رکے۔ اگلی بات شروع کرتے تو ان کا بھی گلا خشک ہوگیا۔

''اور تمہارے مجیب چاچا سے صلح۔'' وہ سچ مچ آگے کہہ نہیں پائے۔

''اور لالہ! وہ تو پہلے ہی اولاد کے کیے کی کتنی سزا بھگت چکے ہیں۔ بچوں کی دوری، لوگوں کے نفرت بھرے رویے، سگے رشتوں کا سوتیلا پن،

سات برس کم تو نہیں ہوتے۔'' واسع نے کہا۔

''اور جب تک ہم سچ نہیں جانتے تھے تو نفرت بھی جائز تھی، دوری بھی درست، لیکن اب اتنا کچھ جان لینے کے بعد کیا ہم اتنی معمولی سی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ کہ قتل کی قسمیں ہٹا دیں، مرتے دم تک تعلق نہ رکھنے کا عہد توڑ دیں۔ اور.....''

''ایک شرط پر۔'' سیف نے ان دونوں کے جذباتی دلائل کو بیچ میں قطع کیا۔

''شرط۔'' تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''اگر ایسا ہی ہے کہ وقت نے وہ تمام اثر زائل کر دیے ہیں تو صلح صرف مجیب چچا اور ہماری کیوں، پھر مجیب چچا کے داؤد بابا کے گھر کے ساتھ بھی تعلقات بحال ہو جانے چاہئیں۔''

''کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ اثر ختم ہو گیا۔ کہیں ہم تم پر کوئی زبردستی تو نہیں کر رہے۔'' اکا جان شاید اس کے لہجے سے اخذ نہیں کر پائے کہ آیا طنز ہے غصہ یا کچھ اور.....

''وہ سب کچھ جو ماضی میں ہوا اگر ہم سب کی غلطیوں کا نتیجہ ہے تو پھر سات سال واقعی بہت کافی ہیں، سبق لینے کے لیے، خود کو سدھارنے کے لیے، سزا بھگتنے کے لیے۔'' وہ اب سنجیدگی سے تبصرہ کر رہا تھا اور ان تینوں کو بھی کچھ کچھ یقین سا آنے لگا کہ سیف ان کا ساتھ دینے کی ہی بات کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ بولنے اور تبصرہ کرنے میں احتیاط کر رہے تھے۔

''بیمار صرف سلطانہ چاچی ہی نہیں، داؤد بابا بھی برسوں سے بستر پر ہیں، صلح کرنی ہے تو پھر ان کی سزا بھی معاف ہو، ان پر سے بھی قسموں کا بوجھ ہٹا دیا جائے۔''

''یہ بات ہمارے ذہن میں بھی تھی لالہ، لیکن ہمیں لگا یہ شاید کچھ زیادہ ہو جائے۔''

''اور وہ بھی میرے پریشر کی وجہ سے لگا ہوگا۔'' سیف پہلی مرتبہ ہلکا سا مسکرا دیا تو نصیر اور واسع بھی بری طرح جھینپ گئے جبکہ سیف نے اپنی بات جاری رکھی۔

''وقت مرہم بھی ہے، اللہ کی نعمت بھی اور آج مجھے لگتا ہے کہ میرے ہر سوال کا جواب بھی، مجھے شاید بہت سے تکلیف دہ سوالوں سے نجات حاصل ہوئی ہے۔ وقت واقعی قدرت کا طبیب ہے، پھر میں کوئی دنیا سے الگ تو نہیں۔'' وہ سر جھکائے دھیمے لہجے میں کہے گیا تو ان تینوں نے ایک ساتھ سکون کا سانس لیتے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اللہ پاک تمہیں سچی خوشیاں اور دلی سکون عطا فرمائے۔ جو ہمیں قدرت ودیعت کرتی ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہوتا ہے جس کی ہم تمنا کر رہے ہوتے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے دعائیہ انداز میں نرمی سے جتاتے اپنی توجہ واسع اور نصیر کی جانب کی۔

''تم دونوں سب سے پہلے مجیب سے اس سارے معاملے پر بات کرو، وہ اگر راضی ہے تو پھر داؤد کے ہاں بھی تم دونوں جاؤ گے۔ سب کی رائے ایک سی ہو تو مجھے آ کر بتانا، پھر اپنے خاندان کا جرگہ بلا کر سب کو بٹھا کر باقی سب باتیں طے کریں گے۔''

''جی اکا جان! نصیر ابھی دو دن یہیں ہے، ہم آپ کو کل شام تک ہی ساری تفصیل لا دیں گے۔ ان شاء اللہ۔'' واسع اور نصیر اجازت لیتے ایک ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

''اے ماشاء اللہ۔'' جمیلہ مسکراتے لبوں پر حیرت سے ہاتھ رکھے نئی بائیک کو دیکھ رہی تھیں۔ واسع نے شوخ لبوں کو دانتوں میں دبائے زور سے ہارن بجایا تو چھت پر کھڑی رباب تیزی سے سیڑھیاں اتر کر بھاگی۔ باری پہلے ہی بائیک پر چڑھ کر بیٹھا دادی کو آوازیں لگا رہا تھا۔

''آ رہی ہوں۔ صبر تو کرو۔'' وہ مشکل سے خود کو سنبھال کر آہستہ آہستہ بستر سے اتر کر چپلیں پہنتی باہر نکلیں۔

''ماشاء اللہ۔'' کالی چمچماتی نئی موٹر سائیکل نے تو آج گھر کی رونق کو دوچند کر دیا تھا۔ دادی اس

نئے خوب صورت اضافے کو از حد حیرت اور خوشی سے دیکھ رہی تھیں۔

''اب کسی پالکی کی کوئی ضرورت نہیں لالہ! بائیک پر گاؤں بھر میں دادی کو اڑاتا اب۔''

رباب دوپٹے کے پلو سے بلاوجہ صاف ستھری بائیک کو صاف کرنے لگی، بہت دنوں کی سرد مہری ابھی چند دن پہلے ہی ٹوٹی تھی۔ وہ رباب کی حرکت کے بعد سے اس سے بات کرنا چھوڑ چکا تھا۔ لیکن جرگے کی فتح کے بعد دادی نے ہی اسے بہن کو معاف کرنے کی منت کی تو اس نے بھی کہنا مان لیا۔ باہر تو صلح ناموں کے کیسے بڑے بڑے محاذوں پر کام کررہا تھا اور خود گھر کے ایک معمولی تنازعے پر اپنا دل صاف نہ کرسکا تو کسی اور سے کیا امید لگاتا۔ یہی سوچ کر رباب کے لیے اپنا دل کشادہ کرتے اسے بھی معاف کردیا۔

''سب سے پہلے مجھے باغ لے جانا۔ دیکھو تو جب سے واپس ملا ہے ابھی تک منت نہیں اتار پائی۔''

''ایسی کیا منت مانی تھی اماں؟'' جمیلہ مسکرا کر دریافت کرنے لگیں۔

''نوافل مانے تھے شکرانے کے۔ سوچا تھا برکت کے لیے باغ میں ہی مصلیٰ بچھا کر وہیں ادا کروں گی۔''

''کل صبح لے جانا باری، اور مصلیٰ تسبیح بھی یاد سے دینا رباب۔''

''ارے دادی میں بھی ساتھ چلوں گی۔ وہیں کچھ میٹھا وغیرہ پکا کر بچوں میں بانٹ بھی دیں گے۔''

''ارے واہ۔ مبارک دے سہ۔''

دروازے سے کھلکھلاتی سی اونچی آواز نے بیک وقت سب کو متوجہ کیا۔ گھر کے دروازے سے گلشن پھوپھی اندر داخل ہورہی تھیں۔ پیچھے زمرد اور پھر خلیل پھوپھا۔

رباب کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ خلیل پھوپھا کے پیچھے نصیر بھی متوقع تھا۔ لیکن وہ تینوں اندر تک آچکے تھے۔ نصیر ساتھ نہیں تھا۔ البتہ خلیل پھوپھا کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ گلشن پھوپھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کی اماں اور اپنی اماں سے ملی تھیں۔ پھر اس کے قریب آئیں۔ اور پیار سے پیشانی چوم کر گلے سے لگایا تو رباب کے لب نصیر کے جملوں کا مفہوم یاد کرکے شرمیلا سا مسکرا دیے۔ ابھی کچھ دیر پہلے نصیر نے پتھر مار قسم کا میسج کرکے اسے تیار رہنے کو کہا تھا۔ تب وہ یہ سمجھی تھی کہ شاید وہ خود ان کے ہاں آرہا ہے۔ نازنین کی فون کال کے بعد سے اب تک وہ ان کے ہاں نہیں آیا تھا۔ رباب نے البتہ میسج پر اپنی طرف سے معافی بھی مانگ لی تھی، کال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اور اب گلشن پھوپھی کا پیار لٹاتا انداز، مٹھائی، سب کی ایک ساتھ آمد، وہ بھی ایک خاص فرد کی موجودگی کے بغیر۔

''یہ کیسا سرپرائز ہے؟ خود تو آئے نہیں۔'' وہ چائے بنانے کے دوران اس سے میسج پر پوچھنے لگی

''ہمارے ہاں رشتہ مانگنے دولہا خود نہیں آتا۔''

نصیر کا جواب بھی فوری موصول ہوا اور رباب نے جھینپ کر موبائل ہی آف کردیا، جواب کا انداز اگرچہ روکھا پھیکا ہوتا لیکن وہ اس سے رابطے میں رہنا چاہتا تھا۔ ناراضی پہلی بار اتنی سنجیدہ اور طویل ہوئی تھی کہ انا نصیر کے بار بار آڑے آجاتی۔ لیکن رباب کے لیے یہ کیا کم تھا کہ ناراضی ختم کرنے کا آج اس نے عملی ثبوت دے دیا تھا۔

آہستہ آہستہ ہی سہی پر وہ بھی خود کو ثابت کردے گی۔ اس نے بھی تو اپنی غلطیوں کو کبھی نہ دوہرانے کا عزم کیا تھا، پھر وہ اپنے نصیر کا دل جیتنے میں کیوں کامیاب نہیں ہوگی۔

☆☆☆

ذکی نے تین دن متواتر اپنے بندے لگوا کر واسع کی آفس جانے اور آنے کی روٹین چیک کی تھی۔ اس کے گھر سے نکل کر آفس جانے کے وقت میں تینوں دن معمولی سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ

پیدل سڑک تک جاتا اور کوئی بس ویگن ملنے تک سڑک کنارے چلتا ہی رہتا، ذکی کا خیال تھا کہ اسی پیدل مارچ کے دوران ہی ٹرک کی ٹکر سے اس کا حادثہ کروادے گا۔ لیکن چوتھے دن اچانک واسع اپنی نئی بائیک پر گھر سے نکلا تو ذکی کو اپنا سارا پلان ہی تبدیل کرنا پڑا۔ اب وہ گھر سے آفس تک اپنی بائیک پر ہی جانے اور آنے لگا تھا۔ ذکی کے لیے اس نئی روٹین میں اپنے منصوبے پر عمل درامد زیادہ آسان تھا۔ اس نے سارے معاملات طے ہوجانے کے بعد آج فائنل کال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب سب کچھ پروگرام کے مطابق تھا۔

''خان زادہ کا پٹرول پمپ ہے نا۔'' ذکی نے گال کھجایا۔

''ہاں، معلوم ہے۔'' شہزادے نے گردن ہلائی۔ ''یہی شہزادہ ہی کرائے کا قاتل تھا۔ جس سے ذکی نے باقی سب معاملات پہلے ہی طے کرلیے تھے۔''

''بس اس کے فوراً بعد اسی پٹرول پمپ والے ہاتھ پر ہی ایک چھوٹا روڈ اترتا ہے۔ تم اسی روڈ پر اپنے ٹرک میں بیٹھے بڑی سڑک کی طرف منہ کیے بس چار پانچ فٹ پیچھے بالکل تیار بیٹھے ہوگے۔ ٹرک بھی آن ہو۔ دور سے جیسے ہی اس کی بائیک آتے دیکھو تو جونہی وہ قریب پہنچے اچانک سڑک پہ نکل کر اسے بائیک سمیت کچل ڈالو اور نکلتے چلے جاؤ، تصویر تمہیں بھیج دی تھی۔ پہچان جاؤ گے۔ وقت نہ بھولنا۔ سوا آٹھ بجے بالکل ریڈی رہنا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے تک پہنچے گا۔ ویسے میرا آدمی اس کے گھر سے نکلتے ہی تمہیں کال کردے گا۔''

''صحیح ہوگیا، لیکن وہ ایڈوانس رقم۔'' شہزادہ مطلب کی بات پر آیا۔

''شام تک پہنچ جائے گی۔ لیکن کام نہ ہوا تو باقی کی رقم بھول ہی جانا۔'' ذکی نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیتے کال آف کردی۔

''اب تو تم جان سے جا کر ہی دنیا کو بتاؤ گے واسع خانا کہ نیت اور ارادہ تو تمہارا کچھ اور تھا اس نیک پروین کو ویرانے میں لے جانے کا لیکن قرآن پہ ہاتھ رکھ کر جو تم نے خود کو بچانے کی کوشش کی وہ رائیگاں گئی۔''

''اب میں بھی کیا کروں، اگر تم اوپر والے سے عمر ہی اتنی لے کر آئے تھے۔ وہ اپنی بات سے آپ حظ اٹھاتے ہنس کر بستر پر لمبا لیٹ گیا۔ ''اب مرنے سے عین چار دن پہلے تم جھوٹ بولو یا سچ، دنیا تو اسے عذاب ہی سمجھے گی، اور پھر اس غم کو برداشت نہ کرپاتے اگر اگلے دو چار دنوں میں نازنین بھی کسی ندی نالے میں مردہ پائی گئی تو زمانہ اسے مجنوں کی محبت میں جان گنوادینے یا جھوٹ بولنے کی سزا ہی سمجھے گا۔ اور اس بیچ وہ مرنے والی کسی کی تشنہ خواہشوں کی تکمیل کا باعث بھی بنی تھی، کسی کو کیا معلوم ہوگا۔

ذکی کا محض تصور سے ہی من گدگدانے لگا۔ اب تو اگلی صبح کے ساتھ ہی یہ سبھی طوفان تھمنے کی امید تھی۔

☆☆☆

''نمبر ملانے لگا ہوں۔'' واسع نے مسکرا کر نصیر کو دیکھا۔ ''تم بھی بات کرو گے نا؟''

''برسوں گزر گئے، ذرا عجیب سا لگ رہا ہے۔'' وہ جھینپ گیا۔ ''پہلے تم بات کرو، ساری تفصیل سے آگاہ کردوں کو۔''

''ہوں۔'' واسع نے کال ملا کر موبائل کان سے لگایا۔ بیل جارہی تھی۔

''ہیلو۔ واسع؟'' احمد کی حیرت بھری مسکراتی سی آواز ابھری۔ یقیناً اس نے واسع کا نمبر محفوظ کر رکھا تھا۔ اس کے نمبر سے کال آتی دیکھی تو جوش دیدنی تھا۔ واسع نے اسپیکر آن کر رکھا تھا۔ احمد اور نگینہ سے اپنی گفتگو وہ جان بوجھ کر نصیر کو سنوا رہا تھا تاکہ اس کی جھجک ختم ہو۔

''ہاں ہاں واسع ہوں، سلام دعا بھی بھول گئے۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''یاااار۔ کتنی بے تابی سے تمہاری کال کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ نگینہ تو مایوس ہی ہوگئی تھی، کہتی تھی مت امید لگاؤ احمد، ہماری زندگی میں بس ایک ہی دن آیا تھا۔''

''ہاہاہا۔ توبہ مے دا مجنون (دیوانے)۔ بھئی تم لوگ خود بھی تو مجھے کال کر سکتے تھے۔ میں نے کیا منع کیا تھا۔''

''بس خانا، اجازت بھی کب دی تھی۔ احمد نے شکوہ کیا۔ نصیر اس کی بے تابی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

'اچھا کیا رہا وہ تمہارا باغ کا معاملہ۔ میں آؤں؟'' احمد واقعی نہیں بھولا تھا۔

''باغ تو تم دونوں کی دعا سے واپس مل گیا ہے۔ بس کچھ اسی وجہ سے ذرا زیادہ مصروف رہا۔

''اچھا ماشاء اللہ، بہت بہت مبارک ہو۔ میں نے کہا تھا ناں، مولوی صاحب تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ اے نگو۔ دالے راسہ، واسع فون را غلے دا۔'' احمد اونچی آواز میں نگینہ کو بلانے لگا۔

''رشتیہ (سچی؟)۔'' نسوانی پرجوش آواز قریب آنے لگی۔ نصیر اور واسع ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

''کیسا ہے واسع، اماں کیسی ہے، پوچھو احمد۔'' وہ شاید نزدیک آکر بیٹھ گئی تھی۔

''ذرا اس ''پوچھو کی بچی'' کو فون دو۔'' واسع نے پیار سے جھڑکا تو احمد نے ہنستے ہوئے فون نگینہ کی طرف بڑھا دیا۔

''سلام واسع، کیسے ہو۔ بھول ہی گئے تھے۔ سب خیریت تو تھی نا۔ اماں اب کیسی ہیں؟''

نگینہ کی اسپیڈ احمد سے بھی زیادہ تھی۔ البتہ سوالوں کی بھرمار میں بھی لہجہ بھیگا سا لگنے لگا۔

''ہاں بابا۔ سب ٹھیک ہیں۔ چاچی بھی اب پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔''

''تم نے انہیں بتا دیا واسع؟'' نگینہ کا حیرت سے منہ کھلا۔

''ہاں تب ہی بتا دیا تھا۔'' خوشی سے رونے لگی تھیں۔ طبیعت بھی شاید اسی لیے اچھی ہوگئی۔

''واسع اب تو میں ان سے بات کر سکتی ہوں ناں؟ میری اماں سے بات کروا دو گے؟

''ہوں۔'' واسع نے مسکرا کر معنی خیزی سے نصیر کی طرف دیکھا جس نے ابرو سے اگلی بات بتانے کا اشارہ دیا۔

''بس بات کرنی ہے، ملنا نہیں چاہو گی؟''

''ملنا۔'' نگینہ کا زور سے دل دھڑکا۔ ''کیا وہ دوبارہ کوئٹہ آرہی ہیں؟ لیکن ہم تو رحیم یار خان میں ہیں۔ کیا ہم آجائیں کوئٹہ؟'' وہ بالکل بدھوؤں کی طرح لگاتار بولے جا رہی تھی، واسع کا بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

''واسع تم مذاق کر رہے تھے نا؟'' نگینہ کا لہجہ بجھ گیا۔

''نہیں بھئی، مذاق نہیں۔ تم ذرا اسپیکر آن کرو، تم دونوں سے ایک ساتھ بات کرنی ہے۔ میرے ساتھ بھی نصیر ہے، تم دونوں کو سن رہا ہے۔

''اچھا ماشاء اللہ۔'' وہ چہکی، ایک وقفہ دیا جیسے اسپیکر آن کر رہی ہو۔

''السلام علیکم نصیر، کیسے ہو؟'' وہ چونکہ ان دونوں کی تقریباً ہم عمر تھی اس لیے نام سے بلاتی تھی۔

''وعلیکم السلام، بالکل ٹھیک ہوں، تم دونوں کیسے ہو؟''

''ہم بھی ٹھیک ہیں۔''

''نگینہ! نصیر کو مبارک باد بھی دو، رشتہ طے ہو گیا ہے اس کا، شادی بھی عنقریب......'' واسع نے منہ آگے کر کے اطلاع پہنچائی۔

''اچھا واہ۔ کہاں، کس سے۔ شادی کب ہے؟'' نگینہ کا بس نہیں چل رہا تھا سب ہی کچھ ایک ساتھ جان لے۔

''یہ جو تمہیں اطلاعیں دے رہا ہے نا۔ اب سالا بنے گا میرا۔'' نصیر شوخ ہوا تو نگینہ سوچ میں پڑ گئی۔

''آں۔ اچھا رباب۔ واہ نصیر بہت اچھا کیا۔ اور تب تو واسع کا رشتہ بھی زمرد۔''

''نانا۔'' نصیر نے اس کی بات کاٹی۔ ''بدلئی سے اب ہماری توبہ، اکا جان یہ رسم ہی ختم کررہے ہیں۔''

''ہیں سچی۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ سنا احمد۔'' وہ یقین نہ آنے والی نظروں سے احمد کو دیکھنے لگی۔

''واسع کا بھی رشتہ طے پا گیا ہے۔'' اپنا نغمہ بھابی کی بہن کے ساتھ۔''

''اچھا۔ گھنے برادر۔ اپنی خوش خبری چھپا کر بیٹھے ہو؟''

''اور بھی بہت کچھ ہے۔'' واسع کے لب مسکرا رہے تھے۔ ''ایک ساتھ سب بتادیا تو بے ہوش ہوجاؤ گی۔''

''میں بتاؤں کچھ؟'' نصیر نے موبائل قریب کیا۔

''ہاں نصیر، تم بتاؤ، مت پوچھو اس وقت کتنی خوش ہوں۔ دو، دو بھائیوں سے ایک ساتھ بات ہورہی ہے۔''

''تو اب اپنے تیسرے بھائی کے متعلق خوش خبری سنو، اسفند کا رشتہ ہم نے زمرد کے ساتھ طے کردیا ہے۔''

''واہ رے۔ یہ خاندان میں تو رشتوں کی برسات نہیں ہوگئی۔ اور اپنی زمرد۔ وہ میری بھابی بنے گی۔ اللہ، اتنی سی بچی تو تھی اور اسفند۔'' وہ پلکوں سے آنسو چننے لگی۔

''اور اب تم اصلی خبر سنو۔ ذرا دل تھام کے۔'' واسع نے مسکرا کر ایک نظر نصیر کو دیکھا۔

''بس تم دونوں خوشی کی خبریں سناتے رہو، پھر چاہے مجھے خوشی سے ہارٹ اٹیک کیوں نہ ہوجائے، پروا نہیں ہے۔''

''ہم مجیب چاچا اور عبدالرحمٰن چاچا کے گھروں کی آپس میں صلح کروا رہے ہیں۔''

''ہیں۔ واقعی۔'' نگینہ کی سچ مچ آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ واقعی بہت بڑی خبر تھی۔ ''کیا یہ ممکن ہے..... اب.....'' نگینہ کا لہجہ دھیما ہوا، ذہن میں شاید قسموں والی بات پھرنے لگی۔

''دونوں خاندان راضی ہیں، اکا جان جلد جرگے میں صلح کا اعلان بھی کردیں گے۔ تم شاید قسموں کی بات سے پریشان ہوگئیں۔ اس کا بھی کفارہ ادا کریں گے، ان شاء اللہ سب پہلے جیسا ہوجائے گا۔ اور بدلئی ختم کرنے کا بھی باقاعدہ اعلان کریں گے۔ آئندہ رشتے ناتے کم از کم اس دباؤ کے تحت نہیں ہوں گے۔''

''یہ تم لوگوں نے بہت بڑا کام کیا ہے واسع، اللہ پاک اجر دے۔ نسلوں کا بھلا ہوجائے گا۔'' احمد نے آگے ہوکر سنجیدگی سے بات میں حصہ لیا تو واسع نے ایک نظر نصیر کو دیکھا، پھر فون کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں احمد، لیکن اتنا کافی نہیں تھا۔ صلح اگر سیف لالہ کی فیملی کے ساتھ ہوسکتی ہے تو تمہارے خاندان والوں کو بھی کیوں سزا ملے۔''

''کوئی بات نہیں واسع، یہ شاید بہت مشکل ہوجائے۔'' احمد نے شاید عاجزی سے کام لیا یا پھر حقیقت پسندی سے۔

''برف پگھل رہی ہے احمد! تم بھی اچھے کی امید رکھو۔''

''لیکن یہ سب کیسے ہوا واسع! اتنے جلدی۔ اور ایسے اچانک۔ کیا صرف ہمارا سچ بتادینے سے؟'' احمد بھی بے یقین تھا۔

''حالات نے کروٹ بدلنا تھی احمد۔ اور یقیناً اللہ کی رضا سے۔ ویسے خوشی کی ان خبروں کے بیچ کچھ بہت تکلیف دہ بھی پیش آیا لیکن چیزیں اپنی جگہ پر آنے سے پہلے ایک بار بکھرتی تو ہیں۔ ایک چھوٹا سا زلزلہ میری زندگی میں بھی آنا تھا شاید۔''

واسع دھیرے سے بس اتنا کہہ پایا۔

''درہ'' جب بھی یاد آتا درد کی لہر سی دماغ میں رینگ جاتی، وہ سر جھٹک کر حال میں آیا۔

''واپسی کی تیاری کرو احمد، تمہارا وطن تمہارا منتظر ہے۔ جو سزا تم دونوں نے بھگتی، شاید پورے استقلال سے، صبر شکر ادا کرتے کافی سبھی اس مالک نے تم دونوں پر ترس کھایا۔''

''مجھے یقین آنے دو واسع، ابھی شاید ہم کچھ بھی بولنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ مجھے نجانے کیوں ایسا لگ رہا ہے ابھی خواب ٹوٹے گا اور سب اُڑن چھو ہو جائے گا یا پھر تم کہہ دو گے یہ سب ایک مذاق تھا۔'' احمد کا تعجب عروج پر تھا۔ واسع اس کی کیفیت سمجھتے مسکرا دیا۔

''تو ٹھیک ہے، یقین آنے تک تم دونوں کچھ وقت لے لو۔ پھر بات کریں گے ان شاء اللہ۔ مجھے بھی کافی دیر ہوگئی ہے یہاں نصیر کے پاس، صبح آفس کے لیے نکلنا ہے۔ اللہ حافظ۔''

واسع نے ان دونوں سے اجازت لے کر موبائل بند کیا اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم نے بھی صبح ژوب کے لیے نکلنا ہوگا؟'' واسع نے نصیر سے تصدیق چاہی۔

''ہاں، کل صبح گیا تو پھر سنیچر کو ہی لوٹوں گا۔ پچھلے کئی دنوں سے لگاتار آنا جانا لگا ہوا ہے۔ اب کچھ دن ژوب میں ہی ریسٹ کروں گا۔''

''کل میں آفس سے واپسی پر اکا جان سے پوچھوں گا کہ جرگہ کب بلانا چاہتے ہیں۔ ویسے کل ایک پارٹی ہے آفس میں، کچھ نئے ڈیل ٹریٹ دے رہے ہیں، واپسی شاید دیر سے ہو لیکن اکا جان سے بھی ضرور ملوں گا۔ بات کو لٹکانا اب ٹھیک نہیں، اثر ختم ہونے لگتا ہے۔''

''پریشان نہ ہو، اب ایسا کچھ نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔'' نصیر نے اس کا کندھا تھپکا۔

''مجھے رئیس کی فکر ہے سچ مچ۔'' واسع اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔

''اس کی فکر مت کرو۔ میں نے اس سے کھل کر بات کر لی تھی کہ اسفند کا رشتہ ہم نے اس سے پہلے کیوں طے کر دیا۔'' وہ مطمئن ہوا تھا سن کر۔

''یہ تو بہت اچھا کیا تم نے، میں واقعی بہت ڈسٹرب تھا۔''

''اور میں ذکی کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں واسع۔'' نصیر بھی ایک دم سنجیدہ ہوا۔ ''گھاٹی کے واقعے میں اس کا نام کھلنا چاہیے تھا۔ اتنا کچھ کر لینے کے بعد بھی وہ صاف بچ نکلا۔ اس کی بدنیتی ظاہر ہونی چاہیے تھے۔''

''میں نے سب اللہ پر چھوڑ دیا نصیر۔ اس سے تو کچھ نہیں چھپا ناں۔''

''ہاں یہ تو ہے، ہم واقعی کبھی کبھی صرف دنیا کے نظریے سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا جو جانتی ہے اس کا بس چوتھائی درست ہوتا ہے باقی سب مفروضے، اور جو ہم نہیں جانتے، اصل میں تو وہی سچ ہے۔''

نصیر نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا شانہ دبایا۔ اور ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا کیونکہ واسع جانے کے لیے تیار کھڑا تھا لیکن واسع بجائے ہاتھ ملانے کے اس سے بغل گیر ہو گیا۔ نصیر نے اس کی بے چینی کو بہت شدت سے محسوس کیا۔

''ابھی بھی اپ سیٹ ہو؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ معلوم نہیں کیوں، ہر نئی اور اچھی خبر کے ساتھ میرے دل کے بوجھ پہلے سے کچھ اور بڑھنے لگتے ہیں۔''

''وہم نہ کرو، یہ بس بے یقینی ہوتی ہے اندر کی۔''

''ہوں۔'' واسع بظاہر مسکرا کر لیکن درحقیقت کچھ الجھا الجھا سا گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ تمام رات درد کی اینٹھن سے تڑپتی رہی تھی۔ کسی کل آرام تو نہ تھا پھر بھی نجانے کیوں بیچ بیچ میں اسے غشی جیسی نیند غالب آ جاتی۔ بڑی دیر بے سدھ پڑے رہنے کے بعد اچانک وہی درد نیم غشی سے ہوش میں لاتا اور وہ نئے سرے سے تڑپنے لگتی۔ بڑی مشکل سے ہاتھ بڑھا کر شوہر کا کندھا ہلایا، تب

تک اذانیں سنائی دینے لگی تھیں۔ شوہر کی آنکھ تو کھل گئی پر وہ ایک مرتبہ پھر ہوش کھو بیٹھی۔ اور جب آنکھ کھلی تو خود کو بیڈروم کے بجائے ہسپتال کے آپریشن تھیٹر میں پایا۔ لیڈی ڈاکٹر حواس باختہ سی سر پہ کھڑی چلا رہی تھی۔

"زہر اندر پوری طرح پھیل چکا ہے۔ بچہ تو چار ماہ کے بعد بڑھا ہی نہیں۔ یہ بے وقوف لوگ چھ ماہ کی پریگنینسی سمجھ رہے ہیں۔ وہ بے چاری دو ماہ سے اندر مردہ بچہ لیے پھر رہی ہے۔ چیک اپ بھی نہیں کرواتے یہ لوگ۔ جلدی کرو۔ بلڈ پریشر بالکل لو ہے۔" ڈاکٹر اسے بے ہوش سمجھتے کسی نرس کے ساتھ اس کا کیس ڈسکس کر رہی تھی۔

"آپریٹ بھی ابھی کرنا ہے، شاید اووری ریموو۔" شبنم کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں، حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ "اس کا بچہ دو ماہ پہلے ہی مر چکا تھا۔" درد بھرا آنسو کونے سے کنپٹی کی طرف لڑھکا۔ اس سے زیادہ کچھ سنا نہیں گیا۔

☆☆☆

صبح ہی صبح بڑے غیر متوقع بادل گھر آئے تھے۔ دن چڑھ آنے کے باوجود کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہونے لگا۔ اچانک تیز بارش کے امکان صاف دکھائی دے رہے تھے۔

نازنین اس وقت برآمدے میں کھڑی تھی۔ آس پاس وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے صحن پر نظر ڈالی کہ کیا کچھ بارش کے خدشے کے تحت سمیٹا جاسکتا ہے۔ لیکن دور دیوار کے ساتھ الگنی پر سوائے منزہ اور معیزہ کے چند کپڑوں کے اور کچھ ایسا نہ تھا۔ وہ صحن پار کر کے آخری دیوار کے نزدیک آئی اور ایک ایک کر کے کپڑے اتارنے لگی جب بہت قریب کہیں بائیک اسٹارٹ ہونے کی آواز پر بے ساختہ گردن بائیں جانب گھمائی۔ پہلے اس کا واقعی اس جانب دھیان نہیں گیا تھا۔

جمیلہ چاچی کے گھر کو جاتا درمیانی دروازہ کھلا ہوا تھا اور واسع سامنے اپنے گھر کے صحن میں بائیک پر بیٹھا باہر نکلنے کے لیے تیار تھا۔ اس وقت البتہ نظر نازنین پر تھیں۔ وہ اسے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ بائیک بھی شاید اسے متوجہ کرنے کے لیے اسٹارٹ کی تھی صبح صبح آفس کے لیے نکلنے سے پہلے اس نے تصور نہیں کیا تھا کہ سامنا نازنین سے ہو جائے گا لیکن بائیک پر بیٹھ کر جونہی چابی اگنیشن میں گھمائی دروازے کے اس پار وہ دکھائی دی۔

بسنتی پیلے سے کپڑوں میں گھنے کالے بالو کی چٹیا لہراتے وہ دوپٹہ بھی لاپروائی سے گلے میں ڈالے ہوئے تھی۔ واسع نے ذرا دیر رک کر تصور ک کہ بس چند ہی دنوں بعد وہ دروازے کے اس پ کے بجائے، اس طرف اپنے صحن میں لگے اس کپڑوں کو موسم سے بچانے میں لگی ہوگی۔ تصور بہت ہی سہانا تھا۔ واسع نے اسے بھی شامل کرنے کا ارا کرتے چابی گھمائی تو وہ چونک کر پلٹی، واسع مسکرا کر ہلکا سا سر خم کیا تو جھینپ کر دوپٹہ سر پہ لیا واسع نے بائیک کا رخ بیرونی دروازے کی طرف موڑا تو وہ رک کر دیکھنے لگی۔

اس نے بھی سنا تھا کہ بائیک خریدنا واسع ک بہت پرانی خواہش تھی، جو بالآخر اب پوری ہو تھی۔ اس نے بھی پہلی بار واسع کو بائیک چلا دیکھا تھا اس لیے اشتیاق میں وہیں رکی رہی۔ رشت طے ہو جانے کے بعد ویسے بھی دنیا کا ڈر اب زیا نہیں ستاتا تھا۔

آج وہ گہرے نیلے رنگ کی شلوار قمیص ساتھ ہلکی بادامی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ ویسے تو اس کی آفس ڈریس سفید شلوار قمیص اور کالی واسکٹ تھی آج معلوم نہیں وکالت کی یونیفارم میں کیوں نہیں تھا۔ بہرحال اچھا بہت لگ رہا تھا، شاید وہ اسے گہرے رنگ میں بھی پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ ڈارک بلو کلر میں اس کی سفید رنگت گہرے براؤن بالوں ک امتزاج کے ساتھ صبح جیسی فریش اور ترو تازہ لگ رہی تھی۔ نازنین نے اپنے ہونے والے ہم سفر کو بڑے غرور سے دیکھا تھا، اور تب ہی دروازے سے باہ

نکلتے واسع کو موبائل فون کی بیل نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''جی اسحٰق بھائی۔ السلام علیکم۔ جی بس گھر سے نکل رہا ہوں۔ کوئی بات نہیں، راستے میں بات کرتے رہیں گے۔''

وہ بائیک باہر نکال چکا تھا۔ آواز دور ہونے لگی اور نازنین کپڑے بازو پر لیے وہیں رک سی گئی۔ دل ایک دم پریشان ہوا کہ واسع بائیک چلاتے ہوئے موبائل پر بات بھی کرے گا۔ ایک تو نئی نئی ڈرائیونگ، راستے بھی یہاں کے اونچے نیچے، اوپر سے خراب موسم۔ وہ بے بسی سے ہلتے دروازے کو دیکھے گئی۔ کبھی اس سے فون پر بات بھی تو نہیں کی تھی کہ کال کر کے منع کر دیتی، لیکن فون بھی تو بزی ہو گیا اس کا۔ آج تو اچھا بھی کتنا لگ رہا ہے۔ یا اللہ، میری نظر نہ لگے۔ وہ گھبرا کر آسمان کو دیکھتی اندر بڑھ گئی۔

☆☆☆

''ہاں وہ گھر سے نکل گیا ابھی ابھی۔'' ذکی نے اپنے دوسرے خفیہ نمبر سے فوراً شہزادے کو کال ملائی۔ اسے بھی اشرف نے بتایا تھا کہ واسع ابھی ابھی گھر سے روانہ ہو گیا ہے۔

''کچھ کپڑوں کا رنگ اور دوسری کوئی پہچان بھی بتا دو تو آسانی ہو جائے گی۔''

''تصویر بھیجی تھی نا تمہیں۔''

''ہاں تصویر تو دیکھ لی لیکن اتنی دور سے چہرا مہرا کہاں پہچان میں آتا ہے۔''

''اچھا رکو، میں پوچھ کر بتاتا ہوں۔'' ذکی نے عجلت میں کال کاٹ کر دوبارہ اشرف کا نمبر ملایا۔ وہی اپنی چھت سے واسع کے دروازے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

''اشرف! اس کے کپڑوں کا رنگ بتا سکتے ہو؟''

''جی خان۔ گہرا نیلا رنگ تھا اور بادامی واسکٹ بھی۔''

''اوکے۔'' ذکی نے فوراً کال بند کر کے شہزادے کا نمبر ملایا اور اسے کپڑوں کی تفصیل بتائی۔

''اور موٹر سائیکل کون سی ہے؟'' شہزادہ کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

''یار! ماڈل واڈل تو نہیں پتا، لیکن بالکل نئی کالے رنگ کی بائیک ہے، دو دن ہی ہوئے ہیں۔ اور اب تم باتوں میں ٹائم ضائع مت کرو، وہ پہنچنے والا ہوگا، پانچ سات منٹ میں ہی سامنے سڑک پر آتا دکھائی دے گا۔ بہت ہوشیاری سے کام کرنا، اور دیکھو بچنا نہیں چاہیے۔ ہاتھ پیر توڑنے سے کام بنتا ہوتا تو اس کے لیے میں خود کافی تھا۔ تمہیں ہائیر کرنے کا مطلب ہے بس صرف موت۔''

''ٹینشن نہیں لو خان۔ شہزادے کو تم موت کا فرشتہ سمجھو۔'' وہ ہنستے ہوئے خود ہی کال آف کر گیا اور ذکی چور نگاہیں اطراف میں ڈالتا گھر سے باہر نکل گیا۔ اور لان کے آخری کونے میں سائیڈ والی چھوٹی گلی میں کمرے سے باہر نکل کر موسم دیکھتی نیلم اپنی جگہ پتھر ہو گئی تھی۔

نئی کالی بائیک تو دو دن پہلے واسع نے خریدی تھی، نیلم کے ذہن میں پچھلی شام کا منظر تازہ ہوا۔ دادی پانپتی کانپتی ان کے گھر میں داخل ہوئی تو وہ بھاگ کر ان کے نزدیک پہنچی۔ پیچھے پیچھے باری اندر داخل ہوا۔

''اے باری کے بچے۔ دادی کو پیدل چلاتا لے آئے ہو؟'' نیلم نے تنک کر سوال کیا تو باری نے ہنس کر ایک کی چین اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

''واسع لالہ کی نئی بائیک پر لایا ہوں۔''

''اف توبہ، اتنا تیز بھگایا'' دادی کا سانس اس کی تیز اسپیڈ نے اوپر نیچے کیا تھا۔ نیلم نے شک کی نظر سے چابی کو دیکھتے ڈیوڑھی کا پردہ ہٹا کر ادھ کھلے گیٹ سے دیکھا۔ باہر واقعی ایک نئی کالی بائیک کھڑی تھی۔

''اچھا، کب لی؟ مبارک ہو۔'' وہ واسع کی خوشی کے خیال سے ہلکا سا مسکرائی۔

''کل ہی آئی ہے ہماری نئی بائیک۔'' باری

چھنک رہا تھا۔
"اچھا، آہستہ چلایا کرو۔ کم از کم دادی بے چاری کا تو خیال رکھو۔" وہ باری کو تنبیہ کرتی دادی کو اندر لے گئی۔
"اوہ۔" وہ سر جھٹک کر ایک دم ہوش میں آئی، ذکی نے یہ کس کو جان سے مارنے کا آرڈر دیا تھا۔ وہ تو ایک ہی نئی کالی بائیک والے کو جانتی تھی۔ اور وہی تو تھا جو اس کے بھائی کی آنکھوں میں سب سے زیادہ چبھا کرتا تھا۔ وہ اپنا کپکپاتا ہاتھ دل پہ رکھے اندر کمرے میں آئی۔ ذکی نے کہا تھا بائیک پر آنے والا پانچ یا سات منٹ میں اپنے قاتل کے عین سامنے ہوگا..... تو وہ وقت کیوں ضائع کر رہی تھی۔
اس نے کمرے سے نکل کر بھاگتے ہوئے لاؤنج عبور کیا اور اماں کے کمرے میں آ کر ان کا موبائل ڈھونڈنے لگی، لیکن کہیں نظر نہیں آیا تو کمرے سے نکلتے سامنے سے آتی اماں سے ٹکرا گئی۔
"وئی اللہ۔" وہ کندھا سہلانے لگیں۔
"آپ کا موبائل۔" وہ دہشت زدہ سی ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
"وہ تو کچن....." اور نیلم آدھے میں ہی سرپٹ دوڑ کر کچن میں آئی جہاں دروازے کے پاس میز پر موبائل چارجنگ پہ لگا تھا۔ تار الگ کر کے جلدی سے موبائل کھینچا اور واسع کا نمبر ڈھونڈتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آئی۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ اس کا نمبر ملا رہی تھی جس سے خیالوں میں نجانے چوبیسوں گھنٹے کتنا کچھ بولتی رہتی تھی۔
"ہیلو۔" چلتی بائیک پر ہوا کی شائیں شائیں کے شور میں واسع کی بھاری حیرت بھری آواز کانوں سے ٹکرائی۔ جیسے کوئی مخاطب سے انجان ہو، شاید اس کے پاس اماں کا نمبر محفوظ نہیں تھا۔
"مم مم..... میں..... نیلم....." اس نے ہوا کے شور پر اپنی آواز کو حاوی کرنے کی کوشش میں پورا زور لگایا لیکن واسع یقیناً بڑے روڈ پر چڑھ چکا تھا، جہاں ہیوی ٹریفک اور ڈرائیونگ کی آواز میں کچھ بھی سننا محال تھا۔
"واسع..... میں نیلم....." اس نے گھر کی گہری خاموشی کی پروا نہ کرتے اس مرتبہ پہلے سے زیادہ زور لگایا۔
"نیلم۔" واسع کے پلے اس کی آواز پڑ ہی گئی، حیرت سے دہرایا۔
"واسع..... بائیک روکیں..... اللہ کا واسطہ آگے مت جائیں..... آپ کی جان....."
"اونو۔" واسع کی آواز سے ظاہر تھا اس کی توجہ موبائل کی طرف نہیں بلکہ اس کی آنکھوں نے کچھ ایسا دیکھا کہ بے ساختہ منہ سے نکلا، اور پھر نیلم کے کانوں نے ٹرک کا سر پر بجتا ہارن سنا اور واسع کا اونچی گھبرائی سی آواز میں "اللہ اکبر" اور ایک تکلیف دہ سی آہ۔ آواز بلا شک وشبہ واسع کی تھی۔
نیلم کے منہ سے آسمان کو چیرتی سی آواز میں "نہیں" نکلا۔ کمرے کی چھت گول گول گھومنے لگی۔ آواز اس شدت کی تھی کہ نیلم کو لگا اس کی کنپٹیوں سے گرم لہو پھوٹ پڑا ہے۔ دل پوری شدت سے سکڑا تو پھر جیسے پھیلنا ہی بھول گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہی۔
آواز کی تڑپ نے البتہ پورا گھر ہلا ڈالا تھا۔ گھر کی مکمل سکوت بھری خاموشی میں "نہیں" کی ایک آواز نے بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ چہار جانب سے کام میں مصروف عورتیں، مالی، چوکیدار ڈرائیور نگار ایک ساتھ اس کمرے کی طرف دوڑے تھے اور یہاں۔ نگار کا ہاتھ کلیجے پہ پڑا۔ نیلم تیورا کر ان کی آنکھوں کے سامنے نیچے گر پڑی تھی۔

☆☆☆

"ہم معافی چاہتے ہیں۔ آپ کے مریض کی جان ہم نہیں بچا پائے۔" ڈاکٹر نے نہایت تکلیف سے الفاظ ادا کرتے سامنے کھڑے شخص کی طرف دیکھا۔
"آپ انہیں بہت دیر سے لائے۔"

☆☆

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

فرحت جبیں

مہراں دی کمائی

"میں نے کل بھی کہا تھا اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ بند کر یہ کام دھندا۔ لوگ سو سو باتیں بنا رہے ہیں کہ کمالا ایسا بے شرم ہو گیا کہ خود گھر پر پڑا ہے اور مہراں سے کمائی کروا رہا ہے۔" وہ ابھی دروازے سے داخل ہوئی تھی کہ کمالا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھامے آلو پیاز کے تھیلے وہیں دھر دیے اور اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا۔ اسے ابھی ہنڈیا چڑھانا تھی، آٹا گوندھنا تھا۔ کمالے کے لیے دلیہ بنانا تھا۔ یہ سارے کام نبٹا کر کپڑے سلائی کرنا تھے۔ آج اسے راشد باجی کے کپڑے سی کر ہر حال میں دینے تھے اور بجلی تھی کہ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی، کام تھا کہ تعطل کا شکار ہوا جا رہا تھا۔

"تجھے شرم نہیں آتی شوہر کی حکم عدولی کرتے ہوئے؟" وہ اس ڈھیٹ بنی کام میں جتی عورت کو دیکھ کر چارپائی پر پڑے پڑے چلایا تھا۔

"جب پیٹ خالی اور انسان سوالی ہو تو شرم مر جاتی ہے۔

جتنا عرصہ میں نے لوگوں کے در پہ جا جا کر ہاتھ پھیلایا ہے مجھے اپنی اوقات معلوم ہو گئی ہے۔" اس نے سوچا تھا کہ آج اسے بولنے دے گی اور خود خاموش رہے گی لیکن اگر وہ خاموش ہی رہتی تو کمالا کبھی خاموش نہ ہوتا۔ اسی لیے اسے بولنا پڑا۔

"بڑی باتیں آ گئی ہیں۔ بیاہ کر آئی تھی تو زبان نہیں تھی۔"

"اب تو کیا چاہتا ہے کہ میں بھوکی، ننگی اور گونگی بن کر گھر میں پڑی رہوں؟ میں کام بند کر دوں تو گھر اور تیرے علاج کا کیا ہو گا؟ محنت سے کما رہی ہوں کسی سے بھیک نہیں مانگ رہی۔ پھر اس میں کیا حرج ہے؟"

حرج صرف یہی تھا کہ کمالا لوگوں کی باتیں نہیں سہہ سکتا تھا۔ بیوی کی کمائی ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ سال پہلے کمالے سے بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو کمالا اچھا کماتا تھا۔ اس کی سبزی کی ریڑھی تھی جو ٹھیک منافع دے جاتی۔ گھر میں خوشحالی اور خوشی دونوں تھیں لیکن پھر تین ماہ بعد ہی کمالے کی ایک حادثے میں ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ ٹھیلا چلانے سے رہ گیا۔ کچھ رقم جمع شدہ تھی جو اس کے علاج پہ ہی لگ گئی۔ آہستہ آہستہ راشن ختم ہونے لگا۔ گھر کی چیزیں بکنے لگیں۔ جب کچھ بھی نہ بچا تو مہراں نے آگے پیچھے جاننے والوں کے آگے ہاتھ پھیلائے اور دو چار پیسے پکڑ لیے لیکن ایسا کب تک چلنا تھا؟ ہر کسی کی سو ضروریات تھیں اور پھر محلے والے کون سا امیر امراء تھے۔ سب مزدور اور محنتی طبقہ تھا۔ اوپر سے کمالے کے سر پر نہ ماں نہ باپ، مہراں کا اپنا باپ اس کے دس بہن بھائیوں کو پال رہا تھا۔ اب اسے اور اس کے شوہر کو کیسے پالتا؟ تبھی برابر والی خالہ جو اس کے نکاح میں کمالے کی بزرگ بن کر گئی تھیں اسے بٹھا کر سمجھانے لگیں۔

"مرد اگر کمانے کے قابل نہ رہے تو پھر یہ کام عورت کو کرنا پڑتا ہے۔ ہاتھ چلانا۔ ہاتھ پھیلانے سے کہیں بہتر ہے۔" خالہ گھر کے حالات سے بخوبی واقف تھیں۔

"مگر میں آٹھ جماعتیں پاس کیا نوکری کروں؟"

"کمائی صرف پڑھائی کرنے سے ہوتی تو ان پڑھ بھوکوں مرتے۔ کتنے ہی ہنر انسان کا پیٹ پالتے ہیں۔ بس محنت کی عادت ہونا چاہیے۔ کوئی ہنر تو تیرے ہاتھ بھی ہو گا۔" خالہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ بچپن میں وہ پھپھو کے گھر جاتی تو وہ اسے سلائی مشین پر اپنے ساتھ بٹھا لیتیں۔ ان کی دیکھا دیکھی وہ بھی ٹیڑھی میڑھی سلائیاں لگا لیتی تھی۔ پھپھو کہتی تھیں۔

''تو بچپن میں اتنی اچھی سلائی کرنا سیکھ گئی مہراں تو جب جوان ہوگی تو کتنا اچھا کام کرے گی۔''

''خالہ میری پھپھو کہتی تھیں کہ میں بڑی ہوکر سلائی خوب کروں گی۔ کیا خبر یہی میرا ہنر ہو۔'' خالہ نے اپنی بہو سے کہہ کر مہراں کو سلائی سکھانے بٹھادیا۔ پھپھو واقعی جوہری نکلیں کہ انہوں نے ٹھیک ہیرا پہچانا تھا۔ چند ہفتوں میں ہی وہ بہترین سلائی کرنے لگی تھی۔ خالہ ہنس دی۔

''تو تو بنی بنائی دلہن ہے مہراں۔''

اس نے خالہ سے ادھار پر مشین حاصل کرلی۔ گھر کے دروازے پر لکھ کر لگادیا کہ یہاں سستے میں کپڑے سلائی کیے جاتے ہیں۔ کچھ خالہ نے کام لاکر دیا۔ کچھ خود سے آنے لگا۔ وہ سستے میں بہترین کام کرکے دیتی تو عورتیں اس سے کپڑے سلوانے لگیں۔ وہ نت نئے ڈیزائن بنا کر دینے لگی۔ دن رات سلائی مشین چلانے لگی۔

☆☆☆

کمالا پہلے پہل تو خاموشی سے سب دیکھتا رہا لیکن محدود سوچ کے ملنے ملانے والے اس کا ذہن خراب کرنے لگے کہ وہ گھر پر بیٹھا بیوی کی کمائی کھا رہا ہے۔ یہ باتیں کمالے کی برداشت سے باہر تھیں۔

''میں لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتا۔ عورت کمانے کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کام کیلئے مرد ہوتا ہے۔'' وہ اٹھتے بیٹھے اسے ٹوکنے لگا۔ مہران سن لیتی لیکن کام چھوڑ کر نہیں سکتی تھی۔ اسے گھر چلانا تھا۔ عورت ہوکر گھر کا مرد بننا تھا۔ تبھی خالہ نے اس کے کہنے پر کمالے کو سمجھایا۔ وہ کمالے کے لیے ماں جیسی تھیں۔ ان کی باتیں وہ سن کر مان جاتا تھا۔

''لوگوں کے منہ دلیلوں سے بند کیے جاسکتے ہیں کمالے۔ عورت بھی کما سکتی ہے جب مجبوری بن جائے تو۔ کیا ہمارے دین نے عورت کو کمائی سے روکا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی خدیجہؓ تجارت نہیں کرتی تھیں کیا؟ جس کام کی مذہب میں ممانعت نہیں، لوگ کون ہوتے ہیں اس پر بولنے والے۔ اور ہم ایسے لوگوں کی باتوں پر دھیان ہی کیوں دیں۔ جو لوگ باتیں بناتے ہیں۔ وہ دوسروں کا ننگا پیٹ ڈھانپنا نہیں جانتے۔ مہران گھر کی چار دیواری میں عزت سے کمارہی ہے۔ اللہ نے کمائی کو حلال حرام میں بانٹا ہے۔ مرد اور عورت میں نہیں۔ جو بھی حلال کماتا ہے۔ سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔'' کمالے کو خالہ کی باتوں پر چپ سی لگ گئی اور اس کی چپ اس دن ٹوٹی جب اس کے دوست آئے بیٹھے تھے۔ مہراں اس کے لیے چھڑی بنارہی تھی جب اس کے کانوں میں کمالے کی آواز پڑی۔

''جب اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو کمانے سے منع نہیں کیا تو ہم کون ہوتے ہیں؟ محنت کے کسی کام میں عار نہیں ہے۔ مجبوری میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے پھر مہراں تو گھر بیٹھے سلائی کررہی ہے۔''

دوستوں کے جانے کے بعد مہراں کھچڑی لائی تھی۔

''آج تو نے میرے کام پر مان کرکے میرا مان بڑھادیا۔''

''جہالت سے بڑی کوئی گمراہی نہیں اور جب اس کا ادراک ہوجائے تو اسے دور کرلینا چاہیے۔'' مہران نے مسکرا کر کھچڑی کمالے کی جانب بڑھائی جو مطمئن سا اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆

مکمل ناول

گل ارباب

زرد تماشے

اندھیرا، گھپ، اندھیرا اور اسی اندھیرے کے بطن سے جنم لیتی تکلیف دہ آوازیں۔ وہ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر آوازوں کا وار روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آوازیں تھیں کہ مسلسل اس کی سماعتوں کو زخمی کر رہی تھیں۔

''ہائے بے چارہ بدنصیب باپ، آوارہ بیٹی کی وجہ سے مر گیا اس کلموہی نے جانے کس سے منہ کالا کیا اور باپ کو کہیں اور منہ چھپانے کی جگہ نہ ملی تو کفن میں منہ چھپا کر گور میں پناہ ڈھونڈ لی۔'' یہ اس کی پڑوسن کی آواز تھی۔

''کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی باپ نے اس کے لیے، ماں بیٹیاں عیش وعشرت کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اسی باپ کی وجہ سے جس سے اس کو مار ڈالا۔''

''وہ تو غیرت مند تھا۔ جانے بیٹی کس پر گئی ہے، ماں پر ہی گئی ہوگی۔ ماں کو تو دیکھو کیسے لپ اسٹک لگا کر تیار شیار ہوئی بیٹھی ہوئی ہے۔ بھلا بیوہ عورت کو یوں سجنے سنورنے کی اجازت ہے دین میں؟''

''نہیں مسز غازی! آپ تو اس علاقے میں نئی آئی ہیں، میں تو کافی عرصے سے یہیں رہ رہی ہوں یہ بیوہ خاتون بہت عرصہ پہلے ذہنی توازن کھو چکی ہیں۔ سنا یہی ہے کہ شوہر کی دوسری شادی ان کے پاگل پن کی وجہ بنی ہے۔ یہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھیں، اسی لیے شراکت کا دکھ برداشت نہ کر سکیں۔'' اب کی بار سنائی دینے والی آواز بہت ٹھہری ہوئی سی تھی۔

''ہائے بہن! کون سی عورت شوہر سے محبت نہیں کرتی؟ جو نہیں کرتیں، انہیں بھی یہ رشتہ محبت پر مجبور کر دیتا ہے اگر مرد کے پاس مال دولت ہو اور وہ یہ ذمہ داری اٹھا سکے تو اسے دوسری تیسری شادی سے روکنا گناہ ہے۔'' ان خاتون کے شاید شوہر مر چکے تھے۔ اسی لیے تو ایسی بات کی کہ آس پاس والی سہاگنیں انہیں گھورنے لگیں۔

''ارے آپا! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ بھائی جان تو اب دنیا میں نہیں رہے۔ اس لیے آپ اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی ہیں، ان کی زندگی میں یہ سب کچھ کہتیں تو پھر مانتی۔''

ایک منہ پھٹ خاتون نے انہیں چپ کرا ہی دیا۔

''سنا ہے، بیٹی کو کوئی لڑکا پسند تھا اور باپ اس سے شادی نہیں کرانا چاہتا تھا، اسی لیے اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

اور جب پوری رات باہر گزار کر گھر لوٹی تو باپ اس بے عزتی اور بدنامی کے بوجھ تلے دب کر مر چکا تھا۔''

''اف اس نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرنے کی کوشش کی لیکن وہ آوازیں تھیں کہ اس کے سینے پر برچھیاں چلانے پر تلی ہوئی تھیں۔

یکا یک ایک اور بولتا منظر اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا اور وہ اس دیوار سے سر ٹکرا رہی تھی اس منظر کا درد اس کی سماعتوں اور بصارتوں کو اذیت دے رہا تھا۔ تڑپائے جا رہا تھا وہ گھٹے گھٹے سانس لیتے ہوئے بے اختیار کان چھوڑ کر اپنا سینہ ملنے لگی۔

''چلو نکلو اس گھر سے..... یہ گھر میرے شوہر نے میرے نام کر رکھا ہے، اس کی وصیت کے مطابق میں تمہاری ماں کے مرنے تک انتظار کرتی رہی ہوں لیکن آج تمہاری ماں کو مرے ہوئے بھی تین دن ہو چکے ہیں۔ میں نے ہمدردی کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا تیرے جیسی لڑکی پر رحم کھانے سے اچھا ہے کہ رستے میں بھیک مانگتے کسی نشئی کو چار پیسے دے کر اس کی اذیت کم کر دوں۔''

ایک نفرت بھری آواز سنائی دی۔ اس آواز کے کانٹے اسے اپنے جسم میں پیوست ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اذیت، شدید اذیت کا احساس رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اسے لگا جیسے کوئی جادوگرنی اس کے جسم میں طلسمی سوئیاں چبھو رہی ہے اور اس نے اپنے کام کی ابتدا اس کے دل سے کی ہے۔

''ابھی تو ماں کی جدائی کا دکھ اس کے رگ و پے میں خون کی جگہ دوڑ رہا تھا۔ ابھی تو ان کی نرم انگلیوں کا لمس وہ اپنے بالوں میں محسوس کر رہی تھی ابھی تو ان کے جسم کی خوشبو بیڈ کی اس چادر میں بسی ہوئی تھی جس پر وہ سوتی تھیں۔ ابھی تو ان کے تکیے پر چند لمبے ریشمی بال بھی چپکے ہوئے تھے جو وہ لیٹتے ہوئے کھول کر سوتی تھیں۔ وہ جب ان کے سینے سے لگتی یا تو اپنی گردن پر ان کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرتی تھی یا سانسوں کی گرمی۔ ان کے اندر کبھی دھوپ، کبھی بارش کا موسم ہمیشہ رہتا تھا۔

''نکالو اس آوارہ لڑکی کا سامان میرے گھر سے باہر۔ اور اگر یہ شرافت سے نہیں نکلتی تو اسے اٹھا کر گھر سے باہر سڑک پر پھینک دو'' اب اسے اپنی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ تڑپ رہی تھی ایک ایک سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی لیکن مار دینے والے رویے اور نفرت کی آگ میں جلتے ہوئے لہجے اسے اس کی اوقات یاد دلا رہے تھے۔ ''خدا کے لیے اس گھر سے مجھے نہ نکالیں۔ میری ماں کے جسم کی خوشبو اس گھر کی ہر چیز میں بسی ہے۔ ان کی یادوں کو اکیلا چھوڑ کر میں کیسے کہیں اور چلی جاؤں؟'' وہ رو رو کر فریاد کر رہی تھی۔

''تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''تم بہت بری اور آوارہ لڑکی ہو۔''

''میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں۔''

''تمہارا اصلی چہرہ بہت گھناؤنا ہے۔''

پتھر لہجے روح کو زخمی کر رہے تھے۔ پتھروں نے زخم ہی تو دینے ہوتے ہیں۔ بہت بھی نرم ہو جائیں تب بھی مرہم تو نہیں بن سکتے۔

''جاؤ جا کر وہی کانٹو جو ساری زندگی بوتی آئی ہو، نفرت کے کانٹے بونے والے پھولوں کی امید نہیں رکھتے؟'' یہ ساری آوازیں جمع ہو کر اکٹھی اس کی سماعتوں پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ شور سے اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ وہ تکلیف کی شدت سے سسکتی رہی۔ روتی رہی۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیانی وقفے میں اسے اپنی صفائی میں چند ٹوٹے پھوٹے لفظ کہنے تھے لیکن کوئی وہ لفظ نہ سننا چاہتا تھا نہ سچ ماننا چاہتا تھا۔ وہ آنکھیں موندے بے جان وجود کے ساتھ جانے کب اسی گھپ اندھیرے کا حصہ بن چکی تھی۔ طوفان نے کچھ نہ چھوڑا تھا۔ بس اک گہرا سکوت تھا جو اندر باہر پھیلا ہوا تھا۔

☆☆☆

''ہیں آنکھیں میری جگنوؤں کا گھر۔
نزاکتیں بدن کی جیسے تتلیوں کے پر۔
لاکھوں میں کریں ممتاز مجھ کو
تنی ہوئی گردن، اٹھا ہوا سر۔''

سب بیک آواز ہو کر واہ واہ کے ڈونگرے برسانے لگے تھے۔ اور زرتاشہ اجمل خان دل نشیں ادا سے پلکوں کی چلمن رخساروں پر گراتے اٹھاتے اک ہلکی سی مسکان گلابی لبوں پر سجائے ان کی داد کا جواب دے رہی تھی۔

''ویسے مس زرتاشہ! یہ جو ابھی آپ نے اپنی صفات گنوائی ہیں، یہ سب ایک ہی لڑکی میں ہیں یا آپ نے اپنے پورے خاندان کا تعارف ایک ہی شعر میں کرا دیا ہے؟''

یہ منیب آفریدی تھا۔ سارے دوست اسے پالشی کہہ کر چھیڑتے تھے

''سر! اسے کہتے ہیں چیری بلاسم کا صحیح استعمال۔'' یہ اسد تھا جو منیب کا جگری یار تھا۔

''سر ہم سب نے تو اپنے تعارف شعروں میں کرا دیے ہیں اب آپ اپنے بارے میں کوئی ایسا شعر سنا کر تعارف کرائیں کہ جس سے آپ کے بارے میں ہمیں کچھ جاننے کا موقع مل سکے۔''

منیب نے کھڑے ہو کر سب کے جذبات کی ترجمانی کی تو کلاس میں تالیاں بجنے لگیں۔

ایچ او ڈی سر عثمانی کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی جگہ نئے سر کی تعیناتی ہوئی تھی اور سب نے شکر کیا تھا کہ پڑھائی کے دوران عثمانی صاحب کی ماتھی جگتوں پر زبردستی ہنسنے کی مشقت سے جان چھوٹ گئی تھی۔

کچھ دیر پہلے ایک خوبصورت اونچا، لمبا لڑکا کلاس میں داخل ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ایمل خان ہے ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ اور ایک بہترین استاد۔ اور جب اس نے بتایا تو سب کو خوش گوار سی حیرت ہوئی۔

''سر! آپ یونی کے سب سے ینگ ٹیچر ہیں اس لیے آپ سے ہم روایتی انداز کی پڑھائی کی توقع نہیں رکھتے۔'' اسد کی بات پر وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں کلاس میں ناچتے گاتے ہوئے پڑھاؤں لیکن میری کوشش ہوگی کہ جدت کے ساتھ پرانی روایات کو بھی ساتھ لے کر چلوں۔'' وہ اپنے بھورے بالوں میں انگلیاں ڈال کر شاید سنوار رہا تھا لیکن سیدھے سلکی بال اس طرح مزید بکھر رہے تھے۔

پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

''میرا نام ایمل خان ہے، ایک بڑے اچھے تعلیمی بیک گراؤنڈ رکھنے والے خاندان سے میرا تعلق ہے۔ ہم دو ہی بھائی ہیں۔ بہن کوئی نہیں، اس لیے ہر لڑکی میں بہن کا پرتو نظر آتا ہے۔''

ساری کلاس متاثر نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے متاثرین کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں باہر سے پڑھ کر آیا ہوں اور پڑھانا فقط میرا روزگار نہیں۔ نہ ہی صرف شوق ہے بلکہ علم کی روشنی پھیلانا میری زندگی کا مشن ہے۔'' وہ رکا۔

''چلیں، یہ تو ہو گیا میرا تعارف۔ اب آپ لوگ اپنا تعارف کروائیں۔''

وہ خاموش ہوا تو سب ہی باری باری اٹھ کر اپنے بارے میں بتانے لگے۔

''آپ سب کا تعارف مکمل ہوا لیکن ایک

تعارف نام اور کن تعلیمی اداروں میں پڑھا ہے سے ذرا آگے انسان کے اندر کی کیفیات سے بنی اس کی ذات کا بھی ہوتا ہے، وہ مجھے روایتی انداز سے ہٹ کر ایک شعر میں چاہیے۔''

اس کے کہنے پر سب ہی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''سر! مجھے تو شیر، گیدڑ، بھالو، بندر، کچھ بھی زبانی یاد نہیں۔ ہاں کچھ گانے ضرور یاد ہیں۔'' منیب کی بات پر ایمل مسکرا دیا۔

''کون سے گانے ہمیں بھی تو پتا چلے آپ کے ذوق کا۔'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''منی بدنام ہوئی
کمبخت عشق میں پھنس گئی
اور.....اور عشق کمینہ.....دل بدتمیز''

''نہیں نہیں بس اور رہنے دیں یہ بھی بہت اعلیٰ تعارف ہے آپ کی پرسنالٹی کا۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

''سر! میرا تعارف' میری ماں کی یہ تربیت ہے کہ.....
ایسے رہا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسا چلن چلو کہ زمانہ مثال دے۔''

یہ شزا تھی بہت سادہ اور شرعی پردے کی پابند لڑکی۔

''ماشاءاللہ بہت خوشی ہوئی۔ لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ مرد انہیں دیکھ کر بے اختیار احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔''

ایمل کے اس تبصرے پر خاموشی بیٹھی زرتاشہ اجمل کو یوں لگا جیسے اس کی انسلٹ ہوگئی' ہو جہاں وہ بیٹھی ہو وہاں کسی اور کی تعریف اسے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''صرف لڑکیوں کو کیوں سر؟ لڑکوں کو بھی تو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ عورت اس کی جھکی ہوئی نظروں کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائے۔''

''جی مس! میں اپنی بات پر اب بھی قائم ہوں کہ صرف لڑکیوں کو ایسا ہونا چاہیے۔ کیونکہ میرا ماننا یہ ہے کہ لڑکوں کو اس سے بھی کہیں زیادہ اچھا ہونے کی ضرورت ہے اس لیے کہ وہ سائبان ہوتے ہیں بہنوں، بیٹیوں، بیویوں اور ماؤں کے سروں کے۔ سر پر تنے سائبان میں اگر ایک چھوٹا سا سوراخ بھی ہو تو موسم کے ستم سہنے کے سوا ان خواتین کے پاس دوسرا کوئی رستہ نہیں رہتا۔''

سب اسٹوڈنٹ ایک بار پھر تعریفی انداز میں سر ایمل خان کو دیکھنے لگے اور زرتاشہ کچھ کھسیانی اور لاجواب سی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

''اچھا سر! اب آپ بھی اپنی ذات کے بارے میں کوئی شعر پڑھ کر اپنا تعارف کروائیں۔'' ارسلان نے اسے یاد دلایا تو اک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر سج گئی۔

''آپ سب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کچھ ٹوٹی پھوٹی تک بندی کر لیتا ہوں اور یار لوگ مجھے شاعر کہتے بھی ہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ شعر کہنا اور شاعر بن جانا کوئی آسان کام ہے لیکن اپنے بارے میں لکھی ہوئی اک نظم آپ سب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ عرض کیا ہے کہ.....

ظرف ہے آسمان تو
دل سمندر جیسا ہے
اس عہد میں اک معجزہ ہے
میرا وجود
کہ میرا باہر بھی
میرے اندر جیسا ہے۔''

سب بے ساختہ واہ واہ کرنے لگے سوائے زرتاشہ اجمل خان کے۔ وہ منہ بنائے طنزیہ انداز میں اسے گھورے جا رہی تھی۔ لیکن ایمل خان نے اسے نوٹس نہیں کیا تھا۔ اور یہی بات اسے جلانے کے لیے کافی تھی کہ کوئی ایسا بھی اس کے آس پاس کی دنیا میں موجود ہے جو اسے نظر انداز کر سکتا ہے۔

اس کی انا کا بت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا لیکن وہ اس ٹوٹ پھوٹ کو ایک نرم مسکراہٹ میں چھپائے مسلسل مسکرائے جا رہی تھی۔ اور اس کے آس پاس ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو اس کی مسکراہٹ میں چھپا درد

محسوس کرسکتا۔

☆☆☆

عجیب قسمت لے کر وہ اس دنیا میں آئی تھی،

ماں ہوش وخرد سے بے گانہ نہ جانے کس دنیا میں رہ رہی تھی اور باپ کے لیے کشش کا جہاں وسیع اور خوب تر تھا۔ اسے ایک روتی دھوتی بچی سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

اس طرح بے وقعت ہو کر جینا اس کی مجبوری تھی لیکن اس مجبوری نے اس کے اندر تلخی بھر دی تھی۔ ایسا کڑوا زہر اس کی رگوں میں پھیل چکا تھا کہ اب اس کے اندر بے اختیار یہ زہر کسی اور میں منتقل کرنے کی خواہش پلنے لگی تھی۔ اس کا جی چاہتا' وہ کسی کو ڈس کر زہریلا کردے جب بھی گھر میں جھگڑا ہوتا اور بابا ماں کی توہین کرتے، اس کے اندر اداسی پنجے گاڑ لیتی اور اس دن زرتاشہ کے اندر بے اختیار آگ سی بھڑک اٹھی اور اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے کئی جتن کرنے پڑتے تھے۔

کبھی بازار سے گزرتے ہوئے کسی بھی باپ سے مشابہت رکھنے والے آدمی کو شور مچا کر لوگوں سے مار کھلا دیتی اور خود رونی صورت بنا کر تماشا دیکھتی رہتی۔ کبھی چلتے چلتے کسی ایسے راہگیر سے جان بوجھ کر ٹکراتی جو سفید کلف لگے کاٹن کے سوٹ میں شان سے گردن اٹھائے جارہا ہوتا تھا اور اس طرح ٹکرانے پر پھر اسے وہ بے نقط سناتی کہ بے چارہ اپنا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی معافی مانگ کر جان چھڑاتا۔

اسے اس معصوم معاشرے پر اکثر پیار بھی آجاتا راہ چلتا ہوا کوئی بھی مرد اس کے شور شرابے کو سچ مان کر اچھے بھلے شریف آدمی کو مارنے پیٹنے لگ جاتا تھا، بنا یہ تحقیق کیے کہ مرد قصوروار ہے یا بے قصور۔ بنا یہ سوچے کہ لڑکی بھی جھوٹ بول سکتی ہے یا غلط ہوسکتی ہے۔

پلوشہ اس کے بچپن کی دوست تھی' گھروں کی دیواروں کی بھی آپس میں ایسی محبت تھی کہ کئی برس بیت جانے کے باوجود بھی دیواریں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں وہ بہت سنجیدہ اور مخلص لڑکی تھی اور ہمیشہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ دونوں کے جیکٹس الگ تھے لیکن دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں، اسے وہ ہر بات بتاتی تھی یہاں تک کہ اپنے اندر ہونے والی جنگ کی تفصیل بھی بتاتی۔

وہ اگر اپنے کارنامے پلوشہ کو نہ بتاتی تو اسے کبھی زرتاشہ پر کسی بھی قسم کی دیوانگی کا شک نہ ہوتا کیوں کہ وہ اس کے سامنے بالکل ٹھیک رہتی تھی' بظاہر ہنستی بھی تھی' بولتی بھی تھی اور سمجھ داری کی باتیں بھی کرتی تھی وہ جب اس کی حرکات کے قصے سنتی تو حیرت سے پوچھتی.....

''تم سچ کہہ رہی ہو نا؟'' تو وہ ذرا سا ہنس کر کہتی۔

''میرے مزاج کے دو موسم ہیں۔ شکر کرو کہ تم نے فقط ایک ہی موسم دیکھ رکھا ہے' تم اگر میرے باپ جیسا مرد ہوتیں نا تو میں تمہاری ایسی درگت بناتی کہ ساری زندگی یاد رکھتیں۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم ایک مرد نہیں ہو۔'' پلوشہ اسے سمجھاتی۔

''سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے' تمہاری بد قسمتی یہ ہے کہ ابھی تک تمہارا واسطہ ایک ہی مرد سے پڑا ہے اور وہ مرد تمہارے نقطۂ نظر سے اچھا نہیں ہے۔ ورنہ تو دنیا میں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔'' وہ چپ چاپ اسے دیکھے جاتی۔ ''کچھ تو بولو نا۔'' پلوشہ کو اس کی چپ سے خوف آتا تھا۔

''بس دو لوگ ہی میری ساری دنیا ہیں۔ ایک ماں اور دوسرا باپ۔ ماں تو کھوئی ہوئی ہے کسی نامعلوم دنیا میں..... اور باپ بھی گم ہے ایک بدصورت ترین دنیا میں۔ تو میرے ساتھ الٹا حساب ہوگیا ہے۔ عموماً لوگ دنیا میں گم ہو جاتے ہیں جبکہ میری تو دنیا ہی گم ہوچکی ہے۔ میں باپ کی بدصورت دنیا ڈھونڈ کر اسے آگ لگانا چاہتی ہوں لیکن میری رسائی وہاں تک نہیں ہے لیکن اس بدصورت دنیا کی بدنما مخلوق جیسی جو مخلوق مجھے نظر آتی ہے' میں اسے

جلانے کی بھرپور کوشش کرتی رہتی ہوں۔ اس کوشش میں میرے ہاتھ جل بھی جائیں تو پرواہ نہیں۔''
پلوشہ افسوس سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔

☆☆☆

حسنہ، اجمل خان کی پہلی بیوی تھی جو چچازاد اور بچپن کی منگیتر بھی تھی' زرتاشہ۔ حسنہ اور اجمل خان کی بیٹی تھی۔ شادی کے دوسرے سال زرتاشہ کی پیدائش کے فوراً بعد ہی حسنہ اور اجمل خان کو بتا دیا گیا تھا کہ ڈلیوری کے دوران کچھ پیچیدہ مسائل سے نجات کے لیے اس کا ایک آپریشن کرنا پڑے گا اور اس کے بعد وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی' ماں اور بچے کی جان بچانے کے لیے ان کو دل پر بھاری پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑا اور یوں اجمل خان کی نظروں میں حسنہ بیگم کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بالآخر بالکل ہی ختم ہوگئی تھی۔

''خان جی! میں آپ کے انتظار میں کب سے بھوکی بیٹھی ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ کھانا کھا کر آیا ہوں؟'' حسنہ کی خوبصورت آنکھوں میں افسوس نمی کی صورت چمکنے لگا تھا۔ اجمل خان نے اسے عجیب سے انداز میں گھورا۔

''میں نے تمہارے پاؤں پکڑے تھے کہ بھوکی بیٹھی رہو؟ کیا نہیں ہے اس گھر میں۔ ہر نعمت تو لا کر دی ہوئی ہے تمہیں' پھر بھی ہر وقت ناشکری کرتی رہتی ہو۔'' اس کا لہجہ سینے کو چیر کر دل مٹھی میں بھینچنے والا تھا۔ حسنہ کے جسم سے جیسے کسی نے روح کھینچ کر نکال لی تھی۔

''آپ کو شاید نہ ہو۔ لیکن شادی کے دن ہی یہ طے ہوا تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے بغیر کھانا نہیں کھایا کریں گے۔'' وہ نم لہجے میں بولی تو اجمل خان نے قہر بھری نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

''بھول جاؤ ساری باتیں۔ مرد کی زبان نہ بھی بدلے' دل وقت کے ساتھ ضرور بدل جاتا ہے۔ سمجھ لو کہ میرا دل بدل گیا ہے۔ اب تم بھی اپنے دل کو سمجھا لو۔''

وہ دم بخود سی اسے دیکھے گئی۔

''عورت کا دل نہیں بدلتا خان جی! بس مرد کے دل سے اتر کر زندگی بدل جاتی ہے۔ یہ کہیں کہ رانی سے نوکرانی بن جاؤں تو یہ ممکن نہیں ہے میرے لیے اس سے موت زیادہ اچھی ہوگی۔''

''موت مانگنے سے یا چاہنے سے نہیں ملا کرتی اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ مجھے تمہاری یہ فضول باتیں اچھی نہیں لگتیں۔'' اجمل خان کی بات کے جواب میں وہ رو دی۔

''مجھے تو آپ کی باتوں سے جیسے بہت بڑی خوشی مل رہی ہے نا۔ ایک مدت سے کوئی میٹھا بول آپ نے مجھ سے نہیں بولا؟''

''نصیب پر شکر کرنا سیکھو حسنہ بیگم۔'' وہ زہر خند انداز میں ہنسا۔

''نصیب پر تو ہمیشہ شکر کیا ہے' بدنصیبی پر شکر بہت مشکل ہے۔ یہ ولیوں کے بس کی بات ہے۔ میں عام سی انسان ہوں۔''

آثار بتا رہے تھے کہ کچھ ایسا ہے جس نے اسے اتنا بدل دیا تھا۔ لیکن ایسا کیا ہے، وہ کچھ نہ جان پائی تھی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ بیٹی کے وجود میں اپنے لیے سکون اور خوشی ڈھونڈ لے لیکن ابھی اجمل خان کے رویے کا دکھ سہنے کی طاقت خود میں نہیں پا رہی تھی۔ گرمی کی تپتی دوپہروں میں وہ جلتے فرش پر ننگے پاؤں ٹہلتی رہتی۔ کبھی بچی روتے روتے خود ہی چپ ہو جاتی لیکن وہ سوچوں کے جال سے باوجود ہاتھ پاؤں مارنے کے نہ نکل پاتی۔ وہ جیسے خود میں نہیں رہی تھی۔ سارے مردوں کی طرح اسے بھی بیٹوں کی طلب تھی اپنی نسل کی بقا کے لیے۔ اور یہ بات وہ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی۔

''کیا یہ وہی اجمل خان ہے جو میرے بغیر خود کو نامکمل کہتا تھا؟'' وہ خود سے سوال کرتی اور خود ہی جواب نفی میں دیتی۔

دوسری طرف اجمل خان شازمہ بیگم کی سنہری زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔ اس عورت میں ناز و ادا بھی

تھا' عشوہ اور غمزہ بھی۔ وہ محبت سے زیادہ محبت کے عملی اظہار کی قائل تھی۔ اور اس کا اظہار بھی اس کے جذبات کی طرح طوفانی تھا۔ اس کی نظریں اجمل خان کی دولت پر تھیں۔

شازمہ بیگم نے شرط رکھی کہ..... وہ اس صورت میں اجمل خان سے شادی کرسکتی ہے جب وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر اس کے پاس آئے گا۔ اجمل خان نے اس کی ہر شرط منظور کرلی لیکن بیوی کو طلاق دینے والی بات پر وہ راضی نہ ہوا۔ شاید اس کے دل میں کہیں اب بھی حسنہ کے لیے نرم گوشہ باقی تھا۔ لیکن شازمہ کو اس نے یہ کہہ کر راضی کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو در بدر نہیں کرسکتا۔

اس نے کوٹھی، بنگلہ، نقدی، زیورات جو بھی مانگا اجمل خان نے بخوشی اس کے نام کردیا۔ وہ بھی یہ سوچ کر چپ رہ گئی کہ ایک بار شادی ہوجائے پھر وہ حسنہ بیگم کو یوں اجمل خان کی زندگی سے نکال دے گی جیسے دودھ سے مکھی۔ ایک تو عورت حسین، دوسرا اس میں ناز و ادا اور نخرہ بھی ہو۔ تو مرد اس عورت کا دیوانہ ہو ہی جاتا ہے۔ شازمہ اس کی دیوانگی سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ دوسری طرف حسنہ دن بھر خدشات سے لڑتی اور راتیں آنکھوں میں کاٹتی۔ وقت گزر رہا تھا کہ تب ہی ایک دن اس نے آ کر دھماکا کردیا تھا۔

''یہ تم..... تم کیا کہہ رہے ہو اجمل خان!''

''میں نے شازمہ سے شادی کرلی ہے اور ہم دو دن بعد ہنی مون کے لیے ملائیشیا جارہے ہیں۔''

اس کے لہجے میں اتنا سکون' اتنا اطمینان تھا کہ جیسے روزمرہ کی کوئی عام سی بات اسے بتا رہا ہو۔

''مگر میرا قصور کیا ہے؟'' حسنہ اب بھی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی وہ جب محبت کے جیتے جاگتے روپ میں اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا سوائے اپنے ایک چھوٹے سے گھر کے لیکن ان دو ڈھائی سالوں میں راتوں رات اس کے کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ دولت کی ریل پیل ہوگئی بلکہ وہ سچ مچ دولت میں کھیلنے لگا تھا۔

''مجھے اس دولت اور جائیداد کا وارث چاہیے تھا جو تم مجھے نہیں دے سکتیں۔ تم یہ حقیقت تسلیم کرلو کہ حسنہ بیگم! تم فقط ایک خوش رنگ کاغذی پھول ہو جس میں خوشبو ہے نہ لطافت۔ مجھے اپنا نام زندہ رکھنے کے لیے بیٹا چاہیے میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ دوسری شادی کرلوں۔'' وہ سسکنے لگی۔

''اجمل خان! تم نے تو مجھ سے محبت کے دعوے کیے تھے۔ وہ سنہری خواب میری آنکھوں دہلیز پر اب بھی تعبیروں کے منتظر ہیں۔ کیا میری آنکھوں میں وہ سحر باقی نہیں رہا جس کا ذکر تم اکثر کرتے رہتے تھے۔ تم جو کہتے تھے کہ میں تمہاری ان مسکراتی آنکھوں کا رسیا ہوں' اب خود ہی ان آنکھوں میں بے وفائی کا درد جگا رہے ہو۔ کیا تم نے سب کچھ بھلا دیا ہے؟''

''نہیں۔ بھولا تو کچھ بھی نہیں۔ میں آج بھی یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تم میری پہلی محبت ہو لیکن کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ پہلی محبت ہی آخری محبت بھی ہو۔ یہ جو میرے چہرے پر سکون اور آسودگی نظر آرہی ہے یہ میری بیوی شازمہ کی بدولت ہے جو میری دوسری اور آخری محبت ہے کیونکہ اس نے مجھے محبت کے علاوہ وارث دے کر ہمیشہ کے لیے میرے دل میں اپنا مقام محفوظ کرنا ہے۔''

وہ اس کی پرسکون انداز میں کی گئی دوسری عورت کی تعریف سن کر جل کر کوئلہ ہوگئی تھی تب ہی تو اتنا کچھ سن کر ضبط کا یارا نہ رہا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی اس کی گود میں لیٹی ننھی سی زرتاشہ بھی شاید سمجھ گئی تھی کہ ماں اس وقت درد کی کڑی منزل سے گزر رہی ہے' اسی لیے تو وہ خلاف معمول کئی کئی گھنٹے چپ چاپ لیٹی رہتی۔ نہ روتی نہ احتجاج کرتی نہ بھوک کی شدت سے تڑپ تڑپ کر اسے پکارتی، بس پاگلوں جیسی حرکتیں کرتی ہوئی ماں کی طرف گردن موڑ کر ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی۔

اجمل خان نے دعوا کیا تھا کہ وہ انصاف کرے

گا مگر انصاف آسان نہیں ہوتا۔ یہ تو ازل سے ثابت کر رہا ہے کہ مرد اس توازن کو برقرار نہیں رکھ پاتا اجمل خان بھی اس معاشرے کے مردوں کی طرح ایک عام سا مرد تھا۔ وہ کسی صورت انصاف کے تقاضے پورے نہ کر سکا' وہ اپنی نئی بیوی شازمہ کے ساتھ بہت خوش تھا' اتنا خوش کہ وہ حسنہ اور زرتاشہ دونوں کو بھول چکا تھا اور خوش کیوں نہ ہوتا کہ شازمہ شادی کے چند سالوں میں ہی اس کے دو بیٹوں کی ماں بن چکی تھی۔

زرتاشہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی۔ ماں کا درد سمجھ رہی تھی۔ مہینے میں ایک آدھ بار جب بھی اجمل خان گھر آتا تو گھر میں گھمسان کا رن ضرور پڑتا' نوبت مار کٹائی تک آجاتی۔ اجمل خان بیوی پر ہاتھ اٹھاتا اور کانوں پر دونوں ہاتھ سختی سے رکھ کر بھی زرتاشہ ماں کی چیخوں کے کوڑوں سے اپنی روح کو نہ بچا پاتی۔

وہ باپ کو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ اس کی ساری ضرورتیں بلکہ عیاشیاں بھی وہی پوری کرتا تھا۔ بڑی بڑی گاڑیاں، ڈرائیور، بینک بیلنس، اعلا تعلیمی اداروں میں تعلیم کا خرچا اور ہر طرح کی پر آسائش زندگی وہ اس کا حق سمجھ کر نہیں دے رہا تھا بلکہ ہر دفعہ اس پر احسان جتانا خود بھی یاد رکھتا اور اسے بھی یہ سبق دہرانے کا حکم جاری کر جاتا تھا

''یہ میری اعلا ظرفی ہے کہ میں اک نافرمان عورت کے کیے کی سزا تمہیں نہیں دے رہا ورنہ تو نئی زندگی میں مجھے کسی قسم کی کمی نہیں ہے کہ میں تم لوگوں کے خرچے پورے کرنے ادھر آؤں۔ جا کر دیکھو کہ دوسری شادی اور بیٹوں کی پیدائش کے بعد کوئی شوہر بیوی یا بیٹی کی خبر نہیں لیتا لیکن میں یہ سب خدا کے خوف سے کرتا ہوں کہ روز محشر کہیں میں تم لوگوں کا دیون ہار نہ اٹھایا جاؤں۔ تم دیکھ لو، میں ہر مہینے کتنی پابندی سے ایک دفعہ ضرور آتا ہوں۔'' باپ کا اک اک لفظ ذلت آمیز اسے یہ احساس ذلت مار دیتا تھا۔ وہ دل سے ماں کے ساتھ تھی لیکن باپ کے سامنے خود کو ان کے حق میں ظاہر کرنا اس کی مجبوری تھی۔

''تم تو وہ بدقسمت عورت ہو کہ تمہاری اکلوتی اولاد بھی تمہاری نہیں ہے بلکہ میری طرف دار ہے۔'' یہ طعنہ حسنہ کے دل پر یوں کند چھری پھیرتا کہ وہ تڑپ تڑپ جاتی تھی۔ وہ خود سے بے خبر تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ دل پر چلائی گئی چھریوں سے اسے تکلیف نہ ہوتی۔

''بابا! آپ فکر نہ کریں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مما تو میٹلی ڈسٹرب ہیں۔ ایسے لوگ رحم کے قابل ہوتے ہیں، نفرت کے نہیں' آپ بھی رحم ہی تو کھاتے ہیں اور وہ اپنے جنون میں محبت مانگتی ہیں۔''

''پگلی ہیں اس لیے نہیں جانتیں کہ محبت ان جیسی عورتوں کا مقدر نہیں ہوتی' وہ تو بیٹوں کی ماؤں کے سر پر تاج کی طرح سجائی جاتی ہے دل کی ملکہ تو وہی عورت ہوتی ہے جو شہزادوں کو جنم دیتی ہے۔''

وہ جب بھی ماں باپ کے درمیان موجود رشتے کے بارے میں اور پھر اپنی بے حیثیت زندگی کے بارے میں سوچتی تو درد سے اس کے سر کی رگیں پھٹنے لگتیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا اور ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنے غصے کو باہر نکال کر خود کو پرسکون کرے لیکن وہ غصہ نکالتی بھی تو کس پر؟ اپنی محبت کرنے والی اس پگلی ماں پر جو بہت کچھ بھول چکی تھی۔ لیکن اسے یہ یاد تھا کہ اس کی ایک بیٹی ہے اور جو اس کے زندہ رہنے کا واحد سہارا ہے یا باپ پر جو اس پر نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

اسے اپنے باپ سے شدید ترین نفرت محسوس ہوتی تھی۔ اور اسی غصے اور نفرت نے اس کے اندر عجیب سے جذبات بھر دیے تھے جہاں بھی وہ اپنے باپ کی عمر یا حلیے کے آدمی کو دیکھتی اس کے اندر آگ بھڑکنے لگتی تھی اور اس کی پوری کوشش ہوتی کہ اس آدمی کو اذیت پہنچائے' اس کی عزت نفس کو مجروح کرے۔

☆☆☆

وہ باپ کو خوش کرنے کے لیے سوتیلی ماں اور اس کے بچوں سے ملنے کے لیے بھی دل پر پتھر رکھ کر تیار ہو جاتی لیکن شازمہ اور اس کے بچے اتنے ظرف والے نہیں تھے کہ سوتیلے رشتے سے ملنے کے لیے راضی ہوتے سو ان کی آپس میں ملاقات کبھی نہ ہو سکی تھی' ہاں تصاویر وغیرہ وہ دیکھتی رہتی تھی۔

اس دن اجمل خان کے واٹس ایپ اسٹیٹس پر اس کے دونوں بیٹوں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ سینے میں پھنکارتی نفرت کا زہر اپنے باپ، اس کی بیوی اور دونوں بیٹوں کی نس نس میں بھرنا چاہتی تھی لیکن وہ چاروں اس کی پہنچ سے بہت دور تھے۔

''کاش میں تم لوگوں کی زہر سے نیلی صورتیں دیکھ سکوں۔ وہ زہر تقدیر تم لوگوں کی زندگی میں بھر دے جو تقدیر نے میری اور میری مظلوم ماں کی زندگی میں زہر بھرا ہوا ہے۔''

وہ تصویروں پر نظریں جمائے دل ہی دل میں انہیں بددعائیں دے رہی تھی۔

اس نے قریب لیٹی ہوئی دنیا و مافیہا سے بے خبر ماں کی طرف دیکھا اور ایک آہ بھر کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی ٹیبلٹس کو دیکھنے لگی جن کی بدولت وہ بے خبر سو رہی تھی، ماہرین نفسیات کے مطابق حسنہ اپنے کمزور اعصابی نظام کے باعث اپنے ساتھ پیش آنے والی صورت حال کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ ایسی صورت حال میں مضبوط قوت ارادی کے باعث انسان کے ٹھیک ہونے کے چانسز ہوتے ہیں لیکن جب مریض ہی سنبھلنا نہ چاہے تو اسے ٹھیک کرنا یا اس کا علاج کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

''یار! یہاں کی آئس کریم ہی مزے دار ہوتی ہے باقی تو گزارا ہی ہے۔''

وہ پلوشہ کے ساتھ ریسٹورنٹ آئی ہوئی تھی' آئس کریم کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھا کہ دو جوان لڑکے درمیانی عمر کی اک فیشن ایبل اور طرح دار عورت کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور ان کے ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ زرتاشہ نے اک سرسری سی نظر ان پر ڈالی اور پھر ان مانوس چہروں سے اس کی نظروں نے ہٹنے سے انکار کر دیا۔

''میرے پیچھے دیکھو پلوشہ! یہ دونوں میرے باپ کے بیٹے ہیں اور یہ ان کی دوسری بیوی ہے۔''

اس کے زہریلے لہجے نے پلوشہ کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''بہت غیر اخلاقی حرکت ہوگی کہ میں انہیں مڑ کر دیکھوں۔ اور تم بھی مت دیکھو' جب تمہیں انہیں دیکھنے سے تکلیف ہو رہی ہے تو دفع کرو۔''

پلوشہ اس کی فطرت اور ان سوتیلے رشتوں کے لیے اس کی نفرت سے اچھی طرح واقف تھی' اسی لیے اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات اسے اکسا رہے تھے کہ جتنا جلدی ہو سکے' ادھر سے نکلنے کی کرے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے نکلتی زرتاشہ کے سازشی دماغ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کا اک منصوبہ بنا لیا تھا۔

زرتاشہ نے اپنی انگلی میں سجی ہوئی قیمتی ڈائمنڈ کی انگوٹھی کی طرف اک نظر دیکھا۔ پاس رکھا موبائل فون اٹھایا اور انگوٹھی کی ایک تصویر بنا کر پلوشہ کو آنکھ مارتے ہوئے اٹھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' پلوشہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''ڈرو نہیں بزدل لڑکی! واش روم جا رہی ہوں۔''

اس سوال کے جواب میں اک زہر خند مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

اس کے ڈرپوک باپ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنی من پسند بیوی کو اپنی اکلوتی بیٹی کی تصویر دکھا کر یہ کہہ سکے کہ ''دیکھو' میری بیٹی کس قدر پیاری ہے۔''

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی شازمہ بیگم کی

ٹیبل کے قریب پہنچ گئی اور اچانک سر پکڑ کر لہراتے ہوئے گرنے لگی، بالکل غیر اختیاری طور پر شازمہ بیگم کے بڑے بیٹے احسن نے تیزی سے اٹھ کر اسے دونوں بازوؤں میں تھام کر گرنے سے بچایا جبکہ باقی سب لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

''اوہ سوری! مجھے چکر سا آ گیا تھا۔'' زرتاشہ نے خود کو سنبھالنے کی اداکاری کرتے ہوئے احسن اجمل خان کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنی میز پر آ گئی۔ اس دوران شازمہ بیگم سے بھی ایک اجنبی سی مسکراہٹ کا تبادلہ ہو چکا تھا۔

سنہرے سیدھے بالوں اور سرخ و سفید رنگت والے اس لڑکے نے بڑے احترام سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو زیادہ مسئلہ ہے تو میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں سسٹر!'' وہ لفظ سسٹر پر بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول رکھ پائی ورنہ تو اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ لفظ واپس اس کے منہ پر مار کر کہے۔

''مجھے نہیں چاہیے ایسا بھائی جس کی قیمت میری ماں کے سکھ اور خوشیوں سے چکائی گئی ہو۔'' لیکن وہ بنا کچھ کہے اک شکر گزار مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھ چکی تھی۔

پلوشہ نے اس کی خالی انگلی کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''تمہاری انگوٹھی کدھر ہے؟'' وہ ہنس دی۔

''وہی تو جال ہے سنہری مچھلیوں کو گھیرنے کا اور ان کی حالت سے لطف اٹھانے کا۔ بس تم دیکھتی جاؤ۔''

''ارے میری انگوٹھی نہیں ہے۔'' اس نے پل بھر میں اک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ ''ڈھائی لاکھ کا ڈائمنڈ جڑا ہوا ہے اس انگوٹھی میں اور ابھی میز سے اٹھتے ہوئے وہ انگوٹھی میری انگلی میں تھی۔''

انتظامیہ اور ہال میں موجود لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ مختلف میزوں سے سرگوشیاں بھنبھناہٹ کی صورت سماعتوں پر دستک دے رہی تھیں۔ پلوشہ ساکت بیٹھی سب دیکھ رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس جگہ انگوٹھی میری انگلی سے گر گئی تھی اور آس پاس والوں میں سے کسی نے اٹھالی ہے۔ یہ میز قریب ترین ہے۔ پلیز پہلے ان کی تلاشی لیں۔

اس نے انتظامیہ کے دو تین سوٹڈ بوٹڈ بندوں کی طرف دیکھتے ہوئے شازمہ اور اس کے دونوں بچوں والی میز کی طرف اشارہ کیا تو ان سب کی شکلیں احساس توہین سے سرخ پڑ گئیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے کیا اتنے بڑے ریسٹورنٹ میں عزت دار لوگ پیسے دے کر اپنی بے عزتی کروانے آتے ہیں؟''

''سوری میم! یہ ہماری نیک نامی کا معاملہ ہے، ہمارا سارا عملہ تلاشی دینے پر تیار ہے لیکن جن صاحبہ کی قیمتی انگوٹھی کھوئی ہے وہ آپ لوگوں کی تلاشی کا مطالبہ کر رہی ہیں اور ہمارے لیے ہمارا ہر کسٹمر اہم اور قیمتی ہے، ہم نہایت مؤدبانہ انداز میں آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم آپ تلاشی دے دیں۔''

منیجر کی درخواست اور تمہید نے شازمہ بیگم کے تن من میں جیسے آگ بھڑکا دی تھی۔ انہوں نے گھور کر اس اسمارٹ اور پراعتماد سی لڑکی کی طرف دیکھا اور اپنا پرس ان کے سامنے رکھ دیا آس پاس کے لوگ مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔

''چوکور فریم میں ڈائمنڈ لگا ہوا ہے۔'' اس نے شازمہ بیگم کے پرس کی تلاشی کے بعد چھوٹے کی جیبوں کی تلاشی لیتے ویٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہی ہے میری انگوٹھی۔'' اس نے حسن کی جیب سے نکلی انگوٹھی پر جھپٹتے ہوئے کہا تو احساس توہین سے جلتے ہوئے چہروں کی رنگت فق ہو گئی۔

پلوشہ نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اسے ملامتی انداز میں دیکھا مگر وہ تو بطور ثبوت اپنے موبائل میں لی گئی چند منٹ پہلے والی تصویر دکھانے میں مصروف تھی۔ انتظامیہ اور ریسٹورنٹ میں بیٹھے

کسٹمرز کی طنزیہ مسکراہٹیں اور ملامت آمیز نظریں شازمہ بیگم اور ان کے بچوں کے جسموں میں تیروں کی طرح چبھ رہی تھیں۔

''مما! مجھے نہیں پتا کہ یہ انگوٹھی کس نے میری جیب میں رکھی ہے۔'' وہ اب بھی بے یقین نظروں سے کبھی انگوٹھی کی طرف دیکھ رہا تھا کبھی ماں کی طرف۔

''میم! کیا آپ پولیس میں رپورٹ کرنا چاہتی ہیں؟'' منیجر کے اس سوال نے شازمہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔

''یہ لوگ مجھے شکل سے خاندانی لگ رہے ہیں اس لیے میں انہیں ایک موقع دینا چاہتی ہوں لیکن معاف کرنا بھی مناسب نہیں' چوری کی سزا تو انہیں ضرور ملنی چاہیے تاکہ آئندہ کے لیے سبق مل جائے۔ بڑے خاندانوں میں کچھ ایسے چور پیدا ہو جاتے ہیں جو والدین کے لیے اور سارے خاندان کے لیے باعث شرمندگی ہوتے ہیں۔'' اس کی چبھتی ہوئی نظروں اور طنزیہ لہجے سے شازمہ بیگم کے اندر آگ لگی ہوئی تھی لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔

''کیا قیمت ہے اس انگوٹھی کی؟'' شازمہ بیگم نے اپنے پرس سے چیک بک نکالتے ہوئے رعونت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ ریشمی بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے جوڑا بنا کر بڑے اطمینان سے کرسی پر ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھ کر بیٹھ چکی تھی۔ شازمہ بیگم کے سوال پر وہ اسے انگوٹھی دکھاتے ہوئے بولی۔

''یہ انگوٹھی ڈھائی لاکھ کی ہے۔ اس کی قیمت چکانا آپ پر جرمانہ ہو گیا ویسے یہ سب سے چھوٹی سزا ہے۔''

شازمہ بیگم نے چیک لکھ کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور ساکت سے کھڑے بڑے بیٹے کا ہاتھ تھامے باہر نکل گئی۔

''یاہو۔'' اس نے چیک پکڑ کر دل ہی دل میں اک مسرت بھرا نعرہ لگایا۔

''اف ان کی شرم سے لال پڑتی شکلیں۔'' وہ مزے لے کر وہ آئس کریم کھاتی جا رہی تھی جو ویٹر ابھی ابھی ان کی ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ اس نے ٹیبل پر رکھے گئے چیک کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے باپ کا مال ہے۔ میری ماں کے پاس تو نہ کوئی چیک بک ہے اور نہ ہی کوئی اکاؤنٹ۔ جبکہ ایک معمولی سی عورت آج اسی پیسے کے بل بوتے پر بیگم صاحبہ بنی پھر رہی ہے۔''

غصے میں بھری پلوشہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کس طرح ملامت کرتی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔

''زرتاشہ اجمل خان! تم اس حد تک گر جاؤ گی یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔'' پلوشہ نے اسے ملامتی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبا کر چپکی۔

''ارے میری جان ابھی سے گھبرا گئی ہو؟ یہ تو ابتدا ہے، انتہا تک تو تماشا تمہیں دیکھنا ہی پڑے گا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے میں شدید نفرت کرتی ہوں اور محبت اور جنگ میں سب کچھ میں نے تو جائز نہیں کیا بلکہ مجھ سے پہلے والوں نے کیا ہوا ہے۔''

''معاف کرنا تمہیں آئینہ نہ دکھایا تو دوستی کے نام پر دھبہ لگ جائے گا۔ دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کے عیب منہ پر بتانے کی ہمت رکھتا ہو۔ زرتاشہ! میں تمہاری سگی بہن نہیں ہوں نہ میرا تم سے خون کا کوئی رشتہ ہے، میں فقط اک دوست کی حیثیت سے تمہارے ساتھ رہی اور جب تک برداشت کر سکتی تھی کر لیا۔ اب میں مزید تمہیں دوسروں کی عزت سے کھیلتے نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ واقعی بہت غصے میں تھی۔

''تم اپنا علاج کراؤ اور جب آنٹی کو لے کر جاؤ تو کسی اچھے سے نفسیات کے ڈاکٹر کے پاس خود بھی چلی جانا۔ مجھے لگتا ہے' تمہیں عام انسانوں کے درمیان چھوڑنا ایسا ہے جیسے چڑیا گھر میں کسی

خطرناک جانور کو پنجرہ کھول کر انسانوں کے درمیان چھوڑ دیا جائے۔'' اس کا لہجہ اور الفاظ دونوں بہت تلخ تھے۔ وہ بیگ کندھے پر ڈال کر باہر نکل گئی۔ زرتاشہ چپ چاپ دور تک اسے جاتا دیکھتی رہی' اس کی بے تاثر آنکھوں میں نہ کوئی شرمندگی تھی اور نہ ہی دکھ کی کوئی رمق۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پلوشہ کی یہ ناراضی چند دنوں کی ہے' ایک آدھ دن میں وہ خود آکر کہے گی۔

''بس یار! اس دفعہ بنا معافی مانگے معاف کر دیتی ہوں لیکن اگلی بار ایسا سوچنا بھی نہیں۔''

وہ پرس اٹھا کر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل آئی' باہر ڈرائیور اس کا منتظر کھڑا تھا۔

☆☆☆

''یار! سر ایمل خان کی اچھی نیچر اور کردار کے چرچے تو ساری یونی میں پھیل چکے ہیں۔''

پلوشہ کے کہنے پر اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

''ہاں' تم جیسی لڑکیوں نے ہی اسے مشہور کر رکھا ہے۔'' پلوشہ نے اسے گھورا۔

''کیا مطلب مجھ جیسی لڑکیاں؟'' چند گھنٹوں پہلے ہی ان کی صلح ہوئی تھی اور پلوشہ کو لگ رہا تھا کہ یہ صلح آج ہی لڑائی میں بدلنے والی ہے۔

''جب بہت سے لوگ کسی ایک انسان کی تعریف متفقہ طور پر کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندے میں دم ہے۔'' پلوشہ اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے سر ایمل خان کی تعریف و توصیف میں مگن تھی۔

میں تو ان کے متاثرین میں کبھی بھی شامل نہیں رہی اور نہ تم لوگوں نے کبھی میری زبان سے ان کی تعریف کا کوئی لفظ سنا ہوگا حالانکہ وہ میرے ٹیچر بھی ہیں۔''

حبہ اور نایاب نے اس کی بات سن کر پلوشہ کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔

''یار! یہ کیا بچپنا ہے تم میں؟ سب ہی فرینڈز تم پر شک کر رہی ہیں کہ تم سر ایمل میں دلچسپی لے رہی ہو اور وہ تمہیں نظر انداز کر رہے ہیں جو تمہاری برداشت سے باہر ہے سو اسی لیے اپنا غبار ان کے خلاف بول کر نکال رہی ہو۔'' پلوشہ نے صاف گوئی سے کہا لڑکیوں کی باتیں سن کر وہ کب سے یہ موقع ڈھونڈ رہی تھی کہ اس کے ساتھ دوٹوک بات کرے کیونکہ وہ اس کی سچی دوست تھی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم پلوشہ بیگم! مجھے اس عام سے شخص میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ساری یونی یہ بات جانتی ہے کہ میں کسی کو منہ نہیں لگاتی۔'' وہ بہت غصے میں تھی۔

پلوشہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔

''پلیز زرتاشہ! اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے یوں تماشا نہ بناؤ۔ چھوڑ دو اس شخص کا پیچھا۔''

وہ جواباً غصیلی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

''میں تو اس کا ذکر بھی پسند نہیں کرتی لیکن جہاں بیٹھو اس کے قصیدے سننے کو ملتے ہیں۔''

ہر کسی کے ساتھ تمہارا پنگا لینا ضروری تو نہیں ہے اگر کسی کی اچھائی برداشت نہیں کر سکتیں تو وہاں سے چپ چاپ اٹھ جایا کرو۔'' وہ برا سا منہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

''اچھا تو سر! یہ بتائیں کہ آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

منیب نے کلاس میں اتنا اچانک یہ سوال پوچھا تھا کہ وہ چند پل کے لیے تو ساکت سا اسے دیکھنے لگا۔

''سر! ہم جانتے ہیں بہت سی لڑکیوں نے آپ کے خواب آنکھوں میں سجا رکھے ہیں۔''

ارسلان کے لہجے میں شوخی تھی۔ ایمل خان نے اب کلاس میں دوستانہ ماحول رکھنے کا نقصان دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اسی لیے

تو سب کے ساتھ دوستانہ انداز اپنائے رکھتا تھا۔

''پہلے تو یہ کہ آپ کی پہنچ لڑکیوں کے خوابوں تک کیسے ہوگئی؟ دوسرا یہ کہ میرے خیال میں تعلیمی اداروں میں پڑھنے یا پڑھانے سے آگے کی بات سوچنا بھی میری نظر میں گناہ ہے۔'' سب ہی اس کے خلاف توقع جواب پر چپ تھے۔

''سوری سر! میں اس معاملے میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔'' اب کی بار پھر منیب بولا تھا۔

''ایمل خان اپنی شان دار شخصیت کے سحر سے اچھی طرح واقف تھا، اسی لیے تو خاص طور پر اسٹوڈنٹس لڑکیوں کے ساتھ بہت ہی مشفقانہ رویہ رکھتا اور اپنے سے چند سال ہی چھوٹی لڑکیوں کو دانستہ بیٹا بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا کہ کسی طرح کی غلط فہمی یا خوش فہمی سے ان نادان لڑکیوں کے دلوں میں امید کی کونپلیں نہ پھوٹنے لگیں۔

''سر! آپ کی سوچ بچار سے تو لگ رہا ہے کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گمبھیر ہے۔'' وہ اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''مجھے لگتا ہے، آپ جواب سنے بغیر ٹلنے والے نہیں ہیں تو چلیں، آج اس موضوع پر بھی کچھ بات کر لیتے ہیں۔ سچ کہوں تو مجھے آج تک ایسی لڑکی نظر ہی نہیں آئی جس کے لیے میرے دل میں چند پل ٹھہر کر اسے دوبارہ دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی ہو۔ اگر میں کسی سے متاثر ہوتا تو مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ ببانگ دہل سب کے سامنے اعتراف کر لیتا۔ شاید کبھی ایسی کوئی لڑکی مل ہی جائے لیکن فی الحال تو دور دور تک امکانات نہیں ہیں۔''

وہ بات ختم کرتے ہوئے اٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں ڈال کر بیگ کی زپ بند کر رہا تھا کہ زرتاشہ اجمل خان کھڑی ہوگئی۔

''سر! سوائے میرے یہاں تقریباً ہر لڑکی یہ جاننے میں دلچسپی رکھتی ہے کہ آپ کو کس قسم کی لڑکی کی تلاش ہے؟'' زرتاشہ کے ماتھے پر پڑے بل اور چہرے پر پھیلی رعونت نے ایمل خان کو چونکا دیا۔ وہ فوری احساس توہین سے تپ کر بنا سوچے بے ساختہ بول پڑا۔

''سوری مس زرتاشہ! مجھے جیسی بھی لڑکی کی تلاش ہو مگر وہ آپ جیسی ہرگز نہیں ہوگی۔''

اس جملے کی تلخی اور چبھن بولنے کے بعد ایمل خان کے ساتھ ساتھ ساری کلاس کو بھی محسوس ہو چکی تھی۔ تیر اور وہ بھی زہر میں بجھا ہوا سیدھا زرتاشہ اجمل خان کے دل پر لگا تھا۔ وہ اپنے گالوں کی زردیوں اور آنکھوں کی کرب ناک حیرتوں کو اوروں سے چھپا گئی اور نازک ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیلائے ایمل خان کو تکتے ہوئے نارمل لہجے میں بولنے لگی۔

''سر! آپ بے شک بہت پر اعتماد انسان ہوں گے لیکن خود کو ہمیشہ اپنی نظر سے دیکھنے کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی خود کو مقابل کی نظر سے دیکھ کر اپنے بارے میں فیصلہ کیجیے۔ میری نظر میں آپ ایک اچھے استاد ضرور ہیں لیکن باقی کوئی دوسری خوبی آپ میں مجھے نظر نہیں آئی یا شاید مجھے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

''اس کے پرسکون لہجے نے سب کو بتا دیا کہ لڑائی چیخ چیخ کر گالیاں دینے کا نام نہیں بلکہ تلخ جملے میٹھے لہجے میں بھی لپیٹ کر مارے جا سکتے ہیں۔ اس وقت متغیر رنگت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ایمل خان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ اور اب اسے بہت کچھ بھگتنا پڑے گا۔

☆☆☆

ماں کے الجھے ہوئے بالوں میں تیل کی مالش کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایمل خان سے انتقام لینے کے مختلف پروگرام بن اور بگڑ رہے تھے۔

''ماں! کبھی کبھی میں سوچتی ہوں میرے اندر تمہاری توہین سے جلنے والے انتقام کے شعلے کہیں ساری دنیا کو جلا نہ دیں، جانے کیسی آگ ہے جو ٹھنڈی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بس دعا کرنا کہ

بدلے کی یہ آگ تمہاری بیٹی کو راکھ نہ کر دے۔ آگ سے کھیلنے والے کبھی کبھی خود بھی بری طرح جل جاتے ہیں ناں۔''

''ماں! آپ کو اب بھی بابا سے محبت ہے؟''

اس نے حسنہ کے گھنے بالوں کی چٹیا بناتے ہوئے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ آج بہت دنوں بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تھی اور اس نے خود کہا تھا کہ میرے بالوں میں تیل کی مالش کر دو۔ ایسے لمحات اس کی زندگی میں بہت کم آتے تھے جب ماں پورے ہوش وحواس میں رہ کر اس کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔ آج بھی ایسے ہی اک لمحے میں اس کے سوال پر وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے اک آہ بھر کر بولی۔

''مجھے اب اس سے وہ محبت نہیں ہے جو بے وفائی سے پہلے تھی لیکن کبھی کبھی اکیلے میں خود سے سوال کرتی ہوں کہ رات دن کیوں انگاروں پر لوٹتی رہتی ہوں؟ کیوں اتنا درد ہوتا ہے کہ اپنا وجود ایک سزا لگنے لگتا ہے؟ تو اندر سے جواب ملتا ہے کہ محبوب کی جدائی یا محبت نہیں رلاتی۔ رقیب سے نفرت جلاتی ہے، اب میں محبت میں نہیں نفرت کے احساس سے تڑپتی ہوں۔''

وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

وہ ماں کی اوڑھنی ٹھیک کرتے ہوئے سوچنے لگی۔

''محبت کے بغیر تو رقیب سے نفرت اور رقابت کا رشتہ نہیں جڑتا ہے۔ اب تک رقیب سے جلن ہے تو محبت بھی یقیناً باقی ہوگی۔ جس دن آپ نے جلنا کڑھنا اور جنون میں چیخنا چلانا چھوڑ دیا۔ اس دن میں سمجھوں گی کہ محبت مر گئی ہے حالانکہ مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ.....

ہزاروں سال جیے گی
ہزاروں سال جی کر
آئی ہے۔
محبت نام کی یہ چڑیل
مر نہیں سکتی
کہ یہ۔ اب حیات پی کر آئی ہے

☆☆☆

یونیورسٹی میں ماحولیاتی آلودگی پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ بڑے سے ہال میں لوگ جمع تھے، ہر طرف ایمل خان کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ کہیں وہ اسٹیج پر میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا تو کہیں تقریر کر رہا تھا، اپنی یونی کے ساتھ ساتھ دوسرے تعلیمی اداروں سے آنے والی جوان لڑکیاں اور لڑکے اس کی شخصیت کے سحر میں گرفتار کہیں سیلفیاں لے رہے تھے تو کہیں گروپ فوٹوز۔ زرتاشہ کو صحیح معنوں میں آج احساس ہوا تھا کہ ایمل خان کتنا مشہور اور نیک نام ہے۔

''اس بار جیت کا مزہ آئے گا۔'' اسے پر اعتماد انداز میں اسٹیج پر بولتا دیکھ کر زرتاشہ کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔

''کیوں اتنے غور سے انہیں گھورے جا رہی ہو؟ جو اچھا نہ لگے اسے دیکھتے بھی نہیں۔'' پلوشہ نے اسے چھیڑا۔

''کبھی بلی کو دیکھا ہے کیسے چوہے کے بل کے باہر گھات لگائے ایک ہی جگہ کو گھنٹوں گھورتی رہتی ہے اور جیسے ہی شکار سر نکالتا ہے اس پر جھپٹ پڑتی ہے تو سمجھو کہ یہ بھی اک بلی کی نظر ہے۔''

پلوشہ نے اسے گھورا۔ ''اپنے آپ کو تو شیر کی خالہ اور استانی کے عہدے پر فائز کر لیا ہے لیکن اللہ کو مانو اتنے ہینڈسم اور سوبر انسان کو چوہے سے تشبیہہ نہ دو اور ہاں سنو! اب میری دعاؤں میں یہ شخص ضرور شامل رہے گا کیونکہ جس کی دشمن تم ہو جاؤ اس کو دعاؤں کی بہت زیادہ ضرورت رہتی ہے۔''

وہ اک کمینی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر دوبارہ سٹیج کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ پلوشہ اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی بظاہر یہ لڑکی کتنی مکمل اور پرسکون نظر آتی ہے۔ کسی کو اس پر شک بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر کیسا زہر بھرا ہوا ہے۔

☆☆☆

وہ کلاس لینے جا رہا تھا کہ اچانک زرتاشہ سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ایمل خان نے حیرانی سے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ جب سے ان دونوں کے درمیان جھڑپ ہوئی تھی، وہ دانستہ اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ صلح جو قسم کا انسان تھا اور کسی سے بھی جھگڑا پسند نہیں تھا اسے۔

''سر! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری مشورہ کرنا ہے فقط چند منٹ آپ کی تنہائی میں سے مجھے چاہئیں۔''

وہ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس دن کی بات پر شرمندہ تھا اور اپنے رویے کی تلافی کے طور پر کلاس میں اس کے ساتھ خصوصی نرم رویہ تو کسی صورت نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس طرح باقی لوگوں کو خواہ مخواہ ہی غلط فہمی ہوتی۔ زرتاشہ نے بھی کبھی اسے احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کی کسی بات کو وہ دل پر لیے بیٹھی ہے۔ شروع سے ہی زرتاشہ نے کبھی اس کے ساتھ اس طرح کلاس سے باہر بات نہیں کی تھی۔ اس لیے آج اس کا یوں روک کر مخاطب کرنا ایمل کو عجیب سا لگا تھا۔

''ٹھیک ہے، کلاس کے بعد میں آپ کو بلاتا ہوں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ تو وہ اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔ لیکچر سنتے ہوئے وہ دل ہی دل میں آنے والے لمحوں کی پلاننگ کر رہی تھی۔ اسے اپنے منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔ وہ تین چار لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی کہ اردلی نے اسے ایمل خان کا پیغام دیا۔

''سر نے آپ کو آفس میں بلایا ہے۔''

وہ تینوں لڑکیوں کی حیران سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔ لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ کیوں کہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سر ایمل خان نے کسی لڑکی کو اکیلے کمرے میں بلایا تھا۔ شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پایا اور بال ٹھیک کرنے لگی۔

''سر! میں اندر آ سکتی ہوں؟'' اس نے عینک کے شیشوں میں سے اسے دیکھتے ہوئے سر ہلا کر اندر آنے کی اجازت دی۔ یہ تو کہیں اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اجازت اسے کتنی مہنگی پڑنے والی ہے۔

''جی آپ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں؟'' ایمل خان نے اسے بیٹھنے کا نہیں کہا۔ یہ اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔ کوئی کولیگ خاتون یا اسٹوڈنٹ اکیلی اس کے کمرے میں نہیں بیٹھی تھی جو بھی مدعا ہوتا کھڑے کھڑے کہہ کر اس کے چہرے کی گہری سنجیدگی کا اشارہ سمجھتے ہوئے باہر نکل جاتی تھی۔

''جی مس! جو بھی مسئلہ ہے۔ جلدی سے بتا دیں مجھے ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔''

لہجے کا روکھا پن اور احتراماً جھکی ہوئی نظریں۔ اسے ایمل خان آج ایک بالکل مختلف روپ میں نظر آ رہا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے آنکھیں سکیڑ کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''کیسا الٹے اصولوں والا بندہ ہے، لوگوں کی موجودگی میں تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے اعتماد سے بات کرتا ہے اور مکمل تنہائی میں ایک ماڈرن، جوان اور حسین لڑکی کی موجودگی میں اس کی نظریں یوں زمین میں گاڑ رکھی ہیں۔''

''میں نے کہا نا، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' اس کی خاموشی سے اکتا کر اک غیر ارادی سوالیہ نظر ایمل کو اس کے صبیح چہرے پر ڈالنی ہی پڑی تھی۔ زرتاشہ اجمل خان نے منصوبے کے پہلے مرحلے پر وائس چانسلر صاحب کے آفس کا نمبر ملایا، وہ جانتی تھی کہ اس وقت وہ آفس میں ہی ہیں اور فون بھی خود ہی اٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف سے آتی ہیلو ہیلو کی آواز صرف وہی سن سکتی تھی۔

''سر ایمل خان! آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟ میں آپ کی شکایت یونیورسٹی انتظامیہ سے

کروں گی۔ اس کے بعد یہ سوچیں کہ آپ کی کیا عزت رہ جائے گی۔''

وہ غصیلے انداز اور کافی تیز آواز میں کہہ رہی تھی تاکہ اس کی آواز وائس چانسلر تک پہنچ سکے۔ ایمل کے کھلے منہ کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی حیرانی سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ چشمہ اتارتے ہوئے اپنی کرسی سے تقریباً اچھلتے ہوئے کھڑا ہو چکا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں یقیناً آپ کی دماغی حالت بگڑی ہوئی ہے۔ آپ کو اپنا علاج کرانا چاہیے۔''

ایمل کا بس نہیں چل رہا تھا جینز اور شاٹ فراک میں ملبوس برائے نام مفلر نما دوپٹے کو گلے میں لپیٹے ہوئے انتہائی نفرت بھرے انداز سے گھورتی اس لڑکی کا گلا دبا دے لیکن اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ بولے ہی جا رہی تھی

''آپ جیسے گھٹیا مرد ہر عورت کو ایک ہی نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔ لیکن میں باقی بے وقوف لڑکیوں کی طرح تر نوالہ نہیں ہوں مسٹر ایمل خان! یہ بات سمجھ لیں تو اچھی بات ہے۔'' وہ اپنی جگہ مضبوطی سے جمی کھڑی زبان سے ایسے نشتر چبھو رہی تھی جو ایمل کے تن بدن کو جلائے جا رہے تھے۔

''ٹھیک ہے، میں بلاتی ہوں سر کو اور دیگر عملے کو۔ آپ کا اصلی روپ اب سب کے سامنے آجانا چاہیے ہونہہ بڑے آئے عزت دار استاد۔''

وہ جان بوجھ کر اسے غصہ دلائے جا رہی تھی اور ایمل خان بے شک ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا لیکن اس وقت ایسی غیر متوقع صورت حال میں شدید غصے سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔

''اکبر خان!'' زرتاشہ نے تقریباً چیختے ہوئے تین چار آوازیں دے کر اردلی کو بلانا چاہا تو ایمل خان کو اس وقت معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

اکبر خان کے ساتھ ہی یونیورسٹی انتظامیہ کے کئی چہرے اس کے آفس میں پہنچ چکے تھے اور وہ روتے ہوئے اپنی پہلے سے پھٹی ہوئی آستین اور زمین پر گرایا ہوا ننھا سا دوپٹہ دکھا رہی تھی۔ ایک بڑی عمر کی خاتون کولیگ ساکت سے کھڑے ایمل کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے زرتاشہ کا زمین پر گرا دوپٹا اٹھا کر اس کے سر پر یوں رکھ چکی تھیں جیسے وہ کبھی ننگے سر نہیں رہتی تھی اور آج پہلی بار اس کے سر سے دوپٹہ اترا تھا۔

''سراسر سازش ہے میرے خلاف۔ آپ سب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں ایسی گندگی کا سوچ بھی نہیں سکتا میرے لیے میری فی میل اسٹوڈنٹس بہنوں بیٹیوں جیسی ہیں اور میں۔ انہیں وہی عزت دیتا ہوں جو اپنی فیملی کی خواتین کو۔ آپ سب جانتے ہیں۔''

اس نے بمشکل اپنے دفاع کی کوشش کی لیکن اس کی آواز کا گلا اس بھبھناہٹ نے دبا دیا تھا جو ملامتی جملوں کی صورت کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

زرتاشہ نے چپکے سے ایک فاتحانہ نظر اس کے متغیر چہرے پر ڈالی اور لوگوں سے نظر بچا کر بڑے ہی جلانے والے انداز میں اک آنکھ دبا دی۔

ایمل خان کے اندر دور تک کڑواہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے کبھی کسی انسان سے ایسی نفرت محسوس نہیں کی تھی جیسی اس وقت اس گھٹیا لڑکی سے محسوس ہو رہی تھی۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ نہ کوئی اس کی بات سن رہا تھا نہ کوئی اس پر یقین کر رہا تھا۔

وہ لڑکی ہونے کا مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے دھیرے دھیرے لرزنے کی اداکاری کر رہی تھی۔ اور ایمل خان اس کی حقیقت پر مبنی اداکاری دیکھ کر حیران تھا۔

☆☆☆

انتظامیہ کی کوشش تو یہ ہی تھی کہ ادارے کی بدنامی نہ ہو اور ایمل خان کے خلاف محکمانہ کارروائی

کر کے بات دبا دی جائے لیکن پھر بھی خبر پھیل ہی گئی۔ میڈیا سے سوشل میڈیا اور پھر پرنٹ میڈیا۔ ایمل خان تو اس دن کے بعد کسی کو نظر نہیں آیا لیکن زرتاشہ نے اس کی کردار کشی کی مہم خوب زور و شور سے چلائی تھی۔

''پہلے دن سے ہی وہ مجھے گھورتا تھا پھر کسی نہ کسی بہانے بات کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور جب میں نے نو لفٹ کرا دی تب مجھے کسی نہ کسی بہانے اپنے آفس بلانے لگا لیکن میں کوئی کمزور یا چھوئی موئی سی لڑکی نہیں ہوں۔''

''مگر سر ایمل خان تو بہت نائس آدمی تھے انہوں نے ہمیشہ لڑکیوں اور ساتھی کولیگز خواتین کی عزت کی ہے۔'' لڑکیوں کو یقین نہ آتا۔

زرتاشہ اس شخص کو موضوع گفتگو بنتا دیکھ کر اندر ہی اندر کمینی سی خوشی محسوس کرتی اور اپنے کندھے پر تھپکی دے کر خود کو ایسا زبردست بدلہ لینے پر شاباش بھی دیتی تھی۔

پلوشہ اصل صورت حال سمجھ چکی تھی اور اس نے حسب عادت زرتاشہ کو بہت ڈانٹا اور ملامت کرتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں جانتیں لیکن کسی بھی نیک انسان پر تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے۔ تم نے اپنے ساتھ بھی زیادتی کی اور اس نیک اور عزت دار شخص کے ساتھ بھی ظلم کیا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے، اللہ سے استغفار کرو اور سر ایمل خان سے بھی معافی مانگ لو۔''

پلوشہ ان دنوں ترجمے کے ساتھ قرآن پاک پڑھ رہی تھی۔ اور اس کی ہر بات میں دین اور دین کا حکم ضرور شامل ہوتا تھا۔

قرآن پاک کا ترجمہ اور تشریح پڑھو تو احساس ہوگا کہ کئی جگہ ایسے احکامات ہیں کہ ہم کسی پر بھی الزام لگانے سے پہلے سو بار سوچیں تو وہ بھی کم ہے۔ یہ سورہ نور کی چوتھی آیت ہے پڑھو۔''

زرتاشہ خاموشی سے ڈائری میں لکھی آیت اور ترجمہ پڑھ رہی تھی اور آخری الفاظ پر جیسے اس کی آنکھیں جم سی گئی تھیں۔ باوجود کوشش کے وہ ان الفاظ سے نظریں نہ چرا سکی۔ دل نے سینے کی دیواروں سے پوری قوت سے ٹکرانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اپنی جگہ سے بمشکل اٹھنے کی کوشش کی تو پلوشہ نے اس کا ہاتھ کھینچ کر واپس بٹھا لیا۔

''دیکھو زری! مجھے سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی تربیت دی گئی ہے۔ میں تمہاری تربیت پر سوال نہیں اٹھا رہی کیونکہ تمہاری ماں تو ہمہ وقت خود میں ہی الجھی رہتی تھیں..... تمہاری سچی دوست ہوں اور یہ تم بھی اچھی طرح سے جانتی ہو کہ سچے دوست نصیب والوں کو ملا کرتے ہیں۔''

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ پلوشہ کی باتیں سن کر وہ نظریں جھکائے چپ بیٹھی رہی تھی۔ احساس ندامت اندر ہی اندر اسے ستانے لگا تھا۔ ایمل خان کی بے یقینی سے پھیلی ہوئی آنکھیں اسے اپنی روح میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں، اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کے جسم میں پچھتاوے کے کچوکے لگا رہا ہے۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر تھا۔ وہ جو ہمیشہ وقت پر سونے اور وقت پر جاگنے کا عادی تھا۔ ان دنوں اس کی نیند آنکھوں سے یوں روٹھی ہوئی تھی جیسے کسی غریب سے خوشیاں روٹھ جاتی ہیں۔

بار بار اس لڑکی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔

وہ بار بار اپنے آپ سے یہ سوال کر رہا تھا کہ کیا کوئی لڑکی اس حد تک بھی جا سکتی ہے؟

اس نے ہمیشہ عورت کے اچھے روپ ہی دیکھے تھے۔ ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں اور جن لڑکیوں کو وہ پڑھا چکا تھا۔ وہ سب اس کی اور اپنی عزت کا خیال رکھنے والی تھیں۔ اگر اس کی نظر سے کوئی ایسی لڑکی گزرتی جس کی حرکات۔ اسے پسند نہ ہوتیں تو وہ بڑی بردباری سے اس لڑکی کو کوزمانے کی اونچ

نیچ سمجھا کر بدلنے کی کوشش کرتا تھا۔ دوست اور کولیگ اسے چھیڑتے رہتے تھے کہ تم تو سارے زمانے کی لڑکیوں کے بڑے بھائی ہو۔ لیکن وہ ان کو بڑی خوبصورت بات کہا کرتا تھا.....

''مجھے اپنے بیٹے سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے اور میں اس بیٹے کو کبھی بھی بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ میری پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں اپنے شاگردوں کو صرف وہ تعلیم نہ دوں جو کتابوں میں ہے یا کورس میں کام آتی ہے بلکہ میں ان کے اندر وہ احساس بھی جگا سکوں۔ جو بحیثیت مسلمان مرد اور عورت ان میں ہونا چاہیے۔

اسے اپنے کولیگز اور سینئرز پر بھی بہت افسوس ہو رہا تھا جو اسے اچھی طرح سے جاننے کا دعوا کرتے تھے۔ ایک لڑکی نے الزام لگایا اور سب اس کی حمایت میں بولنے لگے۔ کسی کو میرا کردار نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جو اس لڑکی سے بہت حسین لڑکیوں کو اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھ کر پڑھاتا آیا ہوں۔ کاش کوئی تو ہوتا وہاں جو سب کے سامنے میرے کردار کی گواہی دے کر مجھے سب کے سامنے سرخرو کر دیتا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی زندگی میں اب یہ ''کاش'' ہی رہ گیا تھا۔

''کاش میں اس کی سازش سمجھ کر اکیلے میں اس سے نہ ملتا۔''

''کاش میں اس لڑکی کی ذہنی کج روی کا اندازہ اس کے چہرے اور بول چال سے لگانے کی کوشش کرتا۔''

وہ اس حد تک پریشان اور اور الجھا ہوا تھا کہ اسے اپنے اچھے کردار پر بھی افسوس ہونے لگا تھا۔

''ایمل بیٹا!'' ماں کی آواز سن کر وہ چونک اٹھا

ماں جانتی تھی کہ رات کے اس پہر بیٹے کے کمرے کی لائٹ کیوں آن ہے؟

''امی! آپ اس وقت کیوں جاگ رہی ہیں؟'' وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ماں کو کندھوں سے پکڑ کر اپنے پلنگ پر بٹھالیا۔

''تمہیں ماں کے دل کی کیا خبر بیٹا؟ جب اولاد پریشان اور اداس ہو تو ماں کے دل کا قرار لٹ جاتا ہے۔ اور جب تم جیسا سعادت مند بیٹا اس حد تک اپنی پریشانی میں کھو جائے کہ اسے یہ احساس بھی نہ ہو کہ۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ جو دوائی ماں کو روزانہ اپنے ہاتھوں سے کھلاتا ہے۔ وہ دو تین دن سے ماں کو نہیں کھلا رہا۔''

ان کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

ایمل خان کو ان کی یہ بات سن کر بڑی شدت سے اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ کر پاؤں دبانے لگا۔ اس نے بغور ماں کے زرد اور کملائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ان کا جھریوں بھرا ماتھا چومتے ہوئے ان سے معافی مانگنے لگا۔

''امی! آپ مجھے یاد کرا دیتیں، میں آپ کو دوائیں کھلا دیتا۔ جانتی بھی ہیں کہ میں پریشانی میں اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہوں۔'' اس کی بات سن کر ماں نے ہولے سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اداس لہجے میں بولیں۔

''بیٹا! جب تم اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہو تو مجھے اپنا آپ کیسے یاد رہ سکتا ہے؟ ماں کا وجود تو اولاد کے دل کی دھڑکنوں کی خبر بھی رکھتا ہے۔ مجھے خبر ہے کہ میرا بیٹا کس قدر اذیت میں ہے۔ میں تم سے یہ درخواست کرنے آئی ہوں کہ خود کو اس اذیت سے نکال کر مجھے بھی سکون دے دو۔ تم پریشان ہو گے تو میں کیسے خوش رہ سکتی ہوں؟''

وہ ماں کا ہاتھ پکڑے نظریں جھکائے اداس لہجے میں بولا۔

''امی! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا بھی نہیں کیا کہ میں اسے اپنی سزا سمجھ کر مطمئن ہو جاؤں''

''بیٹا! اگر آپ کے ساتھ کچھ بھی برا ہو رہا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی برے کام کی سزا ہو بلکہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے کی آزمائش کی ہو۔ تم اسے اپنی آزمائش سمجھ کر اپنے رب کے اور قریب ہو جاؤ۔ میں تمہاری ماں ہوں اور میں جانتی ہوں کہ میرا بیٹا ایک مثالی کردار کا مالک ہے۔ تمہیں تمہارا رب اندر تک جانتا ہے کیونکہ وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے۔'' وہ سراپا تسلی بن گئی تھیں

''میں کیا کروں امی! مجھے کسی صورت سکون ملتا ہی نہیں، جب مجھے وہ لمحہ یاد آتا ہے تب میرے اندر بے سکونی لہریں مارنے لگتی ہے۔''

وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔ ماں کا کلیجہ جیسے کسی نے چیر کر رکھ دیا ہو۔

وہ ان کی گود میں سر رکھے سسکتے ہوئے آنکھیں موند چکا تھا۔

☆☆☆

''میں نے کئی مردوں کی عزت سر بازار دو ٹکے کی کر دی لیکن کبھی پچھتاوے کا ایک پل بھی میرے قریب نہیں آیا لیکن اب مجھے سکون آور گولی کھا کر بھی رات بھر نیند نہیں آتی۔ بلکہ جیسے ہی آنکھیں بند کرتی ہوں۔ میری نظروں میں ایمل خان کا حیران اور بے یقین چہرہ آ جاتا ہے۔'' وہ بے بس انداز میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

''یار! مجھے اتنا سمجھا دو کہ میں تمہیں اس بھنور سے نکال کر کنارے تک کیسے لے جاؤں؟''

پلوشہ کے سوال پر وہ چند لمحے سر جھکائے اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے کچھ سوچتی رہی پھر یکدم سر اٹھا کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''مجھے کسی سائیکولوجسٹ کے پاس لے جاؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ذہنی طور پر شدید بیمار ہوں اور مجھے اس ذہنی دباؤ سے نکلنے کے لیے علاج کی شدید ضرورت ہے۔ سوائے تمہارے میرا کوئی بھی نہیں ہے، اتنا بڑا قدم اکیلے اٹھانے کی اہل نہیں ہوں میں، میری مدد کرو پلیز۔'' اس کی باتیں پلوشہ کو حیران کر رہی تھیں۔ چند پل تو وہ بے یقینی سے اسے گھورتی رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، میں اپنی ایک دوست سے بات کرتی ہوں۔ اس کے چچا شہر کے بہت بڑے سائیکالوجسٹ ہیں۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ تم سے کہوں آنٹی کو بھی ان کے پاس لے جاتے ہیں۔'' پلوشہ کی بات پر وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''مجھے کبھی بھی اکیلا مت چھوڑنا پلوشہ! ورنہ میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ مزید بڑھ جائے گی اور مجھے کوئی بھی سمیٹ نہیں سکے گا۔''

پلوشہ اس کی بات سن کر اسے گلے سے لگا کر تسلی دینے لگی جبکہ زرتاشہ کے خاموش آنسو اس کے کندھے کو بھگو رہے تھے۔

اسی شام وہ بغیر کسی کو بتائے پلوشہ کے ساتھ سائیکالوجسٹ کے پاس موجود تھی۔ بتاتی بھی تو کس کو۔ ایک بے خبر ماں کو؟ جسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ جوان بیٹی کس وقت آتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ باپ تو مہینے بھر سے پہلے نہیں آتا تھا، ماں کبھی کبھی فون کر کے یہ ضرور بتاتا تھا کہ اس کی تعلیم پر کتنا خرچ ہو رہا ہے۔ ماں کے علاج اور دواؤں کا خرچا کتنا بنتا ہے اور اس کے عیش و عشرت کا حساب کتنا ہے۔

وہ خاموشی سے سنتی رہتی تھی دوسری طرف سے اپنی عظمت کے گن خود ہی گائے جاتے۔ کبھی کبھی اسے لگتا شازمہ بیگم کے اشاروں پر یہ سب اسے بتایا جاتا ہے کیونکہ اک نسوانی آواز کچھ ہدایات دیتی سنائی دیتی تھی۔

جس دن فون آتا، اس دن اس کی ذہنی حالت بہت خراب ہو جاتی تھی۔ نہ پڑھائی میں دل لگتا تھا نہ دوستوں سے گپ شپ میں مزہ آتا تھا۔ وہ مردوں کی تذلیل کر کے خوش ہوتی تھی۔

ڈاکٹر عمر زیب کے سامنے بیٹھی وہ کسی بھی طرح سے ذہنی مریضہ نہیں لگ رہی تھی۔ انہوں نے اسے خوب بولنے دیا۔ ڈاکٹر عمر زیب کے لیے روزانہ

ایسے مریضوں سے ملنا معمول کی بات تھی۔

بچپن میں آپ کے ساتھ جو ہوا۔ وہ جوانی میں انتقام بن کر ابھرا۔ آپ کو اپنی سوچ بدلنا ہوگی۔'' وہ بہت نرم لہجے میں بول رہے تھے۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب! میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ دنیا میں بہت سے لوگ بہت تکلیف میں جی رہے ہیں لیکن پھر بھی ان کی سوچ اور عمل مثبت ہی رہتے ہیں۔ میں ہی کیوں منفی انداز اپنائے ہوئے ہوں حالانکہ ایسا کچھ نرالا یا انوکھا حادثہ نہیں ہے۔ اب سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے، لاکھوں ہزاروں باپ دوسری شادیاں کر لیتے ہیں اور بیوی بچوں کو دوسری بیوی کی خوشنودی کے لیے نظر انداز کرتے ہیں بلکہ چھوڑ بھی دیتے ہیں لیکن لوگ پھر بھی نارمل رہتے ہیں۔ میں ہی کیوں ایسی ہوں؟'' وہ بے بس انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''ہم میں سے ہر شخص کی طاقت یا قوت برداشت ایک جیسی نہیں ہوتی مضبوط اعصاب جینز میں بھی ملتے ہیں اور جیسا آپ نے اپنی والدہ کے متعلق مجھے بتایا تو اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ آپ قدرتی طور پر ان کی طرح اعصابی کمزوری کا شکار ہیں۔ اس لیے منفی جذبات آپ پر حاوی آ گئے۔'' وہ نرمی سے بولے۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا میں پاگل ہوں؟'' اس نے جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ پاگل نہیں ہیں لیکن نارمل بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس وقت آپ کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک وہ لڑکی جو بہت قابل اور ویل مینرڈ ہے اور دوسری وہ لڑکی جو اپنے باپ کے ایک ایسے عمل کی سزا سارے معاشرے کو دینے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے جو انہوں نے یقیناً حالات سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ آپ کسی بھی مرد کے لیے خطرہ ہیں اور وہ مرد آپ کا استاد بھی ہو سکتا ہے۔ وہ میں بھی ہو سکتا ہوں۔'' ان کا انداز بہت واضح تھا۔

بہتر اور خوش آئند بات یہ ہے کہ دورہ لمحاتی ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ کچھ دواؤں اور چند سیشنز کے بعد آپ کو اپنی شخصیت میں واضح فرق محسوس ہوگا۔ لیکن آپ درمیان میں علاج نہیں چھوڑیں گی، او کے؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھنے ہی لگی تھی کہ انہوں نے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

دوسری شادی کی اجازت ہمارے مذہب نے دی ہے۔ بلکہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے واضح احکامات دے رکھے ہیں۔ قصوروار صرف آپ کے والد نہیں ہیں بلکہ آپ کی والدہ بھی اس معاملے میں پوری طرح قصوروار ہیں۔ حقیقت بلاشبہ بہت تلخ ہے لیکن اسے قبول کرنا ہی سمجھ داری ہے۔

آپ کے والد کی غلطی یہ نہیں ہے کہ انہوں نے بیٹے کے لیے دوسری شادی کی ہے بلکہ ان کا گناہ یہ ہے کہ وہ انصاف نہیں کر سکے۔ جو دوسری شادی کے ساتھ اللہ کا حکم اور شرط ہے۔ لیکن اب جو کچھ ہو چکا ہے اس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ جو غم ماضی کا حصہ ہے، وہ اب دوبارہ نہیں ہونے والا اس لیے اپنی صلاحیتوں پر بھروسا کر کے نئی زندگی کا آغاز کریں۔ آج کے دن کی ناکامی، محرومی کو آج ہی دفن کر کے اگلی صبح نئے جذبے، نئی سوچ کے ساتھ پوری قوت ارادی سے زندگی کا آغاز کریں۔ دنیا کا مشاہدہ کریں اور دیکھیں لوگ کن مشکل حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے دکھ اور تکلیفوں کو کم کرنے کی کوشش کریں۔''

وہ مکمل توجہ سے ان کی نرم لہجے میں کی گئی باتوں کو سن رہی تھی۔

''بہت شکریہ میری دوست۔ آج مجھے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگ رہا ہے۔'' واپسی پر اس نے شکر گزار انداز میں پلوشہ کو مخاطب کیا تو اس نے بڑی محبت سے زرتاشہ کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔

''اب میری خاطر وقت پر دوا کھانا کیونکہ یہ دوائیں تمہارے مکمل علاج کے لیے بہت ضروری

ہیں۔'' اس کی بات سن کر وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

☆☆☆

وہ جشن آزادی کی ایک پروقار تقریب میں شامل تھی، شدید بوریت ہو رہی تھی، تب ہی گھر سے نکلی تھی۔ یونیفارم میں ملبوس وہ نوجوان اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''اے مسٹر! سامنے سے ہٹ جائیں، شاید آپ کو کسی نے یہ نہیں بتایا کہ خواتین اور اسٹیج کے بیچ دیوار بننے والے مردوں کو اوچھا کہتے ہیں۔''

وہ منہ پھٹ تو تھی ہی، پیچھے سے نظر آتے فوجی کے چوڑے شانے دیکھ کر کہہ گئی۔ وہ اس کی طرف مڑا اور پل بھر کے لیے زرتاشہ کو لگا جیسے وقت تھم سا گیا ہو، وہ ساکت سی اسے ایک ٹک دیکھے گئی۔ پہلی نظر کی محبت فسانہ نہیں حقیقت ہوتی ہے، اسے اب معلوم ہوا تھا۔ چھ فٹ سے اونچا قد، چوڑے شانے، بھورے بال اور قدرے سانولی سی رنگت چہرے پر پھیلی معنی خیز مسکراہٹ اور مسکراہٹ کا ساتھ نہ دیتی سنجیدگی کے گہرے رنگ لیے بڑی بڑی بولتی ہوئی آنکھیں۔

''لگتا ہے، اتنا خوب صورت مرد پہلی بار دیکھا ہے۔'' وہ شوخ جملہ اسے چونکا گیا تھا۔

''ارے ارے میں تو سمجھتی تھی کہ خوش فہم صرف خواتین ہوتی ہیں، یہاں تو مرد حضرات عورتوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔''

زرتاشہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ چونک سا گیا اس کی بات سن کر۔

''ارے میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ وہی ہیں۔ مجھے احمد بھائی نے بتایا تھا کہ ان کی سالی کی شخصیت ایسی ہے کہ وہ تمہیں خود ہی اپنی طرف متوجہ کر لے گی۔'' وہ اس کے قریب ہی خالی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا تو وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

''آپ کو شاید برا لگے لیکن انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ نام تو اس کا کومل ہے لیکن نام کی کوئی خاصیت اس میں نہیں ہے جیسے کومل کی بہن یعنی کہ ان کی بیوی کا نام حسینہ ہے لیکن حسیناؤں والی کوئی نشانی ان میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔''

وہ بڑی بے تکلفی سے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ کھاتے اسے پیش کر رہا تھا۔

''مجھے تو آپ کی دماغی حالت مشکوک لگ رہی ہے۔'' وہ گال پر آئی ریشمی لٹ کو جھٹکتے ہوئے بولی تو وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

''دیکھیں جی! میرے بہت دور کے کزن اور قریبی دوست نے مجھے فون کر کے کہا کہ ان کی سالی جو بہت لڑاکا اور اوور اسمارٹ ہے۔ مجھے اس تقریب میں ملے گی اور سالی کا نمبر بھی دے دیا، یہ کہہ کر کہ وہ صحافی ہے اور ایک سروے کے سلسلے میں ادھر آئی ہے اور میں اس کی مدد کر دوں۔ سالی کے بارے میں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کٹ کھنی بلی ہے۔ ذرا دور سے بات کرنا، بعض اوقات عادتاً پنجہ مار دیتی ہے۔''

وہ حیرانی سے اس بظاہر معقول نظر آنے والے شخص کی نامعقول اوٹ پٹانگ باتیں سن رہی تھی۔

''تو میرے چہرے پر کہاں لکھا ہے کہ میں آپ کے دوست کی سالی ہوں؟''

اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

اسے دل ہی دل میں عجیب سی کیفیت نے گھیر رکھا تھا۔ وہ بہت سارے بے گناہ مرد جنہیں وہ شور مچا کر بے عزت کروا چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور جو آج سچ مچ اسے تنگ کر رہا تھا، اسے وہ نہ شور مچا کر دوسرے مردوں کے ہاتھوں پٹوانے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور نہ ہی اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اصل میں انہوں نے جو بھی نشانیاں بتائیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔''

وہ سر کھجاتے ہوئے شرارت سے بولا تو

زرتاشہ نے اسے صرف گھورنے پر اکتفا کیا۔
اس نے فون ملایا اور علی نامی شخص سے بات کرنے لگا۔
''ہاں گھامڑ! تیری سالی صاحبہ مل گئی ہیں اگر بھابھی بھی اپنی بہن جیسی ہیں تو مجھے تیرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے کیونکہ تیرے جیسے بندے کے لیے ایسی ہی تیز طرار اور لڑاکا بیوی ہونا چاہیے تھی۔ لے اپنی سالی سے بات کرلے اسے یقین نہیں آرہا ہے کہ ایک خوبرو اور بااخلاق فوجی اس کے جیجا جی کا دوست ہے۔ یار کہا بھی تھا، میرے علاوہ بھی ایک آدھ معقول بندے سے دوستی کرلے بوقت ضرورت زبانی ضمانت کے لیے تھانے جانے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیے نا۔ جو ہیں وہ تو سب ہی مطلوب ہیں پولیس کو، ان کو تو پولیس پہچان کر بٹھالے گی۔''
''لیں جی، اپنے جیجو سے بات کرلیں۔''
اس نے فون زرتاشہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔
''میں نے کہا نا کہ میں کسی علی صاحب کی سالی نہیں ہوں۔ آپ کیا چیز ہیں۔ فضول میں دماغ خراب کر رکھا ہے'' زرتاشہ نے فون اسے واپس تھما کر تیز لہجے میں کہا تو ساتھ والی خواتین چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔
''یار! مجھے اندازہ تو تھا کہ سسرال والوں میں تیری بالکل بھی عزت نہیں ہوگی لیکن یہ لوگ تجھے پہچاننے سے ہی انکار کردیں، یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' وہ افسوس کرتے ہوئے دوسری طرف کی سننے لگا۔
''چل یار ملا لے فون۔ میں دیکھتا ہوں کہ تیرا فون اٹھاتی ہے کہ نہیں۔'' وہ اسے تیکھی نظروں سے گھور رہی تھی۔
اسی اثنا میں اسے اپنے فون کی رنگ سنائی دی تو زرتاشہ بے اختیاری میں حیرت کے مارے تقریباً اچھل ہی پڑی۔
وہ فاتحانہ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھو جھوٹ پکڑا گیا نا؟
''اس نے اسکرین پر نمبر دیکھ کر فون ریسیو کیا۔
''جی بابا! میں ان سے مل چکی ہوں اور وہ بہت اچھے انسان ہیں اور مجھے پورا پروٹوکول دیا ہے۔ ٹھیک ہے، میں سنبھال لوں گی انہیں۔''
وہ اس کی باتیں بغور سنتے ہوئے اپنی تعریف سمجھ کر کالر ٹھیک کرنے لگا۔
''ویسے یہ اعلا اقدار کے حامل گھرانوں کی اک پہچان ہوتی ہے کہ وہ بہنوئی کو بڑے بھائی اور باپ والا احترام دیتے ہیں شکر ہے کہ آپ نے اس آلو کو صرف بابا کہا ہے، علی بابا نہیں کہا ورنہ معاملہ چالیس چوروں تک پہنچ کر مشکوک بھی ہوسکتا تھا۔''
وہ اول فول بولتے ہوئے مہمانوں کے اٹھنے کا منظر بھی دیکھ رہا تھا تقریب اختتام پذیر تھی اور آس پاس کی ساری کرسیاں خالی ہوچکی تھیں۔
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اور وہ اسے علی کی سالی سمجھنا چھوڑ دیتا، ایک بھاری بھرکم سی درمیانی عمر کی خاتون ان کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔
''مسٹر حارث حسن آپ ہیں نا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔
حارث نے اس کا جائزہ لیا۔ گہری سانولی رنگت، جامنی لپ سٹک سے رنگے ہونٹ، میرون اور جامنی رنگے ہوئے بال، قدرے چھوٹا قد اور وزن میں خود کفیل اس خاتون کا حلیہ بتا رہا تھا کہ کافی تیز قسم کی ہیں۔
''جی میں ہی حارث ہوں، آپ کون؟''
''میں علی احمد کی سالی کومل ہوں۔'' وہ کومل تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہی تھیں
خاتون نے بے تکلفی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو وہ ساکت سا کبھی زرتاشہ کو دیکھنے لگا اور کبھی اک ڈری ہوئی نگاہ اس خاتون پر ڈال رہا تھا۔
''سوری۔ میرا نمبر بند تھا۔ علی جیجو نے کہا تھا کہ کچھ دن آپ میری میزبانی کریں گے۔ اسمارٹ ہوائے! آپ کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ خوب گزرے گی ہم دونوں کی۔'' وہ بے تکلفی سے اس

کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ تو حارث کی رنگت متغیر سی ہوگئی۔ زرتاشہ کو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری ملاقات ان دونوں کی ایک بک شاپ میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے کورس کی کتابوں کے علاوہ کچھ اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ یہ کہہ کر کہ کتاب انسان کی بہترین دوست ہے اور اچھی کتابیں آپ کی شخصیت کو نکھارنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ بڑی تابع داری سے ان کے ہر مشورے پر عمل کرتی جا رہی تھی۔

وہ سر جھکائے ڈاکٹر صاحب کی دی ہوئی لسٹ میں شامل کتابیں ڈھونڈ رہی تھی کہ اچانک کسی سے ٹکرا گئی۔

''یہ صبح سے دسویں لڑکی ہے جو جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرائی ہے۔''

ابھی اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا بھی نہیں تھا کہ طنزیہ آواز جو کچھ سنی ہوئی سی لگ رہی تھی، اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''اے مسٹر! اب آج کس ڈرامے کی ابتدا ہے؟'' اس نے حارث کو پہچان لیا تھا جبکہ آشنائی کی چمک حارث کی آنکھوں میں بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

''جناب! آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ لڑکیاں جان بوجھ کر آپ سے کس لیے ٹکراتی ہیں؟'' سیلز مین جو بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا پوچھنے لگا۔

''یہ تو آپ جانتے ہیں ناں بھائی صاحب! کہ ہمارے ملک کی لڑکیاں فوجیوں پر مرتی ہیں اور شاید میرے ماتھے پر لکھا ہے کہ میں فوجی ہوں اس لیے وردی کے بغیر بھی مجھے پہچان لیتی ہیں اور جان پہچان بنانے کے لیے جان بوجھ کر ٹکرا جاتی ہیں، ابھی ابھی آپ نے اپنی آنکھوں سے نمونہ دیکھ تو لیا ہے۔'' اس کی بات پر جہاں سیلز مین کے لبوں پر دبی سی مسکراہٹ پھیل چکی تھی، وہیں زرتاشہ جس کی دھڑکنیں اس فوجی کو دیکھ کر بے ترتیب ہو چکی تھیں اس کی بات سن کر بڑی نرمی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ارے آپ گھر سے کیسے نکلے اور یہاں اکیلے ہی کیوں چلے آئے اور میں حیران ہوں کہ آنٹی نے آپ کو اکیلے کیسے گھر سے نکلنے دیا؟''

حارث کا منہ اس کی خلاف توقع باتیں سن کر کھل گیا تھا۔ وہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟'' بک شاپ بہت چھوٹی سی تھی، اس لیے قریب ہی بیٹھا سیلز مین ان کی باتیں واضح طور پر سن رہا تھا۔

''نہیں۔ کوئی بات نہیں ہے حارث! میں آنٹی کو فون کر کے پوچھ لیتی ہوں کہ آپ کو اکیلے کیوں باہر نکلنے دیا؟''

زرتاشہ نے فون ملایا اور سیلز مین کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اپنی کنپٹی پر انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی رکھ کر گول گھماتے ہوئے اشارہ کیا جو حارث دیکھ نہیں پایا تھا۔

''السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟ یہ حارث ہاسپٹل سے کب آیا ہے۔''

دوسری طرف کی آواز سنتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولی۔

''اچھا تو وہ گھر سے چھپ کر نکلا ہے؟ آنٹی! آپ اس کا خیال رکھتیں ناں، ایسی حالت میں اس کا یوں باہر نکلنا اس کے لیے اور باقی لوگوں کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔''

دوسری طرف پلوشہ اس کی بات سن کر کچھ نہ سمجھ پائی تھی اور اس کے چپ ہونے پر ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔ جی جی اس وقت وہ ایک کتابوں کی دکان میں موجود ہے۔ آپ جلدی سے آ جائیں میں اسے کچھ دیر باتوں میں لگا کر روکنے کی کوشش کرتی ہوں۔ جی جی آنٹی! شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے یہ تو انسانیت

کے ناتے میرا فرض ہے۔''

اس نے فون بند کر کے اس کی طرف دیکھا تو وہ منہ کھولے ابھی تک اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ ایسا کریں، تھوڑی دیر اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ بس آنٹی آنے والی ہیں پھر آپ کو وہ گھر لے جائیں گی۔''

وہ قریب رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی اور اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ پوچھتا، سیلز مین نے ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے افسوس میں سر ہلایا۔

وہ چونک کر باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''مگر بہن جی! ان کو ہوا کیا تھا جو اتنی جوانی میں ذہنی بیماری کا شکار ہو گئے ہیں۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ حارث غصے میں لال پیلا ہوتے ہوئے سیلز مین کی طرف بڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''میں آپ کو کہاں سے پاگل نظر آ رہا ہوں مسٹر؟ یہ جو ڈھیر ساری کتابیں آپ کے آس پاس رکھی ہوئی ہیں، ان کو فرصت کے لمحوں میں کبھی پڑھ لیا ہوتا تو آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو جاتا کہ خرد اور دیوانگی میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں غصے کی سرخی اور آواز کی جھنجلاہٹ اس بیچارے کو ڈرا گئی تھی۔

''ارے نہیں حارث! اب تو آپ پاگل نہیں ہیں۔ اب عاشی باجی کو بھی بھولنے کی کوشش کریں۔ وہ اتنی ہی زندگی لکھوا کر لائی تھیں۔ ہنی مون پر پہاڑ سے نیچے گر کر موت کی آغوش میں چلی گئیں اور آپ اپنی بچپن کی محبت اور نئی نویلی دلہن کی جدائی میں دیوانے ہو گئے۔ اپنے آپ کو ان کی موت کا مجرم ٹھہراتے رہے۔ آپ کی غلطی تو صرف اتنی تھی کہ آپ نے مذاق ہی مذاق میں انہیں اپنی محبت کا ثبوت دینے کا کہا۔

جان دینی اتنی آسان بات تو نہیں ہے۔''

دکان میں چند اور گاہک کھڑے کتابوں کی ورق گردانی کر رہے تھے، وہ سب لوگ تجسس بھری نظروں سے کبھی زرتاشہ کو اور کبھی حارث کو دیکھ رہے تھے۔

''کتنا ظالم انسان ہے یہ، ایسے انسان کو تو پاگل خانے میں ہی رکھنا چاہیے۔ ایک معصوم لڑکی کو قتل کر کے کس قدر پرسکون انداز میں کھڑا ہے جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔''

وہ سب کی ملامتی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے غصیلے انداز میں زرتاشہ سے مخاطب ہوا۔

''آپ جیسی مکار اور کینہ پرور لڑکی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس لڑکی سمیت دکان میں کھڑے سارے لوگوں کو ہاتھ سے پکڑ کر نکال باہر کرتا۔

''حارث! مجھ سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن لوگوں کے ساتھ'' اپ نے زیادتی کی ہے اور جن کی اکلوتی بیٹی کو خودکشی پر مجبور کر دیا ہے آپ ان لوگوں سے جا کر معافی مانگیں۔''

یہ بات سن کر قریب کھڑا ایک باریش آدمی بولا۔

''فکر نہ کرو بیٹا! آپ کو عمر بھر اس گناہ کی سزا بھگتنی پڑے گی۔''

ان لوگوں میں سے ایک شاید کسی چینل کا رپورٹر تھا کیوں کہ زرتاشہ کو اس کی شکل کچھ آشنا لگ رہی تھی۔ اور ذہن پر زور ڈالنے سے اسے ابھی ابھی یاد آیا تھا کہ وہ جرائم اور ان کی سزا پر ہر ہفتے پروگرام کرتا ہے۔

''میں اس سانحے پر ایک پروگرام کرنا چاہتا ہوں۔'' اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں آپ کی چند تصاویر بنا لوں؟''

اس نے کندھے پر رکھے کیمرے کو اتار کر اس کا رخ حارث کی طرف کیا۔ حارث نے غصے سے آگے بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کیمرہ چھین لیا۔

زرتاشہ آنکھوں میں شرارت بھرے تماشا دیکھنے میں مصروف تھی۔

اس سے پہلے کہ دکان میں موجود لوگ یا سیلز مین کچھ کہتا وہ اسے لے کر باہر آچکی تھی۔

''ہاں، اب بولیں پھر کسی لڑکی کے ساتھ ایسی حرکت یا شرارت کریں گے جو اس دن میرے ساتھ کی تھی۔ مجھے زبردستی کسی کی سالی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے؟'' حارث نے ہنستے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ کر کہا۔

''ارے میرے باپ کی بھی توبہ۔ آج کے بعد تو میں علی کی سگی سالی کو بھی سالی نہیں کہوں گا۔ میں تو کیمرہ دیکھ کر اور لوگوں کی ملامت بھری باتیں سن کر اتنا گھبرا گیا تھا کہ اپنے فوجی ہونے کا بھی نہ بتا سکا۔''

اس نے اعتراف کیا، ڈرائیور اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا، وہ پلٹ کر گاڑی کی طرف جانے لگی تو یکدم نے حارث اسے آواز دی۔

''میں آپ جیسی ذہین اور اسمارٹ لڑکیوں سے بہت متاثر ہوتا ہوں۔ کیا میں آپ سے آپ کا نام اور نمبر پوچھ سکتا ہوں۔'' وہ جلدی جلدی اپنی بات مکمل کر کے اس کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل دیکھنے لگا۔

اور اس نے فقط ایک پل فیصلہ کرنے میں لگایا اور دوسرے ہی لمحے رکھائی سے بولی۔

''مجھے فوجیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑی تو اس کی سماعتوں میں حارث کی آواز آئی۔

''لیکن مجھے تو پریوں کی ملکہ میں بہت دلچسپی ہے۔ بچپن سے کہانیاں سنتا آیا ہوں کہ پریوں کی ملکہ کسی آدم زاد کی منتظر ہے۔ اب آپ کا انتظار ختم۔''

اس نے سن رکھا تھا کہ مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں، اسی لیے مڑ کر نہ دیکھا۔

☆☆☆

حارث سے دوسری ملاقات کے بعد وہ بہت کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ اپنی کیفیت کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی بس دل میں ہر وقت ایک کسک سی اسے بے چین رکھتی۔ وہ بڑی پابندی سے دوائیں لے رہی تھی اور ڈاکٹر کے پاس بھی جا رہی تھی علاج کی طرف اس کا مکمل دھیان تھا، اس نے محسوس کیا کہ بہت دن سے اس پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی نہ اس نے کسی مرد کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا نہ کسی سے شدید نفرت محسوس کی بلکہ اسے اپنے اندر ایک عجیب سی توانائی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دن ماں کو دوا کھلا کر وہ باہر لان میں بیٹھی تتلیوں کی پھولوں سے اٹھکیلیاں دیکھنے میں مگن تھی کہ فون پر ایک اجنبی نمبر سے رنگ آنے لگی۔

''آپ کیا سمجھتی تھیں کہ ایک فوجی کے لیے کسی لڑکی کو ڈھونڈنا کوئی بہت مشکل کام ہوگا اور لڑکی بھی ایسی کہ جس کے مقابلے کی پورے شہر میں دوسری نظر نہیں آئی۔ میں نے پھولوں سے آپ کا پتا پوچھتے ہوئے کہا کہ وہ بالکل تم جیسی دکھائی دیتی ہے سہمتی ہوئی شاداب سی۔ جانتی ہیں انہوں نے کیا کہا؟''

دوسری طرف سے حارث کی آواز سن کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

''آج صبح صبح ہی آپ کی آواز سن لی ہے جانے دن بھر کیا کیا سہنا پڑے گا؟'' زرتاشہ نے کہا تو دوسری طرف سے اس کے قہقہے کی آواز آئی۔

''پھولوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بس مغرور سے اپنے آپ پر اترانے لگے، میں نے آپ کو ان کا ہم شکل جو کہہ دیا تھا۔''

وہ اپنے تپتے ہوئے گال پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''یہ مجھے کسی انڈین فلم کے ڈائیلاگ لگ رہے ہیں۔ شاید نانا پاٹیکر کے ہیں۔''

دوسری طرف سے اس کا زوردار قہقہہ سنائی دیا۔

''قسم سے آپ کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو اس وقت اپنی قسمت پر رشک کر رہی ہوتی۔''

''میری جگہ اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو آپ یوں مجھے فون نہ کر رہے ہوتے۔'' اس کے لہجے کا

تفاخر محسوس کر کے حارث مسکرانے لگا۔

''معاف کیجیے گا، پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے مردوں سے شدید چڑ ہے اور دوسری بات یہ کہ میں عام لڑکی نہیں ہوں جو کسی بھی مرد کے ساتھ فری ہو کر وقت گزاری کروں۔''

دوسری طرف سے حارث نے پرسکون انداز میں کہا۔

''میں بھی کوئی عام مرد نہیں ہوں بلکہ حارث حسن خان ہوں۔ اور یہ بات آج تو آپ کی سمجھ میں آئے گی لیکن کبھی نہ کبھی آپ ضرور سمجھیں گی کہ مجھ میں اور دوسرے مردوں میں بہت فرق ہے۔''

''اچھا۔ آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟'' اندر ہی اندر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یوں ہی بولتا رہے اور اس کی ازل سے محبت کی پیاس لیے سماعتیں سیراب ہوتی رہیں۔ لیکن بظاہر وہ رکھائی سے بات کر رہی تھی۔

''میں جو چاہتا ہوں، وہ آپ مجھے بن مانگے دے رہی ہیں یعنی کہ آپ سے بات کرنا آپ کی آواز سننا چاہتا ہوں اور وہی سن رہا ہوں۔'' اس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا تھا، وہ خاموش ہو گئی تھی۔

''دیکھیے۔ آئندہ مجھے فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں یہ نمبر ہی بند کر دوں گی۔''

''پھر میں براہ راست آپ کی آواز سننے آ جاؤں گا۔ اور میں یہی سمجھوں گا کہ آپ نے نمبر بند کر کے مجھے دعوت نامہ بھیجا ہے کہ سیدھے میرے گھر آ کر مجھے دیکھو اور میری آواز سنو۔''

''اس کی بات سن کر وہ چپ رہ گئی تھی۔''

☆☆☆

پھر یہ سلسلہ چل نکلا وہ روزانہ ایک مخصوص وقت پر فون کرتا تھا۔ وہ بات تو رکھائی سے کرتی لیکن فون اٹھاتی ضرور تھی۔ اور یہی بات حارث کے لیے حوصلہ افزا تھی کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ اس سے بات نہ کرنا چاہتی تو فون نہ اٹھاتی اس کا نمبر بلاک لسٹ میں ڈال دیتی یا کسی بھی طریقے سے اسے روک دیتی۔

کسی دن کچھ لمحوں کی دیر ہو جاتی تو وہ بے چینی سے موبائل گود میں رکھے اسکرین پر نظریں جمائے چپ چاپ اسے تکتی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی عادت بنتا جا رہا تھا اور عادت کو محبت میں بدلتے وقت نہیں لگتا، وہ جو مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس نے حارث کو دوسرے مردوں سے بالکل الگ کر کے دل کے دربار میں سب سے اونچی مسند پر بٹھا کر اس کے سر پر اپنی محبت کا تاج بھی سجا دیا تھا۔ اسے خود پر بہت حیرت ہوتی تھی، وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اتنی شدت کی محبت اور وہ بھی ایک مرد کے لیے؟

''اب تو لگتا ہے کہ زندگی اس کے ہونے سے مشروط ہو چکی ہے۔ وہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ رہے گا۔'' اس نے پلوشہ کے سامنے دل کھولا تو وہ اسے ہمدردی سے دیکھنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اعصابی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار یہ لڑکی علاج سے کچھ بہتری کی طرف آئی تھی اب اگر اس کے ساتھ کچھ بھی برا ہوتا تو اس کی اور ڈاکٹر کی ساری محنت ضائع ہو جاتی اور وہ دوبارہ اپنے پرانے زخموں کی تکلیف میں کھو جاتی۔

''یار! کسی بھی جذبے میں شدت خاص طور پر محبت اور نفرت کی زیادتی۔ انسان کو تکلیف ہی دیتی ہے اس ایک انسان کو اتنی شدت سے چاہنے سے پہلے اپنے آس پاس کی تلخ حقیقتوں پر اک نظر دوڑا لیا کرو۔ ایک حسنہ بیگم بھی ہیں تمہارے قریب ہی جنہوں نے محبت کے ہاتھوں ایسے زخم کھائے کہ خود کو ہی بھول گئی ہیں۔'' وہ اسے سمجھاتی لیکن وہ تو جیسے محبت کے نشے میں چور سننے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھی تھی۔

''تم میرے باپ جیسے انسان سے حارث حسن کو ملا رہی ہو۔ جب کہ حارث حسن جیسے مرد عورت کا سائبان بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جب سے وہ میری زندگی میں آیا ہے۔ مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ سوائے اس کی جدائی کے۔ میں سوچتی ہوں اگر

وہ مجھے نہ ملا تو میں زندہ کیسے رہوں گی؟ میں نے زندگی میں اتنی شدت سے اپنے رب سے کچھ نہیں مانگا جتنی شدت سے میرا دل حارث کا سوال کرتا ہے۔'' جذبات کی شدت سے اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

پلوشہ ساکت سی اسے دیکھتی رہتی وہ اس کے جذبوں کی شدت اور سچائی محسوس کر کے اندر ہی اندر ڈرنے لگی تھی۔

''میری دعائیں ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہیں اللہ کرے۔ تمہیں یہ رشتہ، یہ تعلق کبھی دکھ نہ دے بلکہ تمہارا دامن خوشیوں سے بھرا رہے۔''

پلوشہ نے اسے گلے لگا کر دعائیں دیں۔ لیکن کچھ دعائیں آنے والی مصیبتوں کو ٹالنے کے کام آجاتی ہیں جانے کتنی مصیبتیں مزید اس کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھیں یہ تو کاتب تقدیر ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

''تم نے اور تمہاری محبت کی شدت نے مجھے ہارنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' وہ حارث کے سامنے اعتراف کر رہی تھی۔

''تم نے محبت کو ابھی سمجھا ہی نہیں ورنہ یہ محبت کوئی کاروبار یا کھیل نہیں ہے کہ اس میں نفع نقصان یا ہار جیت کا ہو۔

وہ اسے یوں سمجھا رہا تھا جیسے کسی معصوم بچے کو سبق پڑھا رہا ہو۔

''میں تمہاری باتیں مان بھی لوں تو پھر بھی یہ کہوں گی کہ ہم جیسی لڑکیوں کے لیے محبت آزمائش ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں محبت صرف مرد ہی کر سکتا ہے۔ میں جتنے سہانے سپنے دیکھ لوں لیکن سپنوں سے نکل کر حقیقت کو قبول کروں تو محبت میرے لیے موت کا دوسرا نام ہے۔'' زرتاشہ اداس لہجے میں بول رہی تھی اور حارث سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا

''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ میں نے تمہیں محبت کی راہوں پر چلنے کے لیے مجبور کر کے اچھا نہیں کیا؟۔ یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ اس راہ گزر پر کانٹے اور کانچ

کی کرچیاں ہی ملتی ہیں۔'' وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے بڑی غور سے حارث کی باتیں سن رہی تھی۔

''ایسی نظروں سے تو نہ دیکھو ظالم۔'' وہ ماحول کی سنجیدگی اور اداسی کم کرنے کے لیے اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔

''حارث! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں ساری کشتیاں جلا کر محبت کے سفر پر نکلی ہوں میرے سامنے دو ہی آپشن ہیں۔ محبت یا موت۔ جیسا کہ تم نے کہا محبت کے سفر میں مڑ کر دیکھنا نہیں ہوتا میں بھی مڑ کر نہیں دیکھوں گی۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی تو حارث نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے کہا۔

''بس یار! بہت ہو گیا محبت اور اس کے فوائد نقصانات پر لیکچر۔ اچھی سی کافی منگواتے ہیں آنے والے کل کے لیے اچھے اچھے پروگرام بناتے ہیں۔''

حارث نے ویٹر کو اشارے سے بلایا جو بڑی دیر سے ان کے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

''تم ایک انتہائی نیچ اور گھٹیا عورت ہو۔ ایک مہینے کے بعد شوہر گھر آتا ہے لیکن تمہاری زبان کڑواہٹ اور تمہاری آنکھوں کی نفرت ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک مہینے کے بعد بھی مجھے اس گھر میں نہیں آنا چاہیے۔''

باپ کی نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی آواز اس کی سماعتوں کو بھی زہریلا کر رہی تھی۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے آ کر ان دونوں ماں بیٹی پر احسان جتانا بھولتا۔

''تم ایک ہی بار مجھے مار کیوں نہیں دیتے میں روز روز کے مرنے کی اذیت سے بہت تنگ آ گئی ہوں۔''

آج بہت دنوں بعد اس نے ماں کی آواز سن

تھی لیکن ان کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ نے بیٹی کے سینے پر جیسے تیر چلا دیے تھے۔

''میری اتنی اچھی قسمت نہیں ہے کہ کسی دن سو کر اٹھوں تو خبر ملے کہ میری جان تم جیسی عورت سے چھوٹ گئی ہے۔''

اس کی زبان مسلسل زہر اگل رہی تھی۔

وہ ماں کی دلی کیفیت سے اچھی طرح آگاہ تھی جانتی تھی کہ باپ کے چلے جانے کے بعد آج ساری رات ماں نے تڑپ تڑپ کر گزارنی ہے۔ دواؤں کے باوجود انہیں نیند نہیں آئے گی۔

''شازمہ مجھے منع کرتی ہے کہ میں یہاں نہ آؤں، کیوں کہ یہاں سے واپسی پر میری حالت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے میں کسی قبرستان سے ہو کر گھر واپس آیا ہوں۔''

وہ اب بیٹی کے سامنے بات کر رہا تھا۔

''ان سے میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی کیوں کہ وہ ذہنی طور پر بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ لیکن بابا! آپ ان کی بات کا برا نہ مانیں، میں ان کی طرف سے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔'' وہ اندر ہی اندر باپ کی بات پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے بظاہر خود کو پرسکون رکھ کر اسے نرمی سے جواب دے رہی تھی۔

حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس انسان کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پوچھے

''ہمارا قصور بتائیں۔ مجھے اور میری ماں کو کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔''

☆☆☆

وہ ہمیشہ سر جھکا کر بات کرنے والی اور ہر حکم کے جواب میں جی جی کرنے والی زرتاشہ اجمل خان آج باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی تھی۔ فیصلے کی گھڑی آچکی تھی اور اس بار اس کی تقدیر کا فیصلہ اس نے خود کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی، یہ پل ہاتھ سے نکل گیا تو ہمیشہ کا رونا ہی رہ جائے گا۔

''بس تم نے بہت رو لیا ہے زرتاشہ! اب اور نہیں رونا۔'' اس نے خود کو مخاطب کر کے اپنے اندر کی بزدل اور کمزور لڑکی کو حوصلہ دیا۔

''بابا! میں نے کہہ دیا ہے میں شادی کروں گی تو صرف اور صرف حارث حسن سے۔ ورنہ میں تمام عمر بغیر شادی کے گزار دوں گی۔ اور آپ یہ بات بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں آپ ہی کی بیٹی ہوں، اپنی خوشیاں دوسروں پر قربان کرنے کا ظرف مجھے نہ وراثت میں ملا ہے اور نہ ہی تربیت میں رشتوں کے لیے قربانی یا ایثار مجھے سکھایا گیا ہے۔''

اس کے لہجے میں بغاوت کی سختی تھی جواباً روایت پسند باپ کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر نشان ڈال گیا۔ زرتاشہ کی حیران و بے یقین آنکھوں نے باپ کے چہرے پر شدید نفرت اور غصہ دیکھا۔

''اب میں آپ کو اس تھپڑ کا جواب دوں گی تیار رہیے گا یہ زرتاشہ اجمل خان کی زبان سے نکلے الفاظ ہیں جو پتھر پر لکیر ہوتے ہیں۔''

وہ اپنے جلتے ہوئے گال پر ہاتھ رکھے چبا چبا کر بولی تو اجمل خان شدید غصے میں لہو رنگ آنکھوں سے تھپڑ مارنے کے لیے دوبارہ آگے بڑھا لیکن اس بار غیر متوقع طور پر اس کا ہاتھ اس کی ذہنی مریضہ بیوی حسنہ نے روک لیا تھا۔ جو ڈاکٹر بدلنے اور چند مہینوں کے مستقل علاج سے اتنی بہتر ہوئی تھی کہ اب کبھی کبھی نارمل نظر آنے لگتی تھی لیکن یہ بہت کم ہوتا تھا

''کب تک تھپڑ کھاتی رہیں گی ہم عورتیں؟ کہاں لکھا ہے تم مردوں کے قانون کے علاوہ کہ عورت اپنے دل کی نہ مانے؟

تم جیسے مردوں کا اسلام تو صرف اور صرف دوسری، تیسری، چوتھی، شادی تک محدود ہے۔ تمہیں نہیں پتا کہ اسلام نے عورت کو کتنے حقوق دے رکھے ہیں۔ ایک بیٹی کی حیثیت کو تسلیم کرو اور اسے بغاوت پر مجبور مت کرو۔ وہ اپنی ماں کی طرح مجبور اور مظلوم عورت نہیں بنے گی۔ وہ اعلا تعلیم یافتہ اور نئے دور کی لڑکی ہے۔''

زرتاشہ نے چیختی چلاتی ماں کی طرف بے یقینی

سے دیکھا۔

''تم دونوں ماں بیٹیاں کان کھول کر سن لو، اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا اور میں زری کی شادی اپنی پسند سے اپنے چچازاد بھائی کے بیٹے سے طے کر چکا ہوں اور ہماری خاندانی روایت کے مطابق ایک دفعہ زبان دے دی جائے تو پھر ہر صورت میں نبھانی پڑتی ہے۔ وہ لوگ رسم کرنے کے لیے چند دنوں میں آنے والے ہیں۔''

اجمل خان کا انداز حتمی تھا۔ وہ جو پہلی بار باپ کا تھپڑ کھا کر ساکت تھی کھڑی باپ کے منہ سے نکلے الفاظ کی سنگینی سے کانپ سی گئی تھی۔

''میرا جواب مرتے دم تک نہیں..... نہیں..... نہیں ہے۔ میں حارث کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔'' وہ ساری شرم و حیا اور مصنوعی احترام بالائے طاق رکھ کر جنونی انداز میں بول رہی تھی۔

''بے شرم لڑکی! چپ ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں زندہ دفنا دوں گا۔ تم جیسی بیٹیاں تو اللہ کسی کو نہ دے جو باپ کا سر جھکانے کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ تم میری حکم عدولی کرو، نافرمانی کر کے میری عزت خاک میں ملاؤ کیوں نہ میں تمہیں ہی خاک میں ملا دوں۔ میں آج گلا گھونٹ کر تمہیں ختم کر دوں گا۔''

اجمل خان شدید غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس کی طرف پھر بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نظر آنے لگے اور اس نے بے ساختہ اپنے سینے کو ملنا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا خان؟'' حسنہ دوڑتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور زمین پر گرنے سے پہلے اس نے اجمل خان کو تھام لیا۔ پل بھر میں اس کے چہرے کی رنگت بالکل پیلی پڑ گئی تھی اور ہونٹ نیلے ہو گئے تھے۔

''زرتاشہ! گاڑی نکالو..... جلدی کرو۔'' اس نے چیختے ہوئے خاموش کھڑی بیٹی کو پکارا۔ وہ بے حسی سے کھڑی رہی۔

بے ہوش ہوتے ہوئے شوہر کا سر فرش پر رکھ کر تیزی سے باہر کی طرف بھاگی جہاں ڈرائیور اجمل خان کا منتظر کھڑا تھا۔ اجمل خان نے ٹھنڈے پڑتے وجود اور سینے میں پھنسی ہوئی سانسوں کی تنگی سے تڑپتے ہوئے، پرسکون انداز میں سامنے کھڑی بیٹی کے چہرے پر نظر ڈالی اور بے ہوشی سے پہلے اس نے جو دیکھا، وہ کسی بھی باپ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ زرتاشہ کی آنکھوں میں نفرت کی دھند اور لبوں پر اک زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ جو بہ زبان خاموشی اس سے کہہ رہی تھی۔

''مر جائیں تاکہ میری خوشیاں مجھے مل جائیں۔''

☆☆☆

پہلی بار اسے ماں پر غصہ آیا تھا جب انہوں نے اسپتال سے واپسی کے لیے انکار کر دیا تھا۔ ڈرائیور نے فون کر کے شازمہ بیگم اور اس کے بیٹوں کو اجمل خان کے ہارٹ اٹیک کی خبر دے دی تھی۔ اسے آئی سی یو میں رکھا گیا تھا جہاں پر حسنہ کے بار بار پوچھنے پر نرس نے انتا بتایا تھا کہ ان کی حالت خطرے میں ہے اور انہیں دعاؤں کی ضرورت ہے۔

زرتاشہ بے پروائی سے بیٹھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے اسے اندر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا شخص کی ہار جیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جبکہ ہمیشہ جنونی انداز میں شوہر سے لڑنے جھگڑنے والی حسنہ ہاتھ میں تسبیح لیے ہل ہل کر کچھ پڑھ رہی تھی اس کی بھیگی ہوئی نگاہوں کا مرکز وہ بند دروازہ تھا جس کے پیچھے اجمل خان اس کی نظروں سے اوجھل بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا اجمل کو.....؟ کیسے ہیں وہ۔'' شازمہ نے بے قراری سے پوچھا، اس کے لہجے میں خدشے بول رہے تھے۔ حسنہ اور زرتاشہ دونوں نے بیک وقت دیکھا۔ سنہرے رنگ میں رنگے ہوئے ریشمی بالوں کی لٹیں اس کے گالوں کو چھو رہی تھیں۔ ماڈرن

لباس میں ملبوس وہ نازک سی عورت بالکل کانچ کی گڑیا لگ رہی تھی۔

''زندہ ہیں ابھی۔ فکر نہ کریں۔'' زرتاشہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تو وہ ہراساں سی اسے دیکھنے لگی۔

''تم.....؟'' شازمہ اس لڑکی کی شکل کیسے بھول سکتی تھی جس نے سرعام اس کو اور اس کے بچوں کو بے عزت کیا تھا۔

''اوہ تو تم ہو اس پاگل عورت کی بیٹی جس نے اجمل کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔''

وہ سمجھ گئی تھی بغور دیکھنے پر۔ اجمل کے ساتھ اس کی مشابہت صاف نظر آرہی تھی۔

''جس پاگل عورت کا آپ ذکر رہی ہو، وہ ادھر بیٹھی ہیں، اپنے پاگل پن کو ایک طرف رکھ کر اپنے بے وفا اور دھوکے باز شوہر کے لیے دعائیں کر رہی ہیں۔ واقعی پاگل ہی تو ہیں، آپ شاید نہیں جانتیں۔ اور جانیں گی بھی کیسے کہ یہ جو خاندانی ۔شریف اور باوفا عورتیں ہوتی ہیں نا، یہ بس پرستش کرنا جانتی ہیں۔''

اس نے شریف عورتیں پر زور دے کر جو کہا تھا وہ شازمہ کو آگ لگانے کے لیے کافی تھا۔ جبکہ حسنہ سارے حالات سے بے خبر اک کونے میں بدستور دعائیں مانگتے ہوئے روئے جارہی تھی، زرتاشہ نے سوچا۔

''ماں نے شازمہ کو پہچان لیا تو اس پر قیامت گزر جائے گی۔''

وہ کسی فیصلے پر پہنچ کر نرس سے بات کرتی شازمہ کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے ماں کی طرف بڑھ گئی۔

''چلیں ماں! گھر چلتے ہیں، بابا اب ٹھیک ہیں وہ جلد ہی گھر چلے جائیں گے۔'' زرتاشہ نے ماں کی اوڑھنی ٹھیک کرتے ہوئے ''چلے جائیں گے'' پر زور دیتے ہوئے شازمہ کو گھورا جو اب سر سے لے کر پاؤں تک حسنہ کو گھورے جارہی تھی اجمل خان نے کبھی دونوں بیویوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیا تھا نہ ہی بیویوں میں اتنا ظرف تھا کہ وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کی روادار ہوتیں۔

حسنہ بیٹی کا ہاتھ پکڑے ہوئے جارہی تھی کہ شازمہ کے قریب رک گئی۔

''اس کا بہت خیال رکھنا، وہ ہم دونوں کے سر کا تاج ہے اور ہمارے بچوں کے لیے سائبان بھی۔ اس کی زندگی کے ساتھ میری زندگی بھی مشروط ہے اجمل خان نہ ہوا تو حسنہ بھی نہیں رہے گی۔ تم تو دو بیٹوں کی ماں ہو، سائبان اگر نہ بھی ہوا تو سر پر چادر تو رہے گی۔ میں تو تمہارے مقابلے میں بہت کمزور ہوں۔ بلکہ میرا اور تمہارا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ میں تو کب سے ہاری ہوئی ہوں، آج تمہارے سامنے ہارنے کا اقرار بھی کررہی ہوں۔''

زرتاشہ نے ماں کو اس سے پہلے کبھی اتنا کمزور نہیں دیکھا تھا، اس وقت بھی نہیں جب اجمل خان اس کی بدزبانی یا سچائی کے جواب میں آگ بگولہ ہوکر اسے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے آتا تھا اور وہ ماں کی چیخوں کی چبھن سماعتوں سے زیادہ اپنے دل پر محسوس کرتے ہوئے کبھی تکیوں میں سر دے کر چھپنے کی کوشش کرتی اور کبھی کانوں میں انگلیاں ڈال کر دل ہی دل میں باپ کو بددعائیں دیتی رہتی تھی۔ شازمہ اس کی باتوں کے جواب میں تفاخر سے سر اٹھائے دونوں ماں بیٹیوں کو گھورے جارہی تھی۔

''شازمہ بیگم کو کیسے پہچانا آپ نے؟'' ڈرائیور انہیں گھر تک چھوڑ کر چلا گیا تو لان کی کرسی پر بیٹھی کھوئی کھوئی سی حسنہ سے وہ پوچھ رہی تھی۔

''وہ ٹھیک تو ہوجائے گا نا؟''

کیاری میں لگے زرد گلاب کو گھورتی حسنہ نے اس کا سوال جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

''شاید ٹھیک ہو ہی جائیں۔ نہ بھی ہوئے تو ہمیں کیا؟ مہینے میں ایک آدھ چکر تو دور پرے کے رشتے دار بھی لگا ہی لیتے ہیں۔ ہم اس ایک چکر کی

اتنی کمی محسوس نہیں کریں گے۔ ہاں فرق اگر پڑے گا تو شازمہ اجمل خان اور اس کے بیٹوں کو پڑے گا جن کو اپنے وجود، اپنے ساتھ کا احساس وہ پل پل دلاتے تھے۔''

وہ دل ہی دل میں سوچ کر ماں کو تسلی دیتے ہوئے کندھوں سے پکڑ کر اندر لے جانے لگی اگر اس کی سوچوں کو الفاظ مل جاتے تو حسنہ کو تکلیف ہوتی اس لیے وہ چپ ہی رہی۔

موسم میں خنکی بڑھ چکی تھی

''ماما جان! طبیعت ٹھیک ہے نا؟'' ماں کے ٹھنڈے ہاتھوں کو وہ اپنے ہاتھوں سے ملتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''مجھے اجمل کے ساتھ یوں لڑنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ تمہارا باپ ہے، تمہارے بارے میں فیصلے کا اختیار اسے حاصل ہے۔ میری وجہ سے وہ بستر مرگ تک پہنچ گیا ہے۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی۔

زرتاشہ کو اب ضبط کرنا مشکل لگنے لگا تھا تب ہی تو وہ یکدم پھٹ پڑی۔

''اور آپ جوان کی وجہ سے زندہ درگور ہیں۔ اور میں؟ جو ہر لمحہ اپنی ماں کو اپنے ہی کندھوں پر سر رکھ کر اپنا ماتم کرتے دیکھتی رہتی ہوں۔ دوسری شادی کے بعد جو شخص دو بیویوں کے درمیان انصاف کے تقاضوں کی پاس داری نہ کر سکے، اس کا جینا مرنا، ہونا نہ ہونا ہمارے لیے برابر ہے۔''

وہ بولتے بولتے حلق میں پھنسے آنسوؤں کے پھندے کو بمشکل اندر دھکیلنے لگی تھی۔

اس نے دیکھا، حسنہ تیزی سے تسبیح کے دانے گرانے لگی تھی۔ اور اسی تیزی سے اس کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح اس کی اوڑھنی میں گر کر جذب ہو رہے تھے۔

☆☆☆

''میں فون کرتی ہوں ہاسپٹل، آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے ماں کی سوجی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی دیکھ کر بیزاری سے کہا تو حسنہ نے جلدی سے ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھ لیے

''کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ بابا کا فون آن ہے لیکن نو رسپانس۔ میرے پاس اور کسی کا نمبر نہیں۔ ہاسپٹل کا بھی نہیں۔'' زرتاشہ نے معذوری ظاہر کی۔ وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

''تم جاؤ اسپتال۔''

زرتاشہ نے ماں کے حکم پر منہ بناتے ہوئے اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے جاتی ہوں میں، صرف اور صرف آپ کی خاطر۔'' اس نے جتایا تو وہ اک آہ بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

''اوہ تو تم ہو؟'' شازمہ بیگم نے اسے انتہائی حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک رات دن گزر جانے کے بعد ماں کے مجبور کرنے پر ہسپتال آئی تھی۔ پرائیویٹ روم کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے زرتاشہ، شازمہ یا اس کے کسی بیٹے کے نکلنے کی توقع کر رہی تھی۔

''کیسے ہیں آپ کے شوہر.....؟ بچ گئے نا۔ اس کا جلا بھنا انداز شازمہ بیگم کو تپا گیا۔

''تم نے تو ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ مر جائے لیکن اللہ نے شاید میری اور میرے بچوں کی دعائیں سن لی ہیں، اس لیے اب وہ بالکل ٹھیک۔''

وہ اطمینان بھرے انداز میں بولی تو زرتاشہ نے کندھے اچکاتے ہوئے یوں ظاہر کیا جیسے کسی کے جینے یا مرنے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ میرے خیال میں تمہیں میرے کہنے سے پہلے ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ مجھے ڈاکٹرز نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ مریض کو کوئی ٹینشن نہیں دینی۔ اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اجمل کی سب سے بڑی پریشانی تم ہی ہو۔'' وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہی تھی

''اوہ تو انہوں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا؟''

''تمہیں تو اچھی طرح سے یاد ہوگا اس دن ہوٹل والا قصہ؟ اب میرا نمبر ہے، بدلے کے لیے تیار رہو میری باری بہت خطرناک ہوگی۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن میں نے تمہیں اس لڑکے سے شادی نہیں کرنے دینا۔ تمام عمر تمہارے دل میں یہ حسرت رہے گی اور جب جب تم جلوگی۔ تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ضرور ہوگا۔''

وہ واضح الفاظ میں زرتاشہ کو دھمکی دے رہی تھی۔

بات کے اختتام پر زرتاشہ کی سرخ رنگت اور شعلے اگلتی آنکھیں دیکھ کر شازمہ بیگم کو اندر ہی اندر اک کمینی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کا بس زیادہ سے زیادہ میرے باپ پر چلتا ہے۔ تو کرلیں اپنی من مانی لیکن ایک بات کہہ رہی ہوں کہ مجھے بغاوت پر مجبور نہ کریں ورنہ اندر جو دل کا مریض پڑا ہے، وہ بدنامی کا جھٹکا برداشت نہیں کر سکے گا۔ اور آپ بچوں سمیت سڑک پر آ جائیں گی۔''

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو شازمہ نے زوردار قہقہہ لگایا اور زہریلے انداز میں بولی۔

''زرتاشہ بی بی! تم اس گمان میں نہ رہنا۔ اجمل نے اپنا سب کچھ اپنی زندگی میں میرے نام کر دیا ہے تم دیکھ لوگی تمہاری قسمت میں وہی شرابی اور لوفر ہی ہوگا جو میں نے اور تمہارے باپ نے تمہارے لیے پسند کیا ہے کیونکہ تم جیسی سازشی ذہن کی لڑکی کے لیے ایسا ہی مرد ہونا چاہیے۔ واہ کیا جوڑی ہوگی تم دونوں کی۔ بیوی جھوٹی اور چالاک، جل کٹڑی بلکہ نفسیاتی مریضہ اور شوہر شرابی و جوئے باز۔'' اس کی طنزیہ ہنسی کے جواب میں زرتاشہ نے ایک جلتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور یہ کہہ کر پاؤں پٹختی ہوئی نکل گئی۔

''جیسے آپ دونوں کی جوڑی ہے ایک بے وفا اور ناانصافی کرنے والا مرد اور ایک بدکردار اور لالچی عورت۔'' شازمہ بیگم کے تن بدن میں شعلے سے بھڑک گئی تھی وہ۔

☆☆☆

''میں تمہیں ساری زندگی رونے پر مجبور کر کے چھوڑوں گی زرتاشہ اجمل خان۔'' وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے بار بار زیر لب دہرا رہی تھی۔

''میں تو ویسے بھی تم سے اور تمہاری ماں سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ اور اب یہ سب جان لینے کے بعد کہ تم اجمل خان کی بیٹی ہو۔ تم جس نے ہوٹل میں اتنے لوگوں کے سامنے ہمیں ہماری عزت سمیت ڈوبنے کا کر دیا تھا۔ اب باری میرے انتقام کی ہے، تم دیکھ لوگی کہ میں تمہاری رگوں میں اذیت کا ایسا زہر بھر کر چھوڑوں گی کہ تمہاری نسلیں بھی یاد رکھیں گی کہ ایک شازمہ بیگم آئی تھی اس خاندان میں۔'' اس کے اندر بھانبھڑ جل رہے تھے۔ کسی طرح چین نہیں آ رہا تھا۔

''کیوں بے چین ہو شازمہ؟ بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ مسلسل ٹہل رہی ہو اور کوئی بہانا مت کرنا کیونکہ یہ تو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ تم جب پریشان ہوتی ہو، تب ہی اس طرح ٹہلتی ہو۔'' وہ اپنی بیماری بھول کر اس کی پریشانی کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے بس آپ کی بیماری کی ٹینشن ہے ورنہ تو آپ نے کیا نہیں دیا مجھے؟ میرے جیسی خوش نصیب عورت تو دنیا میں شاید ہی کوئی دوسری ہو۔ آپ نے ہمیشہ محبت اور عزت کے ساتھ ساتھ میری ہر خواہش کی تکمیل کی۔ اور آپ کا یہ احسان تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی کہ آپ نے اپنا سب کچھ اس بیماری میں میرے نام کر دیا ہے۔ میرے دل میں ہر وقت ایک خدشہ رہتا تھا کہ کہیں خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو میں اور میرے بیٹے۔ آپ کی خاندانی بیوی اور آپ کے خاندان کے ساتھ..... لڑنے جھگڑنے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اور آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہمارا آپ کے

علاوہ اور کوئی ہے بھی نہیں۔''

وہ اسپتال کے بستر کی سفید چادر پر رکھے اجمل خان کے زرد اور مرجھائے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بہت ہی پیار سے بول رہی تھی۔ اجمل خان کو شاز مہ کا یہی نرم لہجہ اور پیار لٹاتی آنکھیں اچھی لگتی تھیں۔ اور اس نرم گفتاری اور مٹھاس بھرے انداز نے ہی تو اسے اپنا گرویدہ بنا کر چھوڑا تھا۔ ایسا سحر تھا اس عورت میں کہ وہ اپنی پہلی محبت جس کا بیج بچپن میں ہی اس کے دل میں لگ چکا تھا بھول چکا تھا۔

''شاز مہ جان! تم ایسی باتیں کر کے مجھے اجنبی کیوں کرتی ہو جب میں تمہارا ہوں تو میری ہر چیز بھی تمہاری ہی ہوئی نا؟ اس گھر میں میرا کچھ بھی نہیں ایک پاگل عورت جو ہر وقت لڑنے کے لیے تیار رہتی ہے اور ایک ایسی لڑکی جو کہ پرائی امانت ہے۔ میری نسل بڑھانے کے لیے مجھے دو بیٹوں کا تحفہ تم نے دیا ہے۔ اب مجھے مرنے سے پہلے یہ افسوس تو نہیں ہوگا کہ دنیا میں کوئی میرا نام لیوا نہیں رہے گا۔'' اجمل خان کی کمزور آواز سے اس کے اندر کی تکلیف ظاہر ہو رہی تھی۔

شاز مہ بظاہر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس کے اندر نفرت کی تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس نے اپنے اندر چلنے والی نفرت کی کی ہوا بھی اجمل خان کو لگنے نہیں دی

☆☆☆

''حارث! تم نے اپنی والدہ سے ہمارے رشتے کی بات کی ہے؟''

وہ آج روزانہ سے زیادہ کھوئی کھوئی اور بے چین نظر آ رہی تھی۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے پیاری؟''

حارث نے اس کے خوب صورت چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر پوچھا۔

''حارث! عام حالات میں تو مجھے شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی لیکن اب میرا رشتہ میری سوتیلی ماں اور باپ نے اپنے رشتے کے ایک بھتیجے سے طے کر دیا ہے جو انتہائی لوفر آدمی ہے اور دو بیویاں پہلے ہی بھگتا چکا ہے اور میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ جیسے ہی بابا۔ ہسپتال سے گھر آئیں گے۔ سب سے پہلے وہ منگنی یا نکاح کی بات کریں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے اس فیصلے سے پہلے ہی معاملات طے پا جائیں۔'' اس نے ساری بات حارث کو سمجھائی۔

''فرض کرو زرتاشہ! اگر میری والدہ اور تمہارے بابا میں سے کوئی نہ مانا تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گی اور کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ کر مجھے بھول جاؤ گی؟'' وہ سوال پوچھ کر بے چینی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''حارث! آج تو یہ بات کی ہے مگر آئندہ تمہارے منہ سے میں یہ بات کبھی نہ سنوں۔ ہم دونوں کو اگر کوئی چیز جدا کر سکتی ہے تو وہ موت ہے۔ باقی کوئی چیز بھی مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتی۔''

جذبات کی شدت سے اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''اور اگر میں یہ کہوں کہ مجھے تمہاری اس بات پر اعتبار نہیں ہے تو پھر تم مجھے کیسے یقین دلاؤ گی؟'' جانے کیوں اس نے یہ سوال کر دیا تھا۔ وہ پل بھر کے توقف کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ کر مضبوط انداز میں بولی

''سوائے گناہ کے تمہیں جس شکل میں چاہیے میں اعتبار دینے کے لیے تیار ہوں، تم جو چاہتے ہو میں وہ کروں گی، میں نے تم سے سچی محبت کی ہے اور اگر تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے تو مجھے پورا یقین ہے، تم مجھے کبھی بھی گناہ کے رستے پر چلنے کا نہیں کہو گے۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تو وہ مسکرا دیا

''اس یقین کے لیے شکریہ۔ میرے ساتھ کورٹ میرج کر سکتی ہو آج، ابھی اور اسی وقت؟'' وہ ہاتھ پکڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

وہ دونوں اس وقت پارک کے اک نسبتاً سنسان گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے اپنے

آپ پر حیرت ہوتی تھی، حارث سے ملنے سے پہلے وہ جب بھی کسی پارک میں اس طرح کے جوڑوں کو دیکھتی تھی تو اسے کوفت ہوتی تھی کہ کیسے یہ لوگ رشتوں کو دھوکا دے کر سر جوڑے سرگوشیوں میں محبت کی باتیں کر رہے ہیں۔ سچی محبت کو چیٹ کر کے جھوٹی محبتوں کا ایک دوسرے کو اعتبار دلا رہے ہیں۔ آج اسی طرح سنسان گوشے میں سر جوڑے وہ ایک غیر مرد کے ساتھ پارک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ حارث کی بات سن کر اس نے صرف ایک پل کے لیے سوچا اور دوسرے ہی پل بولی۔

''چلو، چلتے ہیں لیکن یہ کپڑے ٹھیک رہیں گے؟''

وہ گھاس پر سے کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھی اور اپنے لباس کی طرف دیکھ کر اس سے یوں پوچھنے لگی جیسے کہیں آئس کریم کھانے کے لیے جانے کی بات ہو رہی ہو۔

حارث نے اس کی فوری 'ہاں' سننے کے بعد حیران نظروں سے اسے دیکھا پھر اس کے پوچھنے پر سر سے پاؤں تک تنقیدی نگاہ سے اس کا جائزہ لیا ہلکے سبز رنگ کے کرتے میں جینز اور بڑے سے سبز دوپٹے میں کھلے بالوں کے ساتھ بیک وقت ماڈرن اور مشرقی دونوں انداز اس کے لباس میں سے جھلک رہے تھے۔

''بہت خوب صورت لگ رہی ہو اس لباس میں بھی اور ہر لباس تم پر جچتا ہے۔ ہمارے ہاں نکاح کا جوڑا سبز ہی بناتے ہیں کیونکہ اس طرح سب کا خیال یہ ہے کہ لڑکی کی زندگی سرسبز و شاداب رہتی ہے سمجھو یہ اک رسم بھی ہے۔'' اس کے یوں کہنے پر وہ شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''حارث حسن! مجھے لگتا ہے یہ تمہارا پہلا نکاح نہیں ہے کیونکہ تمہیں تو ساری معلومات ہیں اس بارے میں۔'' زرتاشہ نے محسوس نہیں کیا لیکن اس کی بات سن کر حارث کی رنگت متغیر ہو چکی تھی۔

''ارے خدا خدا کرو، مجھے تو تمہاری وہ بات یاد آ رہی ہے جو تم نے یک شاپ پر میرے بارے میں بڑے یقین سے کہی تھی۔

چلو آج ہم زمانے کو دکھا دیتے ہیں کہ کاتب تقدیر نے بھی آسمانوں پر کہیں ہمارے نام ایک ساتھ لکھ رکھے ہیں۔

''اگر تم کہو تو میں پہلے تمہارے لیے نکاح کا سوٹ اور کچھ زیور خرید لیتا ہوں۔''

وہ اس کی بات سن کر گاڑی کا دروازہ کھولے وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔

''سنو حارث!'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''لباس اور بناؤ سنگھار سے کچھ نہیں ہوتا۔ کاش والدین یا دیگر گھر والے اپنی یہ روش چھوڑ دیں۔ یہ لوگ زندگی کا ساتھی تو اپنے بچوں کے لیے بنا سوچے سمجھے پسند کرتے ہیں اور لباس اور زیورات خوب سوچ بچار اور بہتر سے بہتر کی تلاش کر کے منتخب کرتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں باپ اور سوتیلی ماں کی وہ شکلیں گھوم رہی تھیں جو اس کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے الفاظ سے زیادہ چہروں کی سختی سے اسے دھمکا رہی تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' حارث ڈرائیو کرتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ ہی کہ محبت پہلی بار مجھ پر مہربان ہوئی ہے ورنہ تو بچپن سے ہی یہ مجھ سے روٹھی روٹھی رہتی تھی۔'' وہ بہت خوش تھی۔ حارث اس کی بات سن کر نظریں چرانے لگا تھا

''تم نے سوچا ہے کہ تمہارے گھر والوں پر کیا گزرے گی جب کہ تمہارے والد ہسپتال میں ہیں اور دل کے مریض بھی ہیں؟'' وہ اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''حارث! میرے باپ نے بھی تو نہیں سوچا تھا دوسری شادی کرتے ہوئے کہ میری ماں بہت حساس عورت ہے اور اس سے بہت محبت بھی کرتی ہے..... چلو ماں کو بھی چھوڑو۔ اس نے تو کبھی میرے لیے بھی نہ سوچا۔''

وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں اس شدت سے بھینچ رہی تھی کہ اس کے دودھیا سفید ہاتھوں پر سرخ نشان پڑ گئے تھے۔

☆☆☆

چند گھنٹوں میں ہی وہ حارث کے ایک دوست وکیل کے آفس میں موجود تھے نکاح کے لیے۔

''حامد بھائی! کورٹ میرج کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ کیا یہ نکاح مکمل ہوتا ہے؟ کیونکہ گناہ کی زندگی میرا چناؤ نہیں ہوگی بلکہ مجھے اس کے مقابلے میں عزت کی موت قبول ہے۔'' اس نے وکیل سے بڑے مدبرانہ انداز میں سوال کیا تو وہ حارث کی طرف دیکھنے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ''یار اسے سمجھا کر نہیں لائے ہو؟''

''جی میری بہن! قانون کے مطابق ولی کی مرضی بالغ خاتون کی شادی کے لیے ضروری نہیں۔ کوئی بھی بالغ عورت اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ شادی کر سکتی ہے اور یہ نکاح مکمل ہی ہوتا ہے۔''

پوری تفصیل بتا کر وہ چپ ہوا تھا کہ زرتاشہ مڑ کر نکاح خواں مولانا صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''مولانا صاحب! آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟ میں چاہتی ہوں کہ ہمارا نکاح ہر لحاظ سے مکمل اور اسلامی و قانونی طریقے سے ہوتا کہ کوئی اعتراض نہ اٹھا سکے اور نہ ہی میرے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو۔'' وہ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور حارث کو ہمیشہ سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

''میری بیٹی! میں اگر آپ کو بیٹی کہہ رہا ہوں تو ایک بزرگ کی طرح صحیح بات آپ کو بتانا بھی میرا فرض ہو گیا ہے، بحیثیت ایک مسلمان بھی یہ حقیقت میرے پاس امانت ہے۔''

''مگر مولانا صاحب! نکاح کے لیے لڑکی لڑکے کی بلوغت اور رضامندی کے ساتھ دو گواہان کی گواہی ضروری ہے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اور یہ سب کچھ اس وقت اس مقام پر ہو رہا ہے کورٹ میرج کا مطلب یہ ہوا کہ نکاح کو رجسٹر کروا رہے ہیں تاکہ کل کلاں کو لڑکی کے والدین کوئی قانونی جھگڑا نہ کر سکیں۔ لڑکی اپنا حلفیہ بیان لکھواتی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوئی بلکہ اس نے اپنی مرضی اور پسند سے یہ نکاح کیا ہے..... بس اتنی سی بات ہے۔'' وکیل نے تفصیلات بتائیں تو اس کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں نظر آنے لگیں۔

''پلیز حامد بھائی! آپ مولانا صاحب کو بھی اپنا پوائنٹ آف ویو بتانے دیں۔'' زرتاشہ کے کہنے پر حارث اور ایڈووکیٹ حامد ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

مولانا صاحب نے اسے تفصیل سے شرعی مسئلہ بتایا کہ ولی کی مرضی ضروری ہے۔ وہ سمجھ تو نہ سکی لیکن متذبذب ضرور ہو گئی۔

اب تو سارا معاملہ ہی مشکوک ہو چکا تھا، اس نے نظر اٹھا کر حارث کی طرف دیکھا اور حارث نے پل بھر میں اس کی آنکھوں میں انکار پڑھ لیا۔ وہ گناہ کی زندگی کسی صورت قبول نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پریشان تھا، حامد ان کو گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔

''تم دونوں ایسا کرو کہ ایک دن مزید اس معاملے میں سوچ سمجھ لو پھر جو بھی فیصلہ باہمی رضامندی سے طے پا جائے، اس سے مجھے آگاہ کر دینا، میں سب کچھ دوبارہ سے ارینج کروا دوں گا۔ فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بہتری ہوگی حالانکہ کئی نکاح میں اسی طرح کروا چکا ہوں لیکن زرتاشہ بہن کے دل میں اگر کچھ شکوک و شبہات ہیں دین کے حکم کو لے کر تو یہ اپنی مکمل تسلی کروالیں۔''

حارث کی تیوریوں کے بل زرتاشہ کے دل پر چھری چلا رہے تھے۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم اپنے اس فیصلے پر پچھتا رہی ہو اور کہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے اسی لیے بہانا کر رہی ہو۔'' حارث نے گاڑی ڈرائیو

کرتے ہوئے بجھی ہوئی آواز میں گلہ کیا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''حارث! کبھی بھی میری وفا، میری محبت پر شک نہ کرنا ورنہ میں زندہ نہیں رہوں گی۔ مجھے گناہ کی زندگی سے بہت ڈر لگتا ہے بے شک میں فیشن ایبل ہوں، ماڈرن ہوں ہر طرح کا لباس پہنتی ہوں پر اعتماد بھی ہوں اور اتنا بڑا فیصلہ کر کے گھر سے بھی نکل آئی ہوں لیکن میں اندر سے بہت ہی مذہبی قسم کی صاف ستھری سوچ رکھنے والی لڑکی ہوں۔ میرے سوالوں کے جواب ہی مجھے دلی سکون بخش سکتے ہیں جو چیز مذہب میں مشکوک ہے۔ وہ مجھے سکون کیسے بخشے گی؟'' اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

''لیکن تم تو کہتی تھیں کہ تمہارے والد ٹھیک ہوتے ہی تمہارا نکاح پڑھوا دیں گے۔ تم نے تو مولانا صاحب سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اگر بیٹی رضامند نہ ہو اور والدین زبردستی اس کا نکاح کر دیں تو کیا یہ نکاح ہو جاتا ہے؟''

حارث کے چبھتے ہوئے لہجے نے زرتاشہ کو اداس کر دیا تھا۔

''میں نے تم سے کہا ہے کہ نکاح جیسے پاکیزہ رشتے کو لے کر میں کوئی بھی شک اپنے دل میں نہیں رکھ سکتی..... تو میں اپنی مرضی کے خلاف کسی اور کی زندگی میں کیسے شامل ہو سکتی ہوں؟ جیسا کہ ہم دونوں جانتے ہیں، اسلام دین فطرت ہے اور فطری تقاضوں پر بند باندھنے کے کے لیے جو حلال رستہ اللہ تعالیٰ نے دکھایا ہے، اس کی خلاف ورزی مجھے اور کسی بھی مسلمان مرد و زن کو کسی صورت گوارا نہیں ہوگی۔''

اس کی بات سن کر وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے، پانی جب سر کے اوپر پہنچ جائے گا تب تمہیں ڈوبنے کا احساس ہوگا مگر اس وقت پچھتانے کے لیے بھی کچھ نہیں رہے گا۔'' وہ اسے گھر چھوڑ کر واپس چلا گیا لیکن واپسی کا رستہ بہت لمبا لگا تھا دونوں کو کیونکہ دونوں کے درمیان تیسری اداسی تھی۔

☆☆☆

رات بھر وہ اس معاملے پر سوچتی رہی کہ کیسے باپ کو راضی کرے، یہ ہی سوچتے ہوئے وہ نیند کی مہربان آغوش میں کھو گئی۔ کوئی طریقہ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

دوسری صبح وہ سو ہی رہی تھی کہ باہر سے کچھ ملی جلی آوازیں شور کی صورت سنائی دینے لگیں۔ وہ پر تجسس انداز میں باہر نکلی تو اجمل خان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور چند آدمی گھر میں سامان رکھ رہے تھے۔

زرتاشہ نے حیرت سے دیکھا۔ بڑے بڑے مٹھائیوں کے ٹوکرے، پھلوں کی پیٹیاں، کچھ برتنوں کے سیٹ اور دیگر چیزیں ادھر ادھر رکھی جا رہی تھیں۔ وہ بال سمیٹتے ہوئے باہر نکل کر باپ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دل کے دورے کے بعد اجمل خان آج پہلی بار گھر آیا تھا۔ زرتاشہ نے سرسری نظر سے ہی دیکھ لیا تھا کہ باپ کی رنگت بالکل زرد اور وزن بہت کم لگ رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے بابا؟'' اس نے باپ سے سوال کیا تو وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ناگوار لہجے میں بولا۔

''بجائے اس کے کہ تم مجھ سے پوچھو کہ کیسے ہیں بابا؟ تم پوچھ رہی ہو کہ یہ سب کیا ہے بابا۔ کسی اندھے کو بھی سمجھ میں آ جائے کہ یہ سب کسی تقریب کا سامان ہے۔ آج شام میرے بھتیجے نبیل خان سے تمہارا نکاح ہو رہا ہے۔ یہ نکاح کا جوڑا دیکھ لو، شہر کے سب سے بڑے ڈیزائنر سے لیا ہے پارلر کی بکنگ ہو چکی ہے، ایک بجے ڈرائیور لے جائے گا۔ حسنہ کے کپڑے اسے دے کر آتا ہوں، دس بارہ لوگ ہوں گے ان کی طرف سے۔''

کچھ ڈبے نوکر نے اٹھا رکھے تھے، اپنا حکم سنا کر وہ بیوی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زرتاشہ ساکت سی کھڑی سامنے رکھے ڈبوں کو دیکھ رہی تھی۔

''تو وہ وقت آ ہی گیا؟ اس نے اک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سوچا اور دل ہی دل میں اک فیصلہ کر کے مطمئن ہوگئی۔

اسے جو بھی کرنا تھا، سمجھ داری سے کرنا تھا کیونکہ کوئی بھی نادانی اسے حارث سے ہمیشہ کے لیے جدا کرسکتی تھی۔ اسے موت سے بھی ڈر نہیں لگتا تھا بس حارث سے جدائی ڈراتی تھی۔

''اجمل خان اور شازمہ بیگم کو میں نے جیتے نہیں دینا۔'' وہ آئندہ کے لیے سوچے ہوئے اپنے خیال پر ڈٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''اللہ میری بیٹی کے نصیب بہت اچھے کرے گا ضروری تو نہیں کہ ماں بیٹی کی تقدیر ایک جیسی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اجمل کے خاندان میں سارے مرد ہی بے حس ہوں۔''

باپ نے اس کے چہرے پر بغاوت کی تپش ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ تو شبنمی ٹھنڈک چہرے پر سجائے مسکرائے جارہی تھی۔ وہ بھی مطمئن ہوگیا کہ غشتق کا بھوت بیٹی کے سر سے اتر گیا ہے۔

''تم آؤ تو پھر میں بھی تیار ہوتی ہوں۔ زیادہ لوگ نہیں ہیں، بس لڑکے کے گھر والے ہیں۔'' ماں مسلسل بولے جارہی تھی۔

''آپ کے شوہر کی دوسری بیگم اور بچے نہیں ہوں گے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں۔ میں نے انہیں منع کردیا ہے بے شک ذہنی سکون کی دواؤں نے مجھے کچھ بے حس سا کر رکھا ہے لیکن اب ایسی بے حسی بھی نہیں کہ میں سوکن کو اپنے گھر میں برداشت کرسکوں۔''

اس نے گھر سے نکلتے ہوئے ماں کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ حسنہ نے اسے حیرانی سے دیکھا اور دل ہی دل میں اٹھتے خدشات کا سر اعتبار کی چھری سے کاٹ دیا۔ وہ گھر سے نکلتے ہوئے بابل کے آنگن اور ماں کے چہرے کو بار بار دیکھ رہی تھی آخری نظر میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

ماں کے لہجے کی بے بسی پہلے تو اسے جلا دیتی تھی اسے الجھن ہوتی تھی کہ ماں کی عزت نفس کیسے مر چکی ہے، وہ شخص جو اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ جتنا کوئی انسان کسی ملازم کو سمجھتا ہے۔ محبت اور عزت تو دور کی بات ہے۔ لیکن اب محبت کے گورکھ دھندے میں پھنس کر اسے احساس ہوا تھا کہ محبت کتنی بے بس کرنے والی چیز ہے۔

''مجھے معاف کردینا ماں۔'' اس نے سسکتے ہوئے ماں کی پشت کو گھورا۔

جو لوگ خواہشات کی انگلی پکڑ لیں وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے، وہ بھی مڑ کر دیکھنے کے بجائے سامنے دیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

''میں تمہیں پارلر سے لینے آجاؤں گا لیکن مسئلہ تو پھر بھی وہی رہے گا۔ جب تک تم کوٹ میرج کے بارے میں مطمئن نہ ہو، ہمارا نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ پریشان تھا۔ ''اب مجھ میں اتنا دم خم بھی نہیں کہ میں تمہیں سامنے دیکھ کر اپنا نہ بناؤں اور اسی دید اور درشن کی لذت سے خود کو بہلاتا رہوں۔'' وہ شوخ ہوا تو زرتاشہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں نے رات اپنی استانی جی سے استخارہ کروا لیا ہے۔ بابا کے آنے سے پہلے میری ان سے بات ہوئی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ میری اور تمہاری شادی کے لیے انہیں کوئی اشارہ نہیں ملا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ۔ آج نہیں..... لیکن کبھی تو بابا مان ہی جائیں گے۔ تب تک یہ نکاح زمانے کے لیے ہی ہو گا جو ہمیں کاغذ کے ایک ٹکڑے کی موجودگی میں جدا نہیں کرسکیں گے، ہم لوگوں کے لیے قانونی میاں بیوی ہوں گے مگر ایک دوسرے سے اس وقت تک دور رہیں گے جب تک نکاح کی اہم شرط پوری نہ ہوجائے۔''

اس کے پاس اب کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ رستہ غلط ہے اسی پر چلنے کے لیے راضی ہوچکی تھی کیونکہ اس رستے کی منزل اسے

حارث کی صورت میں ملنے والی تھی۔ دین کا بتایا ہوا سیدھا رستہ اسے اپنی محبت سے دور لے جا رہا تھا۔ وہ بھی ایک ہی رات میں اس کی کایا پلٹ پر خوش گوار سی حیرت کا شکار تھا۔

''ٹھیک ساڑھے چار بجے حارث گاڑی لے کر پارلر کے پچھلے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ زرتاشہ کے ساتھ آئی ہوئی نوکرانی کو خصوصی ہدایات تھیں کہ وہ اسے آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دے۔ زرتاشہ تیاری کے بعد فوٹو سیشن کے لیے جانے لگی تو میراں نے بھی ساتھ جانا چاہا۔

''میراں! میں کوئی بھاگی تو نہیں جا رہی۔ تم اب میرے سر پر کھڑی نہ رہو، جا کر ادھر بیٹھو۔'' اس نے نوکرانی کو ڈانٹ پلائی۔

''ون منٹ پلیز۔ میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔'' فوٹو گرافی کے کیمرے اور روشنی کی سیٹنگ کرتے لڑکے نے جواباً اسے مسکرا کر دیکھا اور وہ چوڑی دار پاجامے کے ساتھ کامدار انارکلی فراک کا بڑا سا گھیر سنبھالے باہر نکل گئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''ارے..... ماشاءاللہ تم کتنی پیاری لگ رہی ہو یوں لگ رہا ہے جیسے آسمان سے کوئی حور اتر کر زمین پر آ گئی ہو۔'' وہ حارث کے ان جملوں سے سرخ ہو گئی تھی۔

''اتنے مہنگے ڈیزائنر سوٹ اور شہر کے سب سے بڑے پارلر کے میک اپ کا کمال ہے۔'' اس نے خود کو گاڑی کے سامنے والے شیشے میں دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا

''جتنا جلدی نکل سکتے ہو، یہاں سے نکلو۔ یہ باتیں بعد میں ساری زندگی کرتے رہنا۔''

اب اس کا دل ہلکے سے خوف سے اندر ہی اندر کانپ رہا تھا لیکن بظاہر اس نے خود کو پرسکون رکھا ہوا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ نے اس جرم کی سزا موت سے کم نہیں دینی تھی۔

''اس وقت تو حامد بھی آفس میں نہیں ہوگا، میں اس سے کہتا ہوں۔ وہ گھر میں نکاح کی ارینجمنٹ کرے اور کل وہ کاغذات تیار کر دے گا اور پھر عدالت کے سامنے تمہارا حلفیہ بیان اور رجسٹریشن بھی ہو جائے گی یوں نکاح کے سارے لوازمات پورے ہو جائیں گے سوائے تمہارے باپ کی رضامندی کے۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر ہاتھ میں پکڑا موبائل بند کرنے لگی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ باپ کی پہنچ بہت اونچے لیول تک ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ اجمل خان اپنی عزت بچانے کے لیے اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اسے اگر فکر تھی تو صرف اپنی ماں کی۔

''لیکن پہلے ماں کی کون سی عزت ہے اس گھر میں جس کے ختم ہونے کا میں افسوس کروں؟'' اس نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی اور موبائل سے سم نکال کر دو ٹکڑے کرتے ہوئے گاڑی سے باہر پھینک وہ پیچھے والوں کے لیے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ بلکہ ہلکی پھلکی ہو کر نئی زندگی کی شروعات کرنا چاہتی تھی۔ نئی زندگی جس میں رنگ، روشنیاں، خوشبو اور تعبیریں ہوں گی۔

☆☆☆

''یہ ہے میرا گھر۔'' ایک خوب صورت پھولوں سے گھرے بنگلے کے کار پورچ میں گاڑی روک کر اس نے زرتاشہ کا ہاتھ پکڑا اور وہ اپنے محبوب کے سنگ بڑے ناز سے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اس کے دل میں قطعی یہ خوف نہیں تھا کہ وہ بغیر نکاح کے ایک نامحرم کے ساتھ اس کے گھر میں پوری رات کیسے گزارے گی؟ اس وقت اسے اپنی مظلوم اور تنہا ماں کی فکر بھی نہیں تھی جس کی ساری کائنات فقط ایک بیٹی ہی تھی۔

بڑے سے برآمدے میں سے ہو کر خوب صورت منقش دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی اسے گھر کی سجاوٹ نے مسحور سا کر دیا تھا۔

''واؤ، اتنا خوب صورت گھر اور اس پر یہ

کلاسیکل سجاوٹ، یہ تو میرے خوابوں کے گھر سے بھی زیادہ حسین ہے۔''

اتنے امیر باپ کی بیٹی ہو کر بھی وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے کسی جھونپڑے سے نکل کر آئی ہو، سر پر سیٹ کیے ہوئے دوپٹے اور خوب صورت میک اپ نے اسے ایک عجیب ہی روپ بخشا ہوا تھا۔ اسے اپنی خوب صورتی کا احساس تھا اسی لیے تو ایک مغرورسی مسکراہٹ اس کے نازک لبوں پر چپک سی گئی تھی۔

اس نے بغور اپنے آس پاس دیکھا خوش رنگ دیواروں پر سجی پینٹنگز شیشے کے ڈیکوریشن پیسز اسٹائلش پردے قیمتی منقش فرنیچر ہر چیز سے خوب صورتی اور سجانے والے کا اعلا ذوق جھلک رہا تھا۔

''ارے مجھے تو اس پورے گھر میں تمہارے بیٹھنے کے لائق کوئی چیز ہی نظر نہیں آرہی۔ جی چاہتا ہے تمہیں پلکوں پر بٹھائے رکھوں یا دل کی مسند پر گاؤ تکیہ لگا کر بٹھا دوں، زمین پر پاؤں ہی نہ رکھنے دوں۔'' وہ اس کی وارفتی پر شرما گئی تھی۔

''اب تک تمہارا گھر مہمانوں سے بھر گیا ہوگا اور نوکرانی نے ساری صورتحال تمہارے گھر والوں تک پہنچا دی ہوگی۔ مطلب تمہارے باپ کی بے عزتی کا آغاز ہو گیا ہے۔'' وہ گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا تو زرتاشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہ میرے بابا ہیں۔ میرا ان کی طرف بہت حساب نکلتا ہے سو میں جو بھی ان کو کہوں لیکن مجھے تمہارے منہ سے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔'' زرتاشہ کے انداز میں ناگواری تھی۔

جواباً وہ عجیب سے جنونی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اوہ باپ کی بے عزتی اچھی نہیں لگ رہی؟ کیوں وہ بھی تو ایک مرد ہے اور دوسرے مردوں سے نفرت کی وجہ بھی وہی ہے پھر میرے منہ سے یہ سچ کڑوا کیوں لگ رہا ہے؟'' اس کے لہجے کی تلخی نے زرتاشہ کے اندر اٹھتے خدشات کی آگ کو ہوا دے کر تیز کر دیا تھا۔ وہ غصے میں کچھ بولنے کے لیے ابھی منہ کھول ہی رہی تھی کہ حارث اسے نفرت سے گھورتے ہوئے بول پڑا

''تم چپ کر کے بیٹھ جاؤ زرتاشہ بی بی! ابھی تم نے بہت سی انہونیاں دیکھنی ہیں تمہارے اندر اٹھتے ہوئے سوالوں کے جواب تمہیں تھوڑی دیر میں مل جائیں گے۔'' وہ دم بخود سی اسے دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔

''یہ وہ حارث تو ہرگز نہیں جس سے میں نے پیار کیا ہے جس کی خاطر میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر آ گئی ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی نفرت دیکھ کر حیرت سے سوچ رہی تھی۔

''حارث! مجھے تمہاری شکل دیکھ کر خوف آ رہا ہے اگر یہ تمہارا اصلی چہرہ ہے تو خدارا اتنی جلدی تو محبت کا نقاب نہ اتارو۔'' اس نے بے اختیاری میں ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کے ساتھ کا میچنگ پاؤچ تقریباً بھینچتے ہوئے کہا تو وہ عجیب سے انداز میں زہریلی ہنسی ہنس کر اسے گھورنے لگا۔

''میں تمہاری ماں سے ملنا چاہتی ہوں حارث۔''

''قبرستان میں ہے میری ماں اور فاتحہ کے لیے نہیں گئی وہ وہاں کسی پیارے کی قبر پر۔ بلکہ اک قبر میں ہمیشہ کی نیند سو رہی ہے اور اس کی موت کی وجہ اک خونی چڑیل ہے۔''

اس نے نفرت بھرے انداز میں اسے دیکھ کر کہا۔ اسے ان آنکھوں میں جن میں ہمیشہ اپنے لیے محبت دیکھی تھی اجنبیت اور غصے کے رنگ بہت تکلیف دہ، بہت عجیب لگ رہے تھے۔

''یہ تو کوئی اور ہی مرد ہے۔ یہ میرا حارث تو ہرگز نہیں لگ رہا۔'' اس نے خود سے کہا۔ اسی دوران ایک مردانہ آواز لاؤنج میں گونجی

''حارث یار! کدھر غائب تھے تم صبح سے؟'' اندر آنے والے نے ابھی دلہن بنی زرتاشہ کو نہیں دیکھا تھا۔

''ارے، یہ کون ہے؟''

زرتاشہ کی ہال کے دروازے کی طرف پشت تھی، اس نے کچھ مانوس سی مردانہ آواز سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو پل بھر کے لیے حقیقتاً پتھر کا بت ہوگئی۔ باوجود کوشش کے وہ پلکیں تک نہ جھپک پائی تھی۔

''مس زرتاشہ اجمل خان! آپ یہاں اور اس روپ میں؟'' وہ بھی حیرت کی تصویر بنا ایک ٹک اسے دیکھے جارہا تھا۔

''سر ایمل خان؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی تو ایمل خان بھی اپنے تلخ ترین ماضی کے جھروکوں کو بند کرتے ہوئے چونک کر اسے دیکھنے لگا اب وہ دونوں کے درمیان میں کھڑا کبھی حارث کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور کبھی زرتاشہ کی طرف

''مس زرتاشہ اجمل خان! ان سے ملو، یہ ہیں میرے بڑے بھائی ایمل خان۔ قابلیت اور ذہانت کے ساتھ ان کی اعلا اخلاقی اقدار کی لوگ مثالیں دیتے تھے۔ سارا زمانہ جانتا تھا کہ ایمل خان عزتوں کا محافظ ہے، لٹیرا نہیں۔

صرف گفتار کا نہیں کردار کا بھی غازی ہے۔

بہنوں بیٹیوں کے سر ڈھانپنے کے لیے اپنی جان تک دے سکتا ہے۔ جہاں جاتا، لوگ احترام میں کھڑے ہوجاتے تھے، بخدا میں نے سفید ریش بزرگوں کو بھی ان کا احترام کرتے دیکھا ہے۔

ان کی یہ قابلیت سے زیادہ ان کی ستھری سوچ پر ناز کرتی تھی وہ اس کی اچھائیوں کی عاشق تھی۔ ان کا بھائی یعنی کہ میں..... ان کے نقش قدم پر چلنا اپنے لیے فخر و سعادت سمجھتا ہوں۔ جان سے بڑھ کر پیار کرتا ہوں میں ان سے۔ لیکن جانتی ہو زرتاشہ بی بی! میرے اس غیرت مند اور غیور بھائی کے ساتھ کیا ہوا؟ انہوں نے برسوں کی ریاضت سے جو عزت اور نیک نامی کمائی تھی، وہ ایک عورت کی دیوانگی اور محرومی کی نذر ہوگئی۔

ایک خونی چڑیل ہماری زندگیوں کے سارے خوش گوار رنگ چوس کر ہمارے منہ پر کالک مل کر چلی گئی۔ جس دن میرا باوقار بھائی بے توقیر ہوکر گھر کی دہلیز پر گر پڑا تھا تب میں نے اس خونی چڑیل کو بہت بددعائیں دی تھیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ چڑیل تو بذات خود اک بددعا ہوتی ہے۔ سوچا تھا کہ کہیں ملی تو اس کے منہ پر کالک ضرور ملوں گا۔ لیکن پھر سوچا، کالے چہرے پر کالک ملنے سے کچھ نہیں ہوگا اس کا کچھ نہ بھی بگڑے میرے ہاتھ ضرور کالے ہوجائیں گے۔ ہماری ماں نے اس غم میں چپکے چپکے روتے ہوئے جان دے دی کہ عزت جس بیٹے کے لیے آکسیجن کی طرح لازم تھی وہ کتنی مشکل سے زندگی گزار رہا ہے۔ وہ جس بھانجی کو بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی تھی اس کے والدین نے یہ کہہ کر بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کردیا کہ لڑکے کا کردار ٹھیک نہیں۔ اگر وہ سونے کا بھی بن کر آجائے۔ تب بھی ہماری طرف سے انکار ہی ہوگا'' وہ پل بھر کے لیے خون رنگ آنکھوں سے اسے گھورتا رہا پھر بولا۔

''میں نے عہد کیا تھا کہ اس چڑیل کو ڈھونڈنے کے بعد بے عزت کروں گا لیکن کل اسے خدا نے اس مولانا کے ذریعے بچالیا تھا جس وقت وہ نکاح خواں سے حلال حرام کے فتوے لے رہی تھی، میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں ذرا یہ تو بتاؤ زرتاشہ بی بی کہ ناحق کسی نیک مسلمان پر تہمت لگانا کس مذہب میں حلال ہے؟ لیکن میں چپ رہا۔ اگر کل نکاح ہوجاتا تو میرے انتقام کو صحیح سمت مل جاتی میں پہلی رات کی دلہن کو طلاق دے کر گھر بھیج دیتا۔ اس گھر میں جہاں پر غیرت اور عزت اس کی موت بن کر گھر کی دہلیز پر اس کا انتظار کررہی ہوتی لیکن چلو نکاح نہیں ہوا ناباقی سب تو ویسا ہی ہورہا ہے۔''

وہ چپ ہوا تو زرتاشہ تڑپ کر اٹھی اور اس کے مقابل کھڑی ہوگئی۔

''حارث! کیا وہ محبت کے سارے وعدے جھوٹے تھے۔ وہ قسمیں، وہ باتیں، وہ ساتھ ہنسنا، ساتھ جینے کے منصوبے بنانا..... وہ سب جھوٹ کیسے ہوسکتا ہے۔ کوئی اتنا بڑا دھوکا بھی دیتا ہے۔ تم نے

میری زندگی کتنی ارزاں کردی ہے؟''

آنسو اس کے گالوں کا غازہ بہاتے ہوئے نیچے گر رہے تھے اور جہاں جہاں سے میک اپ کا رنگ اتر رہا تھا وہاں سے پیلی زرد رنگت نظر آنے لگی تھی۔ وہ بڑی سفاک نظروں سے ان انمول موتیوں کو ضائع ہوتے دیکھتا رہا۔ لیکن پھر بھی زرتاشہ کی آنکھیں امید بھرے انداز میں اس پر جمی تھیں۔ اسے امید تھی کہ حارث کچھ دیر اپنا غصہ دکھا کر اس سے کہے گا جیسی بھی ہو، اب میری محبت، میری مجبوری بن چکی ہو، اس لیے میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ جبکہ ایمل خان ماتھے پر تفکر کی گہری لکیریں لیے ابھی تک ساری صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں نے تمہیں سچے دل سے چاہا ہے حارث! تمہاری خاطر اپنی اور اپنے باپ کی عزت بھی نیلام کر دی ہے یہ دیکھے بغیر کہ عزت کی بولی لگانے والوں میں۔ تم بھی شامل تھے۔'' اس کے لہجے کی شکست لفظوں کے انتخاب میں نظر آ رہی تھی۔

''میرے گناہ کی اتنی بڑی سزا نہ دو حارث!'' وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

''بھائی جان! میں نے آج آپ کا بدلہ لے لیا ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔'' وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایمل خان کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اچانک کمرے میں زناٹے دار تھپڑ کی آواز گونجی اور روتی ہوئی زرتاشہ نے دھندلی آنکھوں سے غیر متوقع منظر دیکھا، حارث ایک ہاتھ سے اپنا گال سہلا رہا تھا۔

''میں نے کیا برا کیا ہے بھیا! ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور جان کے بدلے جان..... یہ حکم تو اللہ کا بھی ہے نا؟ میں نے تو عزت کے بدلے عزت ہی لینے کی کوشش کی ہے، اس میں کیا برا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ پہلی بار ایمل جیسے مہربان اور سراپا شفقت و محبت بھائی نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ شدید صدمے میں تھا۔ اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا

''تم اور تم جیسے دوسرے لوگوں نے اپنے مطلب کے لیے دین کو ڈھال بنا رکھا ہے، پوری بات کیوں نہیں سمجھتے جہاں بدلے کی اجازت ہے وہاں معافی کے درجات بھی تو دیکھو نا۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ معاف کر دینا اللہ کو کتنا پسند ہے۔ تم کیسے امتی ہو نبی پاک ﷺ کے؟ سید المرسلین کے عفو و درگزر سے بے خبر ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والے پر یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ نہایت رحم دل اور نرم خو تھے۔'' وہ استاد تھا اسی لیے اک استاد کی طرح بھائی کو سمجھا رہا تھا۔

''کیا میں انسان نہیں، میں مرد نہیں؟ یہ مردوں کا معاشرہ ہے جہاں مرد بہت کچھ کر کے بھی گناہ گار نہیں سمجھا جاتا اور عورت ناحق پر بھی مورد الزام ٹھہرائی جاتی ہے میرے ساتھ جو ہوا، کیا اس کا بدلہ میں خود نہیں لے سکتا تھا لیکن میرے سامنے ایک کمزور لڑکی تھی۔ میں اس سے کیا انتقام لیتا۔ میں نے اللہ کی رضا کے لیے اسے معاف کر دیا تھا، چند دنوں بعد ہی اور میں نے ہمیشہ تم سے بھی تو یہ ہی کہا تھا حارث کہ وہ لڑکی نادان تھی، کم عقل تھی، جذباتی اور حالات کی ستائی ہوئی لگتی تھی، وہ توجہ کے لیے یہ سب کرتی تھی یا انتقاماً؟ لیکن میں اسے معاف کر چکا تھا، شاید میرے دل میں کہیں اپنی نیکیوں، عبادات اور کردار کو لے کر غرور آیا تھا تب ہی تو اللہ نے مجھے اس عزت سے محروم کر دیا۔ جسے میں اپنی جاگیر سمجھ کر اپنا حق جان کر اتراتا پھرتا تھا۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکا تو حارث نے جلدی سے بولنا شروع کر دیا۔

''لیکن بھائی! اگر آپ کے ساتھ ہوئے اس کھیل کو میں نظر انداز بھی کر دیتا تو بھی ماں کی موت کو میں کیسے بھلا سکتا ہوں ان کو یہی صدمہ ہر وقت رلاتا رہتا تھا۔''

زرتاشہ دونوں بھائیوں کی باتیں سن رہی تھی

پتھر کے بت میں بدلتے اپنے گوشت پوست کے وجود سے اسے خوف آنے لگا تھا۔

وہ ناگواری سے حارث کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے میرے بھائی! تم نے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ ہماری والدہ عمر کے ایسے حصے میں تھیں جہاں بڑھاپے اور بڑھاپے سے متعلق دوسری بیماریوں نے ان پر حملہ کر رکھا تھا۔ وہ دل کے عارضے کے ساتھ شوگر ہائی بلڈ پریشر اور ہڈیوں اور جوڑوں کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ اس حادثے سے پہلے بھی ان کے لیے زندگی بہت مشکل اور تکلیف دہ تھی۔ وہ اگر روتی رہتی تھیں تو ان تکالیف کی وجہ سے جو ان کی برداشت سے باہر ہو چکی تھیں۔ تم تو ٹریننگ پر تھے۔ میں ساری ساری رات ان کو تکلیف کی شدت سے تڑپتے ہوئے دیکھتا اور بے بسی سے اللہ سے ان کی تکلیف کم ہونے کی دعائیں کرتا رہتا تھا۔

تمہیں سراسر غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ اس لڑکی کی وجہ سے یہ دنیا چھوڑ کر گئی ہیں۔ اس لڑکی کا قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی تم نے اسے سزا دی ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ تم میرے بھائی ہو جس میں نے اتنی لمبی پلاننگ کر کے ایک معصوم لڑکی کی معصومیت کا فائدہ اٹھایا۔ میں اپنے اس گناہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ پہل میری طرف سے ہوئی تھی۔ میں نے اس واقعے کے بعد جب بھی سوچا، مجھے احساس ہوا کہ میں نے پوری کلاس کے سامنے اس خود پسند لڑکی کی توہین کی تھی اور یہ لڑکی میری وہ چوٹ بنا اف کیے سہہ بھی گئی تھی۔ خود سوچو اسے بدلہ تو لینا تھا، بقول تمہارے عزت کے بدلے عزت۔''

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی زرتاشہ کے قریب پہنچا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''خدارا مجھے معاف کر دیں، آپ کا حلیہ اور یہ عروسی لباس بتا رہا ہے کہ میری وجہ سے آپ کے والدین اور آپ خود زمانے بھر کی نظروں میں رسوا ہوئی ہیں۔ چلیں، میں آپ کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں اور وہیں آپ کی فیملی سے بھی معافی مانگ لوں گا ہو سکتا ہے ابھی بات زیادہ نہ پھیلی ہو۔''

وہ حیرانی اور بے یقینی سے اس باوقار انسان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جسے اس نے برباد کر دیا تھا۔ جس کی نوکری اور ہونے والا رشتہ بھی اس کی دیوانگی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا لیکن وہ پھر بھی اس کی عزت کی فکر میں پریشان تھا۔

''میں نے اس شخص سے محبت کی ہے سر۔'' وہ سسکنے لگی۔ پتھر کے بت کی آنکھوں سے آنسو؟ جھرنے بھی تو پہاڑوں سے پھوٹتے ہیں۔

حارث نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''پہلی بار کسی مرد پر بھروسا کیا تھا۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ سارے مرد میرے باپ جیسے نہیں ہوتے۔ میں نے سوچا تھا۔ بس اب ساری آزمائشیں ختم ہو گئی ہیں میں جیت گئی ہوں، دکھ ہار گئے ہیں۔ جانتے ہیں سر؟''

وہ دونوں ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''میری ماں دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے، اس کا خیال رکھنے والی واحد ایک انسان میں تھی ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے آکسیجن کی طرح ضروری تھے لیکن میں اس ماں کے لیے بھی نہ رکی اور اس کے لیے اسے بھی چھوڑ آئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا باپ مہینے میں ایک بار آ کر بھی اس پر کسی نہ کسی بہانے ہاتھ ضرور اٹھاتا ہے، وہ اس ناکردہ گناہ کی پاداش میں اسے بہت مارے گا اور وہ ہوش حواس سے بیگانہ سی یہ پوچھتی رہے گی کہ مجھے کیوں مار رہے ہو اور۔ اور یہ بھی ضرور سوچے گی مار کھاتے ہوئے کہ ہمیشہ جو لڑکی اس کے سامنے ڈھال بن کر کسی بہانے اسے مار کھانے سے بچا لیتی تھی، اب کیوں نہیں آ رہی اسے اس ستم گر سے بچانے کے لیے؟''

اس کی درد بھری باتوں نے ایمل خان کو تڑپا دیا

تھا وہ، بڑے افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں یقیناً اس بدنامی سے بچنے کے لیے آپ کا نکاح حارث سے کروا دیتا لیکن اک معصوم سی لڑکی نرمین بڑی بے چینی سے اس کی منتظر ہے آسٹریلیا میں، جس کے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا ہے اور عنقریب حارث اسے رخصت کرا کر لانے والا ہے۔''

وہ تفصیل سن کر بے یقینی سے اس جھوٹے مکار اور دغا باز انسان کو دیکھ رہی تھی۔

''حارث اور نرمین دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں، دونوں کے لیے جدائی موت سے بدتر ہے۔''

محبت کا تاج محل پل بھر میں دھڑام سے گرا اور زرتاشہ کے وجود کو ریزہ ریزہ کر گیا، وہ جو سوچتی تھی کہ اس شخص کی محبت رگوں میں خون کی طرح رواں ہے۔ اس وقت وہ اسی محبوب کی شکل دیکھنے کی روادار بھی نہیں تھی۔ مڑ کر واپسی کا رستہ دیکھتے ہوئے اسے دھند ہی نظر آ رہی تھی

''وہ مجھے مار دیں گے۔'' لرزتی کانپتی ہوئی اس لڑکی پر ایمل کو ترس آ رہا تھا۔

''اچھا ہے، تم جیسی لڑکیاں مر ہی جائیں تو بہتر ہے۔'' حارث اسے ناگواری سے دیکھتا بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا

''جو جی میں آئے کریں۔ آپ کی ان ہی عادتوں نے تو اسے اتنی ہمت دی تھی کہ وہ آپ کے ساتھ جو کرنا چاہتی تھی کر گئی۔''

''نرمین کا فون ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ آپ جانیں اور اس کا بھی جو کرتے ہیں کر لیں۔'' وہ کتنی آسانی سے اسے یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بے یقین نظروں سے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی ہی باہوں میں منہ چھپا کر تڑپ تڑپ کر رو دی، یوں کہ جیسے کوئی بہت اپنا مر گیا ہو اس کے اندر مر ہی تو گیا تھا وہ شخص۔

''مس زرتاشہ! ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ابھی معاملہ نبٹ سکتا ہے۔ ہم سب کی عزت بچ سکتی ہے۔ پولیس تھانے تک بات پہنچ گئی تو یقیناً اخبارات اور میڈیا تک بات پہنچے گی، یوں آپ کے والد صاحب کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ آپ کا مستقبل برباد ہو جائے گا۔ سارے خواب مٹی میں مل جائیں گے۔ آپ لڑکی ہیں، مستقبل برباد ہو جائے گا آپ کا۔''

وہ تیز تیز بولتے ہوئے اسے ساتھ لے جانے کے لیے بازو سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف رواں تھا اور زرتاشہ کسی بے جان چیز کی طرح گھسٹتے ہوئے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''اجمل خان صاحب کا جنازہ ہے۔ ان کے آبائی گاؤں لے جا رہے ہیں بس بیٹا دعا کرو کہ اللہ بیٹی دے تو ایسی قاتل بیٹی نہ دے جیسی اس بے چارے کی تھی، باپ کو مار دیا بدبخت نے۔''

پوچھنے پر باریش بزرگ کی زبانی بڑی متانت سے اسے جواب ملا تھا۔ وہ جو تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے گھر کا رستہ بتا رہی تھی۔ اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھر کے سامنے سڑک پر گاڑیوں کا رش اور گھر کے کھلے گیٹ میں سے آتے جاتے لوگوں کا ہجوم دیکھ رہی تھی۔ ایمل خان گاڑی سے اتر کر پوچھ رہا تھا کہ اس گھر میں کیا ہوا ہے جو اتنا رش ہے، پہلے تو وہ یہ ہی سمجھا کہ سب خاندان والے جمع ہو کر آئے ہیں شاید کوئی جرگہ وغیرہ ہے۔

''زرتاشہ بی بی! آپ کے بابا یہ بدنامی سہہ نہیں پائے اور یہ فانی دنیا چھوڑ گئے ہمیشہ کے لیے۔ اب کیا کروں؟'' اس کی آنکھوں میں زرتاشہ کے لیے ملامت تھی۔ وہ سسکنے لگی۔ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے اس نے کہا

''مجھے یہیں اتار کر آپ چلے جائیں، یہ سارے میرے حصے کے درد ہیں سہنے تو پڑیں گے۔ اب تک بدتمیز تھی، منہ پھٹ اور خود غرض تھی۔ دوسروں پر تہمتیں بھی لگاتی تھی، اذیت پسندی میری

رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی ہے لیکن آج ایک بیمار۔ دل کے مریض باپ کی قاتلہ بھی بن گئی ہوں۔''

ضبط کے بند تو ٹوٹے ہوئے تھے۔ آنسوؤں کا ریلا اس کے نازک سے وجود کو بہا کر لے گیا تھا ایمل خان ہاتھ بڑھا کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے تسلی دے رہا تھا جو دونوں کو پتا تھا کہ جھوٹی ہے۔

''بابا..... بابا۔'' وہ بدستور بلک رہی تھی۔ کیسا جان لیوا احساس تھا یتیمی کا۔ اسے اب سمجھ میں آرہا تھا۔ حساس دل ایمل نے فرنٹ سیٹ پر ساتھ بیٹھی اس بے وقوف لڑکی کا سر بے اختیار اپنے کندھے سے لگالیا۔

واپسی کے سفر میں دل پر بھاری چٹان لیے وہ گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔ سفید کاٹن کی شرٹ زرتاشہ کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی وہ خود تو لرزتے قدموں اور ملامتی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئی تھی لیکن اس کی ہتھیلی پر روتی ہوئی اس لڑکی کے وجود کا لمس باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اس رات ایمل کی آنکھیں نیند کے لیے ترستی رہیں۔ نہ ہی روٹھی ہوئی نیند مان رہی تھی نہ ہی کھویا ہوا سکون واپس مل رہا تھا۔ وہ کبھی نیند کو مناتا، کبھی سکون کو ڈھونڈتا۔ دونوں نے اسے خوب تھکا دیا تھا تب ہی ایک مہربان پری اس کے قریب آئی۔ اس پری کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور سرخ ہونٹوں پر ہنسی کی شوخی تھی۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو اے آدم زاد؟'' اس کے پوچھنے پر وہ خوش ہوگیا۔

''اک پری کی تلاش تھی جواب ختم ہوگئی ہے'' اس نے ایمل کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''تم سو جاؤ آدم زاد! میں تمہیں لوری سناتی ہوں۔'' وہ سونے لگا، غنودگی میں اسے روٹھی ہوئی نیند اور کھوئے ہوئے سکون کی بازیابی کا سندیسہ مل گیا تھا۔

وہ میٹھی نیند سوگیا۔ اس پری کی شکل بالکل زرتاشہ جیسی تھی۔ وہ مندی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

''نہیں شکل اس جیسی نہیں ہے بلکہ وہی ہے یہ تو.....''

☆☆☆

''یار! مجھے سوتے جاگتے بس وہی نظر آتی ہے اس کے وجود کا لرزنا، اس کے آنسوؤں کی نمی، وہ بھیگی آنکھوں کا گلہ۔ وہ سر جھکا کر اپنا جرم مان لینا وہ بے یقین نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی تمہیں دیکھنا۔'' بالآخر وہ اس کشمکش سے تھک کر حارث کے سامنے اپنی ہار مان رہا تھا۔

''مطلب یہ ہوا کہ آپ کو اس بے وقوف اور بدتمیز لڑکی سے محبت ہوگئی ہے؟'' حارث نے حیرانی سے پوچھا تو اس نے دل کی دھڑکنیں سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ اتنے عرصے میں پل بھر کے لیے نہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی ہے اور نہ ہی دل سے نکلی ہے۔'' ایمل نے بے بسی سے کہا تو حارث دوسری طرف سے قہقہے لگائے جارہا تھا۔ اس کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں ہوگئی تھی۔

''سنیں بھیا! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے تو ہر مہینے اک نئی لڑکی سے سچی محبت ہو جاتی ہے لیکن پہلی بار آپ کو کوئی لڑکی اچھی لگی ہے بے شک وہ پاگل سی ہے لیکن آپ اس سے فوری رابطہ کریں بلکہ سیدھا اس کے گھر جا کر اظہار محبت کریں اور شادی کی تاریخ بھی لے کر آئیں۔ نرمین اگلے مہینے آرہی ہے بس دونوں کی رخصتی اکٹھی کرتے ہیں۔ لیکن بھیا میری بیوی بے چاری اس دیورانی کے ہاتھوں بہت رونے والی ہے۔ آئے روز کوئی الزام لگا کر گھر میں ہنگامہ کھڑا کردے گی وہ پگلی سی دیوانی سی لڑکی اور اگر اس نے پرانی باتیں نرمین کے سامنے کردیں تو اس نے میرا گلا ہی گھونٹ دینا ہے۔ اس سے کم پر تو وہ راضی نہیں ہونے والی۔ اچھا بھیا آپ فکر نہ کریں۔

میں اس کے پاؤں پکڑ کر اس سے معافی مانگ لوں گا۔ یہ کہہ کر کہ یہ سب میں نے آپ کے سرتاج کی محبت میں کیا تھا۔''

حارث غیر متوقع طور پر چہک رہا تھا شاید اس طرح اسے اپنے اندر پلتے ہوئے احساس جرم سے بھی نجات ملتی نظر آرہی تھی۔

ایمل نے مسکراتے ہوئے فون بند کیا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے لگا اب جبکہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ زرتاشہ سے محبت کرنے لگا ہے۔ ایک رات کی دوری بھی اسے برداشت سے باہر محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''لیکن یہ بنگلہ تو اجمل خان صاحب کا ہے، یہ درانی صاحب کا کیسے ہو گیا؟''

وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

''زرتاشہ کے دروازے پر ہارن کے جواب میں باہر نکلنے والا گھر کا ملازم تھا۔

''جی صاحب! اجمل خان کے بیٹوں سے یہ گھر خریدا ہے ہمارے صاحب نے۔''

''اور اس گھر میں جوان کی بیوہ اور بیٹی رہتی تھیں، وہ دونوں اب کہاں ہیں؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں جی۔'' وہ یہ کہہ کر گیٹ بند کر چکا تھا۔

ایمل کو اپنا آپ اس مسافر جیسا لگ رہا تھا جسے منزل پر پہنچ کر معلوم ہو کہ یہ تو رستہ ہی غلط تھا منزل بھی اسی لیے کسی اور کی ہے، اس کی نہیں ہے۔ وہ مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب رہا تھا تب ہی امید کی ایک کرن نظر آئی

''سنیں! آپ سر ایمل خان ہیں نا؟'' وہ نازک سی لڑکی مشتاق لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''جی۔ میں ایمل ہی ہوں اور آپ؟'' وہ اس کے روبرو کھڑا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا

''میرا نام پلوشہ ہے۔ میں آپ کی اسٹوڈنٹ نہیں لیکن اسی یونیورسٹی سے پڑھا ہے میں نے اور کئی بار آپ کو دیکھا اور اسٹیج پر سنا بھی ہے ہماری یونی میں کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو آپ کو نہ جانتی ہو، آپ کی اچھی عادتوں نے بہت شہرت بخشی ہوئی تھی سٹوڈنٹس میں۔'' وہ بڑے جوش سے بتا رہی تھی۔ ایمل کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی

''آپ زرتاشہ اجمل خان اور حسنہ آنٹی کا پوچھ رہے ہیں؟''

وہ لڑکی ساتھ والے گھر کے گیٹ میں شاید کسی کے انتظار میں کھڑی تھی، اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ بولنے لگی۔

''بڑی دردناک کہانی ہے ان ماں بیٹیوں کی۔ آنٹی کی کچھ عرصہ پہلے ڈیتھ ہو گئی تھی۔ وہ سکون آور میڈیسن کے زیر اثر اوپری منزل کی سیڑھیوں سے گریں اور ختم ہو گئیں چوٹ ان کے سر پر آئی تھی۔''

''اوہ بہت افسوس ناک۔'' ایمل کا دل دکھ گیا تھا۔ اس لڑکی پر بہت بری گزری ہے، وہ سوچ رہا تھا۔

''اب مس زرتاشہ کہاں ہوتی ہیں؟'' اس کے انداز میں بے تابی تھی۔

''اس کی سوتیلی والدہ اور بھائیوں نے اسے یہاں سے نکال دیا تھا بقول ان کے زرتاشہ کے والد انہیں جائداد وغیرہ میں سے کچھ نہیں دے کر گئے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کے سامنے ایک لڑکی ہار گئی اور آپ یقین کریں کہ دو گھنٹے وہ سڑک پر اپنا بیگ رکھے جگہ جگہ فون ملاتی رہی لیکن کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں وہ سر چھپا سکتی۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں چہرے پر تاریک سائے لہرانے لگے۔

''آپ نے بھی انہیں پناہ نہیں دی۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے یہ جان کر۔''

''ہاں، میں بھی پتھر کا بت بنی اسے دیکھتی رہی سارے بے حس لوگوں کی طرح۔ میرے گھر والے عین شادی کے دن اس کے غائب ہونے اور اس کی وجہ سے باپ کے مر جانے پر بہت ڈرے ہوئے تھے میرے بابا نے مجھ پر پابندی لگا رکھی تھی کہ اس سے

بات بھی نہ کروں۔ وہ سب کہتے تھے، زری ایک بدکردار لڑکی ہے جو کسی کی عزت کا خیال نہیں کرے گی اور دوسروں کو بھی یہ ہی سکھائے گی۔ میں کھڑکی سے اسے دیکھتی رہی لیکن اس کے لیے کچھ نہ کرسکی۔''

پلوشہ کی آنکھیں اب چھم چھم برسنے لگی تھیں۔

''وہ ہمیشہ مجھے یہ ہی کہتی تھی کہ پلوشہ مجھے کبھی اکیلے نہ چھوڑنا کہ تیرے سوا میرا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے لیکن میں نے اسے چھوڑ دیا۔

ماں کی منت کی، باپ کے پاؤں پڑی۔ لیکن وہ بدنصیب اپنوں کے ہاتھوں ذلیل ہوگئی تھی، غیر اسے کیا سنبھالتے۔''

''اب..... اب کہاں ہے وہ؟'' ایمل خان کے دل میں اٹھتے خدشے اسے خیالوں میں کہاں سے کہاں لے گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں اسے کچھ ہوتو نہیں گیا؟ کہیں وہ کسی کی ہوتو نہیں گئی؟''

''زرتاشہ باپ سے نفرت کرتی تھی لیکن اس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ ہر طرح کے عیش کیے تھے۔ نوکر سارے اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ کر روتے رہے تھے لیکن کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ میری مما نے میرے کہنے پر بالآخر مجبور ہوکر بابا سے چھپ کر اپنی ایک دوست سے بات کی اور اسے ان کے اسکول میں جاب بھی مل گئی اور ایک کمرہ بھی ان کے سرونٹ کوارٹر میں اسے مل گیا۔ میں آنٹی کی فون کی گھنٹی پر وہاں گئی تھی لیکن اسے سینے سے لگا کر تسلی بھی نہ دے سکی۔ وہ اکیلی ہی روتی رہی۔ تڑپتی رہی سب لوگ اسے کوس رہے تھے۔ والدین کا قاتل کہہ رہے تھے۔ نفرت کا اظہار کررہے تھے۔ وہ گناہگار تھی لیکن اپنے گناہ سے زیادہ سزا بھی چکی ہے میں.....''

''ایڈریس ہے آپ پاس ان کا؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر بے اختیار پوچھنے لگا تو وہ اسے مشکوک انداز میں دیکھنے لگی۔

''کیا حارث نے اسے مارنے میں کوئی کمی چھوڑی ہے جو آپ اس سے مل کر بدلہ لیں گے؟'' وہ اس کے شک پر مسکرادیا۔

''دیکھیں میری بہن! اگر آپ کو انہوں نے یہ بتایا ہے کہ حارث نے اسے کیسے ٹریپ کرکے دھوکا دیا ہے تو میرے بارے میں بھی سب بتایا ہوگا اور جیسا کہ آپ نے کچھ دیر پہلے کہا کہ آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں تو پھر تو یہ سوال غلط ہے کہ میں اس سے انتقام کے لیے یہ سب پوچھ رہا ہوں۔''

وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میں اسے اپنا نام دینا چاہتا ہوں، اسے لیے ڈھونڈ رہا ہوں لیکن کہہ نہیں پایا۔ وہ چند پل بغور اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''آپ کو ایڈریس دیتی ہوں لیکن اس سے پہلے میں یہ بتادوں کہ اس نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ ہوش وحواس میں رہ کر نہیں کیا تھا بلکہ وہ ایک بہت ہی موذی نفسیاتی بیماری کے ابتدائی دور میں تھی۔ اسے بچپن کی محرومیاں اور دکھ اس حال تک لے گئے تھے کہ وہ نیک نام مردوں سے انتقام لیتی تھی اپنے عزت دار باپ کی زیادتیوں کا۔ وہ علاج کے بعد کافی بدل گئی تھی لیکن اس کا علاج بھی تو ادھورا رہ گیا ہے۔ وہ قریب ہی رہتی ہے، اس کی مدد ضرور کیجیے گا۔ مجھے پتا ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہوگی، وہ اتنی خوش نصیب نہیں کہ اس کی زندگی میں۔ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہوگا۔''

وہ ایڈریس لے کر اس کو شکر گزار انداز میں دیکھتے ہوئے رخصت ہوا تو پلوشہ دیر تک اسے دور جاتا دیکھتی رہی، دل ہی دل میں وہ اس کے لیے دعا بھی کررہی تھی کیونکہ اس کے بس میں دعا ہی تھی۔

☆☆☆

ایمل کو اس تک پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی تھی۔ سرد موسم کی ٹھٹھرتی ہوئی شام آج قدرے زیادہ اندھیری تھی۔ وہ چھوٹے سے کوارٹر کے دروازے پر دستک دے کر جواب کا منتظر تھا کہ اندر سے اس کی خوف میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''پلیز ایوب صاحب! میں مرجھی جاؤں تب بھی دروازہ نہیں کھولوں گی۔ خدا کے لیے یہ چھت نہ چھینیں مجھ سے۔ میں لاوارث ضرور ہوں لیکن بے

غیرت نہیں۔ چلے جائیں یہاں سے۔''

وہ ساری بات سمجھ گیا تھا۔ اس کے رگ و پے میں درد کی ایک تیز لہر دوڑی۔ اس نے تڑپتے ہوئے سوچا۔ اس قدر مجبوری کے ساتھ جی رہی ہے یہ معصوم سی لڑکی؟

''اف میرے خدایا۔ میں نے اس دن کیوں اسے بے یارو مددگار چھوڑ دیا تھا؟ میں کس قدر بے حس انسان ہوں۔'' دوبارہ دستک دے کر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میں ہوں مس زرتاشہ! پلیز دروازہ کھولیں۔''

جھٹ سے دروازہ کھلا اور وہ چوکھٹ میں کھڑی اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایمل نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔

''آپ؟'' اس کا منہ حیرت سے کھلا تھا اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ سر ایمل خان اس کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔

''جی میں..... کیا میں اندر آسکتا ہوں؟''

وہ جواب دیے بغیر اسے رستہ دے کر پیچھے ہٹ گئی۔

چھوٹا سا سیلن زدہ کمرہ ایک بلب کی روشنی میں عجیب وحشت بکھیر رہا تھا۔ کمرے میں دو چارپائیاں پڑی تھیں جس میں سے ایک پر بستر لگا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں چھوٹا سا گیس کا چولہا اور دیگر سامان پڑا تھا جس میں کچھ پلاسٹک کے ڈبے تھے اور ایک تو ابھی سرسری نظر میں دکھائی دیا۔

''اصل میں یہ چوکیدار کا کمرہ تھا۔ اس لیے کچن وغیرہ کا الگ سے انتظام نہیں تھا۔'' وہ اس کی سوالیہ نظروں کا مطلب سمجھ کر بولی تو وہ اک آہ بھر کر اسے دیکھنے لگا۔

''سر! آپ ادھر بیٹھیں نا۔'' ایمل نے دیکھا کہ رضائی آدھی نیچے چارپائی پر اور آدھی اوپر اس طرح پڑی تھی کہ جیسے ابھی وہ اس میں سے نکلی ہو۔

''ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں نا یہاں شفٹ ہوئے۔ پہلی تنخواہ ملی تو سب سے پہلے اپنے سونے کے لیے میٹرس لاؤں گی، بان کی چارپائی جس میں کھٹمل بھی ہیں، اس پر نیند ہی نہیں آتی۔ سردیوں کی طویل راتوں کی صبح کا راہ تکتے تکتے تھک سی جاتی ہوں۔ اب خیال آتا ہے بلکہ احساس ہوا ہے کہ جسے میں ظالم کہتی تھی، میرے اس باپ نے ہمیشہ مجھے ہر سہولت فراہم کی تھی۔ نرم گرم بستر، گرمی میں اے سی کی سہولت۔'' وہ اسے چارپائی کی طرف متوجہ دیکھ کر دوبارہ بول پڑی۔

''یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں کہ کیسی گزر رہی ہے؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولا تو وہ زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

''اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہوں سر! پہلے حارث صاحب نے پھر باپ نے اور اس کے بعد سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائیوں نے اپنے ساتھ کیے گئے جرموں کی سزا میں کوئی رعایت نہیں بخشی اور بابا نے بھی بقول سوتیلی ماں کے وہ مجھے مرنے سے پہلے عاق کر گئے تھے۔'' وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔

''میں سوچتی تھی، اس قدر مہنگی دوائیوں کی عدم دستیابی کے بعد میں کہیں پھر اسی کیفیت میں نہ چلی جاؤں لیکن غم دوراں نے تو اپنا آپ بھی بھلا دیا ہے اب نہ کسی پر غصہ آتا ہے نہ کسی سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔ بس اب تو روٹی کپڑا اور مکان کی پریشانی چڑیل بن کر چمٹی ہوئی ہے۔ محض چند ہزار روپیہ کے لیے دن بھر محنت کرتی ہوں۔ استانی جی کو علم ہے کہ میرا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس لیے اسکول کا جھاڑو پوچھا بھی مجھ سے کرائی ہیں اور میں ان کے شوہر کی دہشت کے ساتھ یہاں پر رہ رہی ہوں کیونکہ فٹ پاتھ سے تو بہرحال بہتر ہی ہے یہ کمرہ کہ کنڈی تو لگتی ہے اس کی۔''

وہ شاید مدت سے کسی سامع کے لیے ترس رہی تھی۔ کوئی اس کے دل کی باتیں سننے میں بھلا کیوں دلچسپی لیتا؟

''آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی؟''

ایمل نے اس کے ملگجے کپڑوں اور اجڑے رنگ روپ کو دیکھ کر افسوس سے پوچھا تو وہ ہنسنے لگی۔

''سر! اب جا کر پتا چلا ہے کہ ضروریات زندگی غریب آدمی کی دسترس سے کتنی دور ہیں۔ شیمپوز آتے جاتے مارکیٹ میں دیکھتی ہوں پھر پوچھتی ہوں سب سے سستا کون سا شیمپو ہے؟ تنخواہ ملی تو لوں گی۔ اس لیے تو کئی دن سے صرف پانی سے بال دھو رہی ہوں۔'' وہ اذیت پسند تو شروع سے تھی، اب دکھ سہہ کر مزید ہوگئی تھی۔

''کیا لیں گے سر؟ میں تو بغیر دودھ کے چائے پیتی ہوں اور عموماً بغیر دودھ کی چائے کے ساتھ یہ میری خوراک ہوتی ہے۔'' اس نے بھنے ہوئے چنوں کی طرف اشارہ کیا جو ایک پلاسٹک کی پلیٹ میں پڑے تھے۔

''اس حد تک مسائل میں گھری ہیں تو کوئی دوسری جاب کیوں تلاش نہیں کی۔ آپ تو بہت قابل ہیں؟''

وہ اندر ہی اندر تڑپ اٹھا تھا لیکن وہ اس تڑپ کو نوٹ نہ کرسکی۔

''گئی تھی کئی جگہ۔ لیکن جیسے ہی میں رہائش کی بات کرتی، شکاری چھت کا جال پھینک کر مجھے عزت سے محروم کرنے کی بات کرتے۔ میں جس کے لیے عزت نفس اتنی اہم ہے کہ وہ اپنی ماں کی توہین نہ سہہ سکی۔ وہ بھلا بے عزتی کے عیش و عشرت کیسے قبول کرتی۔ میں انتقامی جذبات سے مجبور ہو کر اور کچھ محبت کے سنہرے جال میں پھنس کر بہت سے غلط فیصلے تو کر چکی ہوں لیکن سر! یہ تو آپ کو پتا ہے کہ میں بہت شریف اور عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے گناہوں یا غلطیوں کی سزا مجھے بہت مل چکی ہے لیکن یہ سزا ختم کب ہوگی۔ کچھ خبر نہیں۔'' وہ اسے دیکھے گیا۔

''آپ یقین کریں گے سر کہ میری تنخواہ صرف تین ہزار روپیہ ہے، وہ لڑکی جو تین ہزار کا صرف پیزا کھاتی تھی، وہ پورا مہینہ اتنے پیسوں سے پیٹ بھرتی ہے۔''

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''لیکن اتنی کم تنخواہ کیوں؟''

''ضرورت مند ہوں نا اس لیے۔ یتیم ہوں بے گھر اور بے آسرا ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ باقی ٹیچرز کو دس ہزار دیتی ہوں لیکن تم سے اس سرونٹ کوارٹر کے کرایے میں پیسے کٹتے ہیں اس ایک کمرے کا کرایہ وہ سات ہزار کاٹتی ہیں۔ اور مزے کی بات کہ یہ احسان بھی جتاتی ہیں کہ مجھے یہاں تحفظ دے رکھا ہے۔ میں کیسے کہوں کہ یہ تحفظ صرف اس کنڈی کی بدولت ہے جو میں اندر سے لگا کر خود کو بچا رہی ہوں۔''

وہ دم بخود اسے دیکھے اور سنے جا رہا تھا اتنی باتیں شاید اس نے پہلی بار کی تھیں وہ چنوں کی پلیٹ خالی کر چکی تھی اور اب دو گلاس پانی پی کر اس کے سامنے زمین پر پالتی مارے بیٹھی تھی۔

''ویسے سر! ایک فائدہ تو ہوا ہے اس غربت کا کہ اسمارٹ بہت ہوگئی ہوں۔'' وہ یوں ہنسی کہ اس کے بین ایمل کو سنائی دینے لگے۔ اس نے نظر بھر کر دیکھا تو اس کا لاغر جسم خوراک کی کمی کی فریاد کر رہا تھا۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، مرجھایا ہوا چہرہ اور لباس کے نام پر بدن سے لپٹے بے رنگ سے کپڑے جو بار بار دھلائی کے بعد اپنی اصلی رنگت کھو چکے تھے۔ ایمل خان کے دل کو کسی نے جیسے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

''تم وراثت کی حق دار تھیں۔ اتنی دولت کہاں گئی تمہارے باپ کی اور۔ باقی رشتے دار بھی تو ہوں گے وہ سارے کہاں ہیں؟'' ایمل کے کہنے پر وہ ایک بار پھر ہنسی۔

''ابھی بتایا تو ہے سر! میرے جانے کے چند گھنٹوں میں ہی مجھے عاق کر دیا تھا میرے باپ نے۔ میری سوتیلی ماں کی فرمائش اور میری نافرمانی کی سزا کے طور پر، یا ہوسکتا ہے ان سب نے سازش کی ہو میرے باپ نے یہ سوچ کر میرے لیے کچھ چھوڑ بھی دیا ہو کہ روز محشر جواب دہ ہونا پڑے گا لیکن ان کی بیوی اور بیٹوں کو ان کی آخرت سے کیا لینا

دینا۔"

وہ کیتلی سے چائے کے نام پر کالا قہوہ کپ میں ڈال کر اسے کپ تھما چکی تھی اور چنے بھی پلیٹ میں ڈال کر اس کے سامنے رکھ دیے تھے۔

"رہی بات رشتے داروں کی تو میں نے کون سا کوئی اچھا کام کیا تھا جو رشتے دار میرے سر پر ہاتھ رکھتے؟ ننھیال ددھیال سب ایک ہی خاندان ہے، ان سب کے دلوں میں میرے لیے اس قدر نفرت ہے کہ ماموں، چچا یا جو بھی رشتے دار مجھے دیکھتا قتل ہی کرتا۔ ہمارے ہاں پٹھانوں میں غیرت کے نام پر بیٹیوں کا قتل معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ جو بھی ہے زندہ تو ہوں۔ اخبار کی سرخی تو نہیں بنی نا وہاں جا کر۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ ایوب صاحب کون ہیں۔"

اب کی بار وہ طنزیہ انداز میں ہنسی نہیں تھی بلکہ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا تھا۔

"ممتاز آپی کے شوہر ہیں۔ جن کا یہ گھر ہے اور جن کے اسکول میں مجھے نوکری ملی ہوئی ہے۔ ایوب صاحب مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ میں اگر ممتاز آپی سے ان کی شکایت کروں تو وہ یقیناً انہیں تو نہیں چھوڑیں گی بلکہ مجھے ہی گھر سے نکال دیں گی اور سر؟ میں جو چند گھنٹوں تک بے سروسامانی کے عالم میں کھلے آسمان تلے بیٹھی ہوں اس کے بعد مجھے سر کی یہ چھت بھی غنیمت لگتی ہے۔ میں نے اس دن کئی دوستوں کے نمبر ملائے۔ رشتے داروں کی منتیں کیں لیکن کوئی گھر سے بھاگی ہوئی باپ کی قاتلہ اور عاق شدہ لڑکی کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔"

وہ تھوک نگل کر گلے میں پھنسے ہوئے آنسوؤں کے پھندے کو اندر اتارنے لگی۔

"مجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر لیتیں، بخدا کبھی یوں اکیلا نہ چھوڑتا۔" جی چاہا یہ کہنے کے لیے لیکن چپ ہی رہا

"لیکن سر! آپ یہاں کیسے اور میرا پتا کیسے ملا آپ کو؟"

اسے تجسس ہوا۔

"بس جذبے سچے ہوں تو جو چاہو مل جاتا ہے۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

وہ پھر ہنسی۔ "سر! اجازت کیسی اب کوئی سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا۔ ایک مدت سے کسی نے یہ نہیں کہا، میں ہوں نازری..... ایک ہی سہیلی تھی پلوشہ، وہ بھی بدل گئی ہے یا شاید مجبور ہے بے چاری۔ اچھا چھوڑیں، آپ جو پوچھنا چاہ رہے تھے۔ وہ پوچھ لیں۔"

اس نے اتنی دیر میں پہلی بار آنکھیں دوپٹے کے کونے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"حارث کے لیے کیا سوچتی ہیں؟" وہ نظریں چرا کر پوچھ رہا تھا

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی۔

"مطلب کیا اب بھی اس سے.....؟"

وہ جھجک گیا۔

"ارے نہیں سر! وہ سب تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب مجھے اس کا اصلی چہرہ نظر آیا تھا اور میں تو شکر کرتی ہوں کہ اس دن نکاح کے سارے انتظامات مکمل ہونے کے باوجود اللہ نے مجھے بچا لیا ورنہ اور بہت سارے الزامات کے ساتھ طلاق یافتہ کا کلنک بھی پیشانی کو بدنما کر دیتا۔ یقین کریں کہ میں نے اسی وقت اسے دل سے باہر نکال کر اندر سے کنڈی چڑھا لی تھی۔ اب کوئی بھی مرد دل کے دروازے کو دھکے دے کر کھولنے کی کوشش کرتا رہے، یہ دروازہ کھلے گا نہیں۔" فیصلہ کن انداز تھا

"ہو سکتا ہے کوئی سچا اور مخلص انسان محبت کی چھڑی ہاتھ میں پکڑے دستک دے تو اسے واپس لوٹانا اچھی بات تو نہ ہوگی نا؟" وہ معنی خیز بات سن کر ایک پل کے لیے رکی اور مسکراتے ہوئے بولی

"سر! آپ اتنے پڑھے لکھے اور قابل انسان ہیں۔ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ محبت کی چھڑی نہیں ہوتی بلکہ محبت کا اسم تو کھل جا سم سم والی

تاثیر لیے ہوتا ہے جب کوئی ایسا انسان آئے گا تو اسے دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ کہے گا کھل جا سم سم اور دل کا دروازہ کھل جائے گا۔''

ایمل خان کا دل چاہا، کہہ دے کھل جا سم سم لیکن وہ چپ رہا۔

''اس وقت ایک جوان مرد آپ کے ساتھ اس کمرے میں اکیلا بیٹھا ہے، زمانے کے سرد گرم آپ دیکھ چکی ہیں۔ انسان کے ساتھ شیطان ہر وقت لگا رہتا ہے۔ مجھ سے ڈر کیوں نہیں لگ رہا؟'' اس کے سوال پر وہ جھٹ سے بولی۔

''آپ کے ہوتے ہوئے تو سارے ڈر ختم ہوگئے ہیں، آپ جیسے لوگ عزتوں کو صرف اپنے رشتوں کے لیے مختص نہیں سمجھتے بلکہ وہ ہر عورت کو یہ سمجھے بغیر کہ اس سے ان کا رشتہ کیا ہے عزت دیتے ہیں۔ میں نے شاید زندگی میں پہلا مرد ایمل خان دیکھا ہے جس سے مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔''

ایمل نے پرسکون انداز میں لمبی سانس لی۔

''چلیں اٹھیں۔'' ایمل نے کپ فرش پر رکھا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''لیکن کہاں سر؟'' وہ حیران تھی۔

''میرے اور اپنے گھر..... میں تم سے بڑے بڑے وعدے تو نہیں کرتا کہ آسمان سے تارے توڑ کر مانگ میں سجا دوں گا یا تم کو رانی بنا کر رکھوں گا لیکن ایک وعدہ کرتا ہوں کہ بہت چاہوں گا۔ جان سے بڑھ کر خیال بھی رکھوں گا اور تمہارے علاوہ کسی کو نظر بھر کر دیکھوں گا بھی نہیں۔''

وہ کئی لمحوں تک اسے بے یقینی سے دیکھتی رہی اس کی زبان بند تھی۔ اس کی سماعتوں میں ایمل کے الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔ ایمل کا لہجہ گہرا اور سچا تھا۔

''لیکن سر! یہ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کہاں آپ اور کہاں میں۔ یقیناً آپ مجھ پر ترس کھا رہے ہیں۔ عمر بھر کے فیصلے اتنی آسانی سے نہیں کیے جاتے، صرف اور صرف انسانی ہمدردی کے تحت۔'' وہ اب بھی حیران تھی۔

''مجھے تم سے محبت ہے اور یہ میں کسی بھی لڑکی سے پہلی بار کہہ رہا ہوں۔ سمجھیں؟ اب چلو جلدی کرو۔ حارث گھر پہنچنے ہی والا ہوگا۔'' حارث کے نام اور ایمل کے اظہار محبت پر وہ اپنی سرخ پڑتی رنگت کو نہ چھپا سکی۔

''اسے معاف کر دو زرتاشہ! وہ میری محبت میں اتنی دور تک چلا گیا تھا ورنہ وہ بہت ستھرے کردار اور نیک دل کا مالک ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سہم سی گئی۔

''جا کر دیکھو کون ہے۔''

''وہی کمینہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، دروازہ کھولو۔''

وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔

''کون ہے اندر؟'' ایک مکروہ آواز سنائی دی۔

''میرے منگیتر ہیں ایوب انکل! ملیں گے ان سے؟ آپ ایسا کریں آکر ایمل کے پاس بیٹھ جائیں۔ میں ممتاز آپی کی طرف جاتی ہوں، ان سے چند باتیں کرنی ہیں۔''

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، وہ اٹھ کر زرتاشہ کے پیچھے کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کے کندھوں پر سے دیکھا، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تیز قدموں سے تقریباً بھاگ رہا تھا، جاتے جاتے ایک آدھ دفعہ اس نے مڑ کر یوں پیچھے دیکھا تھا جیسے تسلی کر رہا ہو کہ کوئی میرے پیچھے تو نہیں آرہا۔

ایمل نے مڑ کر دیکھا۔ زرتاشہ کھل کر مسکرا رہی تھی پہلی بار اسے یوں دل سے مسکراتے دیکھ کر وہ کھل سا گیا اور دل ہی دل میں خود سے وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ یونہی اس کے مسکراتے رہنے کی وجہ بنا رہے گا۔

ایمل نے خنکی محسوس کرتے ہوئے اپنی جیکٹ اتار کر زرتاشہ کے کندھوں پر رکھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔ زندگی میں پہلی بار تحفظ کا احساس زرتاشہ کے رگ و پے میں دوڑنے لگا تھا۔

☆☆

شازیہ الطاف ہاشمی

سوتن

ایک بہت ہی سرخ تقریباً چھلا ہوا چہرہ تھا۔ وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی، حسن کی خواہش پر بلکہ تاکید پر وہ ساتھ ایک بڑی ڈش بریانی کی بھی لے کر گئی تھی۔ گرما گرم بریانی کی اشتہا انگیز ڈش کے پاروہ بہت ہنستی کھلکھلاتی ہوئی سی لگتی تھی۔ نئی نئی شادی کا روپ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے فکری اور خوشی۔ یہی تو دن ہوتے ہیں۔

''میں نائلہ، آپ کے پڑوس سے آئی ہوں حسن کی بیگم۔ آپ کے میاں نے بتایا تو ہوگا۔''

صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے تعارف کی رسم بھی ادا کر ڈالی۔ ارد گرد کا ماحول بہت اچھا تھا، خوش حالی کا پتا دیتا ہوا گھر۔ اس نے ایک مہنگا سرخ سوٹ پہن رکھا تھا۔ خوب گوری کلائیاں چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

''ایک منٹ۔ میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔'' اسے بٹھا کر وہ چلی گئی تھی۔ چائے کافی مزے دار تھی اور سلیقے سے پیش کی گئی تھی۔

''میرا نام سویرا ہے۔'' سویرا جیسی ہی تھی وہ۔ نام بتاتے ہوئے وہ سرخ ہو رہی تھی۔ سرخ انار جیسی عورت۔

''میں گھر پر ہی رہتی ہوں۔''

''اتنے بڑے سارے گھر میں اکیلی۔ یا اللہ یہ تو بہت خوش قسمت ہے۔'' نائلہ نے اسے خوش قسمت خیال کیا پھر پل بھر میں ہی دل پلٹ گیا۔ وہ بھی کوئی کم خوش نصیب نہیں جو اتنی پیاری بیٹیوں اور ایک

چھوٹے سے ''میرو'' کی امی ہے اور دو دو اپنے گھر۔ صبر کا انعام۔

''میرے میاں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ایک پل نہیں گزارتے میرے بغیر۔ ہر وقت بس مجھے ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ الگ گھر بھی انہوں نے سسر سے فرمائش کر کے علیحدہ لیا ہے تاکہ کوئی ہمارے درمیان مخل نہ ہو سکے۔''

چالیس پینتالیس سال کی سویرا ایک بار پھر ناز سے مسکرائی۔ ''یہ مسکراہٹ اس پر جچتی ہے۔'' اس نے سوچا ''اکیلی جو رہتی ہے۔ ایک میرے میاں ہیں صبح ہی ایک کپ چائے کی وجہ سے چیخ پکار مچا کر گئے ہیں۔ میں ہی ڈھیٹ ہوں، نہیں صابر ہوں جو گزارہ کر رہی ہوں۔ پتا نہیں انہیں مجھ سے محبت کیوں نہیں۔''

اب وہ اسے اپنے پیار کا کون سا قصہ سنائے۔ دس برس بیت گئے۔ محبت کی کہانیاں اب وہ کہاں سے ڈھونڈے۔ نائلہ کہتی کہ اسے صرف بچوں سے پیار ہے اور حسن کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ بھی صبح کا پہلا گرم پراٹھا سونی کو ہی دیتی ہے تاکہ وہ اسکول سے لیٹ نہ ہو جائے، اس کے لیٹ ہونے کی نائلہ کو بھی فکر نہیں ہوتی۔

''اصل میں تو تم اپنے بچوں کے لیے ہی جلدی اٹھ جاتی ہو، میرے لیے کون اٹھنے کی زحمت کرے۔'' دراصل وہ دونوں ہی بچوں کے لیے جیتے تھے، ہر پل ہر لمحہ محبت بھرا سچ بچوں جیسی کوئی اور نعمت ہے بھلا۔ سامنے بیٹھی سویرا تو پور پور محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''اسے کہتے ہیں محبت!'' وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی ناز بھری، اپنی پسند ناپسند ہر بات سے لاڈ صاف جھلکتا تھا۔ ''وہ کسی کی لاڈلی ہے اس لیے۔'' میں تو ذرا خوش ہوں تو فوراً چائے مانگ لیتے ہیں۔

''ہوں'' ایک لمبی سی اندر کی ''ہوں'' کو گیٹ پر کسی کے آنے کے کھٹکے نے توڑا۔ ایک جواں سال لڑکی تھی جو اسکول یونیفارم پہنے کافی تھکی تھکی دکھائی دیتی تھی۔

''السلام علیکم مما! السلام علیکم آنٹی! سامنے نظر بعد میں گئی تھی پھر اسے بھی سلام کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کشادہ کمرے میں غائب ہو گئی تھی۔ نین نقش بالکل سامنے بیٹھی سویرا جیسے تھے۔

''حسن تو کہہ رہے تھے کہ نیا نیا شادی شدہ جوڑا پڑوس میں آن بسا ہے۔ تم ذرا مل آنا اور دلہن کے پاس خالی ہاتھ بالکل مت جانا اور یہ اتنی پلائی بیٹی، نیا محلہ تھا اور نیا گھر'' وہ کچھ الجھ سی گئی۔

''میری بیٹی ہے ان شاء اللہ دسویں کے پیپر دے گی۔'' اس کے بعد اس نے ایک شاپر آموں کا بھر کر دیا یہ کہہ کر ان کے اپنے آموں کے باغ ہیں بہت ساری باتوں اور ہلکی پھلکی گپ شپ کے بعد جب وہ اٹھنے لگی تھی۔ تب ہی کوئی اندر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے والہانہ پن نے اسے فوراً سے پہلے غائب ہونے کا سگنل دے دیا تھا۔ مگر وہ اسے دیکھ سنبھل چکا تھا۔

''انہیں واقعی تنہائی کی ضرورت تھی۔''

چلتے چلتے نائلہ نے سوچا اور اپنا گیٹ پار کر گئی۔''

چھوٹی سی کیاری میں چھوٹے چھوٹے سرخ پھول ہوا کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا مگر صاف ستھرا گھر بہت بے ہنگم تو نہیں مگر کافی پھیلا ہوا وجود۔ بچوں کی فکریں، ہوم ورک کھانا، چائے، روٹیاں۔ سالن، کپڑے، یونیفارم سو کام تھے جو وہ اکیلے ہی بہت اچھے طریقے سے کر لیا کرتی۔

اس کی زندگی پر سکون تھی۔ ایک مطمئن مکمل گھر مگر اس جیسا والہانہ پن وہ کہاں سے لائے۔ نئی نئی شادیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے ایک دم اسے ''میاں جی'' کی آنکھیں یاد آئیں۔ ''اف اب ایسا بھی نہ ہو'' آئینے میں ایک پر سکون چہرہ مسکرایا۔

☆☆☆

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ گرمی کے لمبے دنوں کی تھکاوٹ اسے اردگرد کا بھی ہوش نہ رہنے دیتی۔ گرم کچن سے چلتے پنکھے تک کا ٹھنڈا سفر وہ کبھی کبھی ہی

کیا کرتی۔ نہیں تو کوئی نہ کوئی کام ہی کرتی پھرتی۔ کسی سے کپڑے دھوئے تو دوسروں کو نہلا دیا۔ سویرا اسے ایک دن گلی میں ہی ملی تھی۔

اب وہ کافی حد تک سویرا نہیں رہی تھی بلکہ آہستہ آہستہ اندھیرا ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ بجھی بجھی سی آنکھیں۔ سرخ گالوں پر گھٹیا کریم نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ موٹے موٹے دانے، چھائیاں، داغ دار بجھا چہرا براؤن گہرے روئیں سے جھانکتا چہرہ۔

''آپ کسی دن ہمارے گھر بھی آئیں ناں۔''

نائلہ نے دوسری بار کہا، پتا نہیں وہ کیوں نہیں آسکی تھی۔ کوئی مجبوری مصروفیت یہی سمجھا تھا اس نے۔ محلے کی حاجیانی اماں نے بتایا تھا کہ ''اس نے دوسرا نکاح کیا ہے اور پہلے شوہر کی غیر موجودگی میں وہ خیانت کرتی رہی تھی نہ شوہر کا خیال کیا نہ بیٹی کا۔ ساتھ بیٹی پچھلے شوہر کی لیے پھرتی ہے۔''

کسی کے بھی اس کے بارے میں اچھے خیالات نہیں تھے۔ میاں اٹھائیس سال کا اور بیگم پچاس سے بھی اوپر۔ کچھ اپنی عمر کا ہی لحاظ کر لیا ہوتا۔ اپنے معاشقے میں بیٹی کا بھی نہ سوچا۔ دنیا کے تو جو منہ میں آتا ہے، بکے جاتی ہے۔ کیا پتا پچھلا شوہر اچھا نہ ہو۔ اس نے سنی سب کی مگر آگے پہنچائی نہیں۔

کوئی مسئلہ ہوگا رسمی سی گفتگو کے بعد خیالوں کے اڑتے بگولوں کے درمیان وہ ہمسائی کے گھر سے اپنی کڑاہی واپس لے کر آ گئی۔

اچھی بھلی تو ہے۔ جب دو دل راضی ہیں تو کسی کو کیا تکلیف، جب اسے اس عمر میں بھی اس سے محبت ہے تو بولنے والوں کی تنقید بے جا ٹھہری۔ نائلہ نے اسے کبھی برا نہیں سمجھا تھا۔ بھلی عورت تھی وہ۔

ان کے گھر میں بہت خاموشی رہتی تھی نہ ٹی وی کی آواز نہ کوئی اور بات۔ کبھی بھی کسی آواز نے اس خاموشی کے پہرے کو نہیں توڑا۔ بھری دوپہروں میں تنہائی کا شور نائلہ کو بہت شدت سے محسوس ہونے لگا تھا۔

دونوں ماں بیٹی کی آواز بھی کبھی کسی نے نہیں سنی، کیا پتا وہ کم گو ہوں۔ زیادہ بولنا پسند نہ ہو انہیں اور پتا نہیں کب چڑھتا سورج ان کے راز کو بھی فاش کر گیا تھا۔

فجر کی اذان سے بہت پہلے آوازوں کی گھن گرج نے نائلہ کو اٹھا دیا تھا۔ گھٹن زدہ آواز بہت آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ وہ گندی گالیاں دے رہا تھا۔ ڈیڑھ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی ان کے ہاں یا شاید دو سال گزر گئے تھے۔

''اولاد بھی ساتھ ہی لے آئی میرا کون سا اپنا خون ہے — جو کھائے تو دکھ نہ ہو۔ کسی کا خون میرے خون پسینے کی کمائی کھاتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ ذلیل عورت اتنا پیار تھا تو اسی کے پاس رہتی۔ میرے پلے پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

باپ تھوک گیا مجھ پر، بہن بھائی چھوٹ گئے۔ رہ کیا گیا ہے میرے پاس۔ ایک تمہارے لعنتی وجود کے علاوہ۔''

آہ سویرا کی بیٹی بھی یقیناً پاس ہی تھی۔ سویرا منمنا رہی تھی۔ پست ہارا لہجہ، دبی دبی سسکیاں۔ وہ اپنے حق کو بڑی غلط جگہ، غلط وقت پر استعمال کر بیٹھی تھی۔

رنگیلے کے بھیجے ریال اسے بڑی شدت سے یاد آئے تھے جنہیں اس کی بیٹی پر بڑے کھلے دل سے خرچ کیا جاتا تھا۔ اب اسے ایک ایک دھیلا کھٹک رہا تھا۔

نائلہ سن سی کھڑی رہ گئی۔ رنگیلے کی سابقہ بیوی اپنی رنگین مزاجی کے ہاتھوں دھوکا کھا کر زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ سستی کریم اور سستے عشق دونوں نے اپنا اصل رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ دیوار پار کیا سوچ رہی ہوگی پر نائلہ کے ذہن میں ایک بات آئی تھی۔

ہر چمکتی شے سونا نہیں ہوتی پرانا محاورہ مگر اس میں بات سچ کی طرح نئی نکور تھی۔

☆☆

حمیرا نگار عدنان

شام کی جو ڈالی میں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بد دعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر و اسے منالے۔وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اتر تا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔سہیل اپنے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آفی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جو ابا وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ایما پولیس بلا لیتی ہے۔گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کردیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت ستاتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر جہان سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آکر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔

ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔

میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔

کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔

کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔

کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آجاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔

حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آجائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔

موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آجائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آجاتی ہے۔

موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دیبی اپنے بچے کے ساتھ جورات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آجاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئر پورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر

متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔
ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔
منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔
زینب کو شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔
بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی تھی۔
سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔
سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔
زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔
سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔
موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر وجیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔
حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مر جائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔
میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔
موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کر دی ہے۔
طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آذر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔
کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔
موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروا لیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پوچھتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔

فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔

کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

بائیسویں قسط

''یار سن، بہت بری خبر ہے۔'' کافی پھینٹتے فرحان کے ہاتھ لمحہ بھر کو ٹھٹکے۔ اس نے فون دوسرے کان سے لگا کر شانے اور کان سے دبایا۔

''تیرا بھی یار! ریکارڈ ہے، آج تک تو نے کبھی کوئی اچھی خبر نہیں سنائی۔''

وہ جواباً فواد کا مذاق اڑانے لگا۔

''مذاق کی بات نہیں یار! میرا دل بیٹھا جارہا ہے کیسے زبان سے بولوں۔ بات ہی ایسی ہے۔'' وہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔

فرحان بری طرح چونکا۔ فواد سنجیدہ ہونے والی چیز کبھی نہیں رہا تھا تو اس وقت اسے کیا ہوا تھا۔

''اور اب کتنا بور کرے گا یار! بول بھی دے، ایسا کیا سن لیا تو نے۔ کیا ہیروشیما پر پھر بمباری ہوگئی جو تیری سٹی گم ہورہی ہے۔'' وہ کافی کا مگ تیار کرتے ہوئے کچھ انجوائے کرتا ٹی وی کی طرف جانے لگا۔

''ردا مرگئی فرحان!''

اور فرحان کے ہاتھ سے مگ چھوٹ کر نیچے جا گرا، اس کے سلیپرز میں مقید پاؤں گرم کافی سے جل چکے تھے۔

لیکن جلن یا تکلیف کا کیسا احساس تھا جو محسوس ہی نہیں ہورہا تھا۔

''میں تیرا گلا دبادوں گا آکر ابھی۔ تو نے یہ بکواس کیا سوچ کر کی الو کے پٹھے.....'' وہ ہذیانی انداز میں گالیاں بکتا جارہا تھا۔

''مرگئی ہے، وہ اپنی شادی کے جوڑے میں، جسے تو اپنی زندگی کہتا تھا۔''

وہ جواباً اور بھی زور سے چیخا تھا۔

فرحان ان ہی قدموں پر کرچی کرچی ہوئے مگ کے پاس فرش پر جیسے ڈھے سا گیا۔ ایسا تو اس نے مر کر بھی نہیں سوچا تھا۔

سوچا کیا، چاہا بھی نہیں تھا۔

اس نے تو صرف یہ چاہا تھا جسے چاہ رہا ہے بس وہ مل جائے۔

مگر زندہ یا مردہ؟

یہ تو اس نے کبھی خود سے بھی نہیں پوچھا تھا۔

اسے ردا ''زندہ'' چاہیے تھی یا مردہ۔

ورنہ وہ یہ سارا گند اکھیل جماتے ہوئے، یہ گھٹیا بساط بچھاتے ہوئے ذرا سی دیر کو تو سوچتا۔

''یار! تو جانتا ہے ناں، ردا میرے لیے کیا ہے پھر ایسا مذاق..... تجھے خوف خدا بھی نہیں، شرم بھی نہیں، دوستی کا احساس، لحاظ بھی نہیں۔''

وہ اب ٹوٹے پھوٹے بے ربط لہجے میں بول رہا تھا۔

''میرے بس میں ہوتا تو میں یہ خبر بھی تجھے نہیں دیتا۔'' فواد شرمندہ، دکھی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اسے فرحان کی حالت کا اندازہ بھی ہورہا تھا اور شدید دکھی بھی۔ مگر اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

''اسی لیے تجھے سمجھاتا تھا، منت کرتا تھا یار! اتنا آگے نہیں جا، ایسے نہ کھیل اس کی جیتی جاگتی زندگی سے۔'' فواد اسے احساس دلا رہا تھا۔

''اس نے خودکشی کرلی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''میرے لیے ناں۔'' آنکھیں موندتا وہ سرشار سا تھا۔

''نہیں، ہارٹ فیل ہوا ہے اس کا۔ ڈاکٹر نے کہا، اس کا دل بہت کمزور تھا، اور وہ مسلسل کسی دباؤ میں تھی۔ بالآخر اس کا دل یہ پریشر، یہ دباؤ سہہ نہیں سکا تو.....

یار میرا تو دل غم سے پھٹ رہا ہے، آج اس کی شادی تھی۔ وہ شادی کے جوڑے میں تیار تھی، اس کا شوہر، اس کے گھر والے، اس کے ماں باپ، بھائی بہن کیا بیت رہی ہوگی ان سب کے دلوں پر۔'' فواد بات کرتے

کرتے شاید وہی پڑا تھا۔
اور فرحان تو گم صم جیسے بولنا بھول گیا تھا۔
وہ یوں زمین پر بیٹھا تھا جیسے ردا کی میت اس کے سامنے ہو۔
''بول ناں، کیوں کیا تو نے ایسا اس کے ساتھ۔ اس کا کیا جرم تھا۔ تجھ سے ذرا سی محبت ہی تو کی تھی۔ شریف، معصوم لڑکی کو تو نے اتنی بڑی سزا دی فرحان! تو میرا دوست ہے، میں تو تجھے کچھ نہ کہہ سکوں لیکن ردا کی جوان میت تیرے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جائے گی۔ تجھے کہیں چین نہیں ملے گا، بہت برا کیا تو نے یار..... بہت برا۔''
فواد بری طرح سے ٹوٹا تھا اور دوسری طرف فون سنتا فرحان اب قدرے پرسکون فرش پر بکھری کرچیاں سمیٹ رہا تھا۔
اس کا انداز تسلی بھرا تھا۔
''یار! وہ ذرا سی محبت نہیں تھی۔ وہ تو میری، اس کی کل کہانی، کل کائنات تھی۔ دیکھو تو ہم دونوں ہی اپنی اس کل کہانی میں کتنے ایمان دار نکلے۔'' اس کے لہجے میں ذرا بھی ملال نہیں تھا۔
فواد کچھ چونک سا گیا۔
''اس نے بے وفائی تو نہیں کی ناں۔ مجھ سے محبت کی تو نبھائی بھی۔ وہ جیتے جی کسی اور کی نہیں ہوئی، تم اسے ذرا سی محبت کہہ کر ہماری لازوال محبت کی توہین تو نہ کرو۔'' وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے ردا زندہ ہو اور اس کے سامنے بیٹھی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہی ہو، جیسے آفس میں کام کے دوران اسے دیکھا کرتی تھی۔
''پاگل ہو گیا ہے تو اور تو اسے بے وفائی کہہ یا بے لحاظی۔ بہتر ہے تو میرا فلیٹ آج ہی خالی کر دے۔ پولیس تیرے پیچھے لگی ہے۔ اب ردا کا باپ تجھے نہیں چھوڑے گا۔ اسے تجھے کسی قبر سے نکالنا پڑے ڈھونڈ لے گا تجھے۔'' فواد تیز تیز بولتا گیا۔
اور فرحان زور زور سے ہنسنے لگا۔
''ہنس مت۔ چیخ..... اپنے کپڑے پھاڑ..... ماتم کر، کچھ کر..... لیکن تجھے آج ہی میرا فلیٹ خالی کرنا ہوگا۔ میں تجھ جیسے بے حس، خود غرض انسان سے مزید دوستی نہیں نباہ سکتا۔'' وہ چیخ رہا تھا۔
کرچیاں فرش سے سمیٹی جا چکی تھیں۔
''چیختا کیوں ہے، مجھے اب تیرے اس ڈربے میں ایک دن تو کیا ایک گھنٹہ بھی مزید نہیں رکنا۔''
اس نے کرچیاں ڈسٹ بن میں انڈیل دیں۔
دوسری طرف فواد حیران رہ گیا۔
وہ فلیٹ چھوڑنے پر ایک دم سے راضی کیسے ہو سکتا تھا۔
''میں آج ہی چلا جاؤں گا یہاں سے۔ تجھے کوئی بے اعتباری ہے تو آ کر چیک کر لینا، میں نے تیرے فلیٹ سے ایک سوئی بھی نہیں اٹھائی۔ نہ کچھ ساتھ لے کر جاؤں گا اور چابیاں تیرے ہمسائے کو دے جاؤں گا۔ اگر تو خود نہیں آیا تو.....'' وہ یوں تسلی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا جیسے وہ لمبی چھٹی ملنے کی خوشی میں اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہا ہو۔
''تو تو کہاں جائے گا فوراً؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی فواد نے پوچھ لیا۔
''جہاں سے آیا تھا، وہیں جاؤں گا۔ جہاں جاتے ہیں۔'' وہ اطمینان سے بول رہا تھا۔
''کہاں..... کہاں جائے گا؟'' فواد الجھا۔

باہر کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا، بیل بھی دیوانہ وار بجے جا رہی تھی۔ فرحان ساکت کھڑا بجتے چیختے دروازے کو دیکھتا جا رہا تھا۔

''دروازہ بج رہا ہے اور بیل بھی بج رہی ہے۔ کون ہے باہر، دیکھو تم جا کر۔'' فواد وہ سارا شور سن چکا تھا۔

''تم چابیاں آ کر لے جانا۔'' وہ ان سنی کر کے بولا۔

''خدا حافظ۔''

دوسری طرف سے لائن کٹ گئی۔

''فرحان..... فرحان یار! بات تو سن..... میں آ رہا ہوں، ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ بے جان لائن سے بولے جا رہا تھا۔

پریشانی میں فون بند کرتے وہ تیزی سے گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر کی طرف بھاگا تھا۔

☆☆☆

خوشیوں بھرا گھر ماتم کدہ بن چکا تھا۔

کہانیوں، فلموں میں چلی ہوئی لائن کبھی اتنی تکلیف دہ، اتنی اذیت ناک نہیں ہو سکتی جتنا حقیقت ہوتی ہے۔

اور حقیقت بہت اذیت ناک تھی۔

اس کی جیتی جاگتی گڑیا جیسی بیٹی جسے صبح آخری صبح بہت پیار بھرے انداز میں اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اٹھایا تھا۔

اس کی فراخ دو دھیا سی پیشانی کو چوما تھا۔

اس کی سرمئی سرخ ڈوروں والی نشیلی آنکھیں جنہیں چاہنے کے باوجود وہ نظر بھر کر نہیں دیکھ پائی تھی کہ کہیں اس کی اپنی نظر نہ لگ جائے۔

اسے کیا پتا تھا کہ بدقسمتی کی حریص نظریں پہلے ہی اس کی موہنی سی بیٹی کی خوشیوں کو لگ چکی ہیں۔

وہ جو سرخ چوڑے میں دلہن بنی تیار تھی۔

اسے کیا خبر تھی وہ رات جو اس کی سہاگ کی سیج پر آنے والی تھی، سفید کفن میں قبر کی ٹھنڈی یخ سیج پر گزرنی تھی۔

سونیا کا دل پھٹا جا رہا تھا۔

اور اسے اپنے دل کی سخت جان پر شدید حیرانی تھی کہ یہ اب تک دھڑک کیوں رہا ہے، پھٹا کیوں نہیں۔

اور اس کا دماغ ابھی بھی..... سب کچھ جانتے بوجھتے بھی زندہ ہے۔

جب ردا مر چکی ہے، اس کی ہر دل عزیز راج دلاری بیٹی، اس کی پہلوٹھی کی اولاد، اس کا پہلا عشق اس فانی دنیا سے منہ موڑ چکا ہے تو وہ خود کیوں زندہ ہے۔

شادی والے اس ماتم کدہ میں بہت رش تھا۔

اس جوان مرگ کی خبر جس جس کان تک پہنچی، وہی آخری بار اس دلہن کو دیکھنے ضرور پہنچا جو اپنے حقیقی ملن کو جا رہی تھی۔

سب اندر باہر آ جا رہے تھے۔

سب کے چہروں پر جیسے موت نے اپنی زردی کی ایک ایک چٹکی چھڑک دی تھی۔ پیلے زرد، شدید دکھی دل اور چہرے لیے سب موجود تھے مگر پھر بھی سونیا کو لگ رہا تھا وہ اس بڑے سے ماتم کدے میں ردا کے ساتھ بالکل

اکیلی ہے۔

اس کا سرخ جوڑا اتار دیا گیا تھا۔

سفید بے رنگ کفن جس پر کا خوشی کا رنگ اب کبھی اتر نہیں سکتا تھا۔

اس نے اتنی جلدی سرخ جوڑا اتار کر سفید کفن اوڑھ لیا تھا، کیا کسی دلہن کا دل اتنی جلدی اپنے عروسی جوڑے سے بھر سکتا ہے۔

اور وہ سفید جوڑے میں بھی سفید گلاب کی طرح کھل رہی تھی۔

موت کے وقت اس کے چہرے پر جو زردیاں، جو سفیدیاں، نیلاہٹیں اس کے چہرے پر گھلی تھیں۔

اب وہ سفید کفن پہن کر پھر سے گلابیوں میں بدل گئی تھیں۔

اور دیکھنے والے کہتے تھے کہ کسی نے آج تک اتنی حسین میت دیکھی تھی نہ ایسی حسین دلہن جو سفید لباس میں تھی۔

سونیا نے اس سارے دورانیے میں ایک بار بھی اپنی پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔

کہیں ردا کا معصوم چاندنی سے دھلا حسین چہرہ اس سے اوجھل نہ ہو جائے۔

مگر اب اس چاند چہرے کے اوجھل ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

زینب سونیا کو اپنی بانہوں میں جکڑے ہوئے تھی۔

جب عین رخصتی کے وقت پر ایک شور سا مچا۔

یہ الگ بات کہ وہ شور نہ تو دلہن کی رخصتی کا تھا نہ کیمرہ مینوں کی فلیش لائٹس کا۔ نہ دودھ پلائی کی رسم میں جھگڑے، نوک جھوک کا۔ نہ جوتا چھپائی کا۔ نہ تو آرسی مصحف کا۔

یہ شور تو کلمہ طیبہ کی بلند ہوتی صداؤں کا تھا۔

جن سے سونیا کا ننھا سا دل سہم کر سینے میں سکڑ گیا۔

اس نے دونوں ہاتھوں اور بازوؤں سے ردا کے بے جان وجود کو جسے سرخ کامدانی دوپٹے میں چھپا دیا گیا تھا، چھپا لیا۔

"ردا میری جان..... میری گڑیا..... میں اپنی لاڈلی کو کہیں نہیں جانے دوں گی..... کوئی نہیں لے کر جائے گا اسے..... سلیمان بھی نہیں....."

اور سرہانے کھڑا سلیمان ہچکیوں سے رونے لگا۔

اس بے وفا دلہن کی بے وفائی پر اس کے آنسو رک نہیں پا رہے تھے جس نے رات بھر اس سے وفا نبھانے کے وعدے کیے تھے۔

آج ملن کی آس کی دوڑ اس کے ہاتھ میں تھما کر خود انجان دیس کے سفر پر، انجان راستوں کی راہی بن گئی تھی۔

آزر کو تو کبھی آج تک پتا ہی نہیں چل سکا تھا کہ ردا اس کے لیے کیا تھی۔ وہ تو اس کے وجود کا ایک حصہ تھی شاید.....

اور جب وجود کے ایک حصے کو کاٹ کر الگ کر کے لے جایا جائے تو کیسا لگتا ہے اسے، اس تکلیف کا تو اندازہ ہی نہیں تھا۔

رمشا اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی، وہ ماں کے ساتھ بہن کے بے جان وجود سے لپٹے جا رہی تھی۔

اس کی چیخیں اور پکار دلوں کو ہلا رہی تھی۔

حمزہ دور کھڑا دیوار کا سہارا لیے جیسے خود کو گرنے سے بچا رہا تھا۔ وہ جو اتنے دنوں سے سب سے روٹھا ہوا تھا۔

"کاش آپی! اپنے غصے اور ضد سے نکل کر میں نے کچھ وقت تو تمہارے پاس گزارا ہوتا۔ تمہارے دل پر

کیسا بوجھ تھا جس نے تمہیں مار ہی ڈالا۔ شاید تم مجھ سے کہتیں تو وہ بوجھ کچھ کم ہو جاتا۔''

وہ خود سے باتیں کرتا ردا کے سرخ دوپٹے میں چھپے بے جان وجود کو بے آواز آنسوؤں سے پکارے جا رہا تھا۔

یہ الگ بات کہ اب اس کی پکار کا جواب دینے والی بہت دور جا چکی تھی۔ بے یقین لمحے..... جن کی ہم میں سے کسی نے بھی تیاری نہیں کی ہوتی، جب اچانک سے سامنے آ جاتے ہیں تو ہم پر اپنی شخصیت کا اصل پول کھلتا ہے کہ جانے والے کے کچھ نہ کچھ قرض ہماری ذات پر بھی تھے۔

ایک ان کہا پچھتاوا آزر کے دل میں سر اٹھانے لگا۔

ماں باپ کی ضد۔

باپ کی انا..... کاش وہ فرحان کے ساتھ ردا کی شادی کو اپنی ضد کا مسئلہ نہ بناتا بلکہ بیٹی کو فرحان کا اصل روپ دکھاتا۔

مگر ہم انسان سب کے سب اپنی انا، اپنی ضد میں اتنے پکے ہوتے ہیں کہ کچے پھلوں جیسے انمول رشتے اپنے ہاتھ سے ڈالیوں سے توڑ پھینکتے ہیں۔

فضا میں کلمہ شہادت کی صدائیں تھیں، چیخوں اور بین کے ساتھ ردا کی رخصتی ہو گئی۔

☆☆☆

ٹپ ٹپ گرتے آنسو موحد کی ہاتھ کی پشت پر گر رہے تھے۔

کشف بہت دیر سے لان کے اندھیرے گوشے میں بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روئے جا رہی تھی۔ جب تدفین کے بعد واپس آتے ہوئے موحد کی نظر اس پر پڑی تھی، سونیا کی حالت خراب تھی۔

ڈاکٹر کو بلایا گیا تھا اسے ہوش نہیں آ رہا تھا۔

سب تدفین کے فوراً بعد سونیا کے پاس چلے گئے۔

موحد خاموشی سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

موحد کے پاس تسلی کے لیے کوئی الفاظ نہیں تھے۔

اسے تو موت یوں بھی گنگ کر دیا کرتی تھی۔

پھر اس طرح کی موت۔

موت اسے کئی سال پیچھے لے جاتی، جہاں ایک چھوٹا سا بچہ مرے ہوئے باپ کی ڈیڈ باڈی کو تلاش کر رہا ہے۔

اسے رونے کے لیے، آنسو بہانے کے لیے مرا ہوا وجود نہیں مل پا رہا تھا اور اتنے سالوں کے وہ اندر ہی اندر جمے ہوئے آنسو کبھی بھی پگھل نہیں سکے تھے مگر آج ردا کی جوان موت نے ان جمے ہوئے آنسوؤں کو بھی پگھلا دیا تھا۔

اس کا نرم و نازک وجود کالی مٹی کے حوالے کرنے والا تو نہیں تھا پھر بھی اسے منوں مٹی تلے دبا دیا گیا۔

اس کا پتھر دل کیوں نہ پگھلتا۔

''بس کرو کشف..... مت روؤ اتنا۔'' وہ بہت دیر بعد اس کے نہ رکنے والے آنسوؤں کے سامنے بے بس ہو کر فقط یہی کہہ سکا۔

ارد گرد تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔

شادی کے لیے لگائی گئی پارٹی لائٹس سب بجھا دی گئی تھیں۔ لان میں بے ترتیب کرسیاں، میزیں، برتن، پھولوں کی مسلی ہوئی پتیاں، رنگین پنیاں جانے کیا کیا بکھرا ہوا تھا۔

''مجھے لگتا ہے، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔''

اس نے بہت دیر بعد سر اٹھا کر ایک دم سے کہا تو موحد کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ اس کی سرخ سوجی ہوئی

آنکھیں، ناک اور متورم چہرہ۔ وہ زیادہ دیر اس کی سوگوار آنکھوں میں دیکھ نہیں سکا۔
''ایسا نہیں سوچتے۔'' اس نے کشف کا ہاتھ پکڑتے ہوئے نرمی سے کہا۔
''میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہیں، کیا میرے ساتھ ایسا نہیں ہونے والا۔'' وہ بری طرح سے بکھری ہوئی تھی۔
''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔
''دنیا کے سب مرد جھوٹے اور منافق ہیں، میں صرف اتنا یقین رکھتی ہوں۔'' وہ نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کر جانے لگی۔
موحد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''مجھے نکال دو ان سارے مردوں سے۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہتا اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
''آپ کی وجہ سے تو دنیا کے سارے مردوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے میرا۔'' وہ بھی جواباً بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔
وہ کچھ بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔
''میں تمہارے ساتھ ہوں کشف! ہمیشہ۔'' وہ آہستگی سے اسے یقین دلانے والے انداز میں بولا۔
''اس سے بڑا جھوٹ اگر کوئی بول سکتے ہیں تو وہ بھی بول دیں۔'' وہ طنز سے نظریں جما کر بولی۔۔
''محبت اگر جھوٹ ہے تمہارے نزدیک تو یوں ہی سہی۔''
اس نے بھی اصرار سے گریز کیا تو کشف کے آنسو کچھ اور روانی سے بہنے لگے۔
''یار! میں کیسے سمجھاؤں تمہیں، میں ایسا نہیں ہوں جو تم سمجھتی ہو۔'' وہ بے بسی سے ہار کر رہ گیا۔
''آپ ویسے بھی نہیں ہیں جیسا میں نہیں سمجھتی۔'' وہ تڑپ کر بولی۔
''اچھا، جو سمجھنا ہے سمجھو لیکن پلیز اندر تو چلو، یہاں اندھیرا بہت ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔
''جتنا اندھیرا میرے اندر ہے، شاید اس سے زیادہ نہیں۔ آپ جائیں۔'' وہ بے رخی سے کہہ کر رخ پھیر گئی۔
موحد کی سمجھ میں نہیں آیا اسے مزید کیا کہے۔
وہ چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد جانے لگا اور دور کھڑا منصور ان دونوں کو یوں تنہائی میں ساتھ دیکھ کر بمشکل اپنے طیش پر قابو پاتا اندر چلا گیا۔

☆☆☆

وہ دلہن کے روپ میں سجی سنوری، سرخ جوڑے میں ملبوس اس کے سامنے کھڑی تھی۔
وہ دلہن بن کر اتنی حسین لگے گی ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھے جا رہا تھا۔
''آؤ ناں، اب کیوں کھڑے ہو۔'' وہ شرمیلی سی مسکان سرخ رنگ لبوں پر سجائے مدھر لہجے میں کہہ رہی تھی۔
اور وہ تو جیسے سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔
ایسا تو اس نے مر کر بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا ملن ہو جائے گا اور وہ بھی خود ہی آ جائے گی سب کو چھوڑ کر، ٹھکرا کر۔
''تمہیں یقین نہیں آ رہا فرحان! میں تمہارے لیے سب کو چھوڑ آئی ہوں۔ اپنے ماں باپ، سلیمان..... سب کو۔''
وہ اس کی آنکھوں میں لکھی بے یقینی پڑھتے ہوئے دو قدم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''سلیمان!'' وہ چونکا۔ ''تمہارا تو نکاح ہو چکا تھا ناں اس سے۔'' فرحان کے لہجے میں مجرمانہ شرمندگی تھی۔
وہ اسے دیکھتی رہی۔
''بولو ناں، پھر تم کیسے آ گئیں؟'' وہ کچھ بے قرار سا ہو کر آگے بڑھا تھا، وہ بس اسے تکے جا رہی تھی۔
اس کی آنکھوں میں کیا تھا؟

محبت تھی، نفرت تھی، عداوت تھی، بے قراری تھی، چاہت تھی یا مار ڈالنے کی حسرت تھی۔
فرحان سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
اس کی نگاہیں لمحہ بہ لمحہ سرد ہوتی جا رہی تھیں۔
''تم جانتے تھے ناں، میرا سلیمان سے نکاح ہو گیا ہے۔'' اب کے اس کی آواز جیسے پہاڑوں سے ٹکرا کر آ رہی تھی۔ بھاری پتھروں کے ٹکرانے کے جیسی۔
''پھر بھی تم نے مجھے مار ڈالا۔'' وہ اب خود اس کے نزدیک آ رہی تھی۔
فرحان ڈر سا گیا۔
اس کے سرخ لباس کا رنگ رفتہ رفتہ مدہم پڑتا جا رہا تھا۔
خزاں رنگ بجھا بجھا، سرخ رنگ میں سرمئی اندھیرے گھل رہے تھے اور ان اندھیروں سے پھوٹتی بے رنگ سفیدیاں اس کا لباس اس کے چہرے، آنکھیں حتیٰ کہ اس کے بالوں میں بھی سرائیت کر رہی تھیں۔
''مم..... میں نے نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ بڑی طرح سے ڈر گیا۔
''ہاں تم نے کچھ نہیں کیا محبت بھی تو کی تھی وہ بھی ذرا سی۔''
اس کی ہنسی کی آواز پھٹ رہی تھی۔
فرحان کا چہرہ خوف سے زرد پڑنے لگا۔
''ڈر گئے اتنی جلدی'' وہ اس کی حالت سے بے خبر نہیں تھی۔
تم..... تم تو مر گئی ہو ناں!'' وہ تھوک نگل کر بولا۔
وہ اس کے بہت پاس تھی۔
''محبت کرنے والے کب مرتے ہیں تم ہی کہتے تھے ناں۔'' اس کا لباس اب مکمل طور پر سفید ہو چکا تھا۔
وہ کفن اوڑھے ہوئے تھی۔
''ردا!'' اس کے گلے سے آواز نہیں نکلی۔
''محبت کرنے والے تو امر ہو جاتے ہیں اب تمہارے امر ہونے کا وقت آ گیا ہے فرحان! کیا تم ڈر رہے ہو'' وہ بالکل اس کے پاس آ چکی تھی باہر شور بڑھتا جا رہا تھا۔
''آؤ چلیں، تمہیں امر کرنے آئی ہوں ساتھ لینے۔ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ یہی چاہتے تھے ناں تم آنکھیں بند کر لو موت سے ڈرو نہیں یہ بہت خوب صورت ہے۔ زندگی سے بھی زیادہ جس میں کوئی ڈر خوف نہیں ہوتا پھر ہم دونوں کے ساتھ ہوں گے تو کیسا خوف، کیسا ڈر، ہے ناں۔''
''آوازیں کسی گیند سے ٹکرا ٹکرا فرحان کے کانوں تک آ رہی تھیں۔ دھاڑ سے دروازہ ٹوٹ کر اندر گرا تھا۔
بہت سارے قدم ایک دم سے اندر آئے تھے۔
اور ٹھٹھک کر رک گئے تھے۔
فرحان فرش پر اوندھا پڑا تھا۔
اس کے سر کے پاس خون کا ننھا سا تالاب تھا جس میں اس کا چہرہ ڈوبا ہوا تھا۔
اس کی کھلی آنکھوں میں خوف اور دہشت تھی۔
کسی نے جھک کر اس کی کلائی پکڑ کر نبض کو چھوا، کلائی برف کی طرح سرد تھی۔
اس نے کلائی چھوڑ دی۔
''اسے مرے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے شاید گھنٹہ۔''

جھکنے والے نے کھڑے ہو کر کہا۔
کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔
''ہو سکتا ہے اسے کسی نے قتل کیا ہو۔'' ایک دوسری آواز ابھری۔
فلیٹ کا سرسری سے جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے یہاں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔''
''فائرنگ پر کیا گیا ہے تو یہ صاف خودکشی ہے۔'' اندر آتا فوادو ہیں رک گیا۔ اس کے سامنے فرحان کی لاش تھی۔

☆.☆☆

سوئم بھی ہو گیا ردا کا!
سونیا کی حالت بدستور ویسی تھی۔
اسے ہوش تو آ گیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں جیسے کسی کی بھی پہچان نہیں رہی تھی۔
زینب نے اس حال میں اسے بہت سنبھالا تھا اور سنبھالنے کو تو وہاں بہت کچھ تھا۔
طاہرہ بیگم کی حالت بھی دیکھی نہ جاتی تھی۔
آزر نے جیسے خود پر پہاڑ ٹوٹے دیکھا تھا۔ اب خود کو ریزہ ریزہ اکٹھا کر رہا تھا۔ رمشا کے آنسو نہ تھمتے تھے نہ سوکھتے تھے۔
منصور ان سب کو سنبھالنے کی کوشش کرتا اور پھر جیسے تھک کر الگ تھلگ ہو جاتا۔
اس سارے بکھیڑے کے دوران زینب نے بھولے سے بھی اس سے بات کی تھی نہ اس کی طرف دیکھا تھا۔
''شاید متواتر غم اور مصیبتیں بھی انسان کو پتھر بنا دیتی ہیں۔''
زینب کو یوں دیکھ کر منصور نے کئی بار دل میں سوچا۔ زریں کو بھی اس سانحے کا بہت صدمہ تھا۔
مگر اس کی پرورش اس معاشرے میں ہوئی تھی جہاں غم کا سوگ بہت دنوں تک منانے کا رواج نہیں سو وہ بھی کچھ اکتاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔
سلیمان نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔
اس سارے میں صرف شائستہ قدرے مطمئن تھیں۔
انہوں نے خدانخواستہ کسی کو قتل تو نہیں کیا تھا جو انہیں پچھتاوا یا صدمہ ہوتا۔
بلکہ وہ ایک طرح سے خوش تھیں کہ خدا نے اس گناہگار لڑکی کو ایک ''عزت دار'' موت سے نوازا تھا۔
رہی بات سلیمان کی تو ظاہر ہے اس کی انوالمنٹ تو ہو چکی تھی کچھ دن لگیں گے اس کے دل کو سنبھلنے میں۔
اتنا انتظار تو شائستہ کر ہی سکتی تھیں۔
کم از کم انہوں نے اپنی 'نسل' کو تو 'داغدار' ہونے سے بچا لیا۔ وہ سکون سے کھانا کھانے کے بعد کافی پی رہی تھیں۔
ان کا ارادہ ابھی شام میں سلیمان کو لے کر باہر نکلنے کا تھا ویسے تو دنیاداری نبھانے کو انہیں روز ہی ردا کے گھر جانا پڑتا تھا جہاں تعزیت کرنے والوں کا رش لگا ہوتا تھا لیکن آج انہوں نے سلیمان کو وہاں نہ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔
وہ اپنی بیماری کا بہانا کر کے اسے پہلے ڈاکٹر کی طرف لے کر جائیں گی پھر بھوک کا شور مچا کر دونوں ہوٹل میں ڈنر کریں گے۔
سچ بات ہے اس طرح خود کو مصنوعی طور پر غم زدہ، دکھی ظاہر کرتے۔ وہ خود بیزار سی ہو گئی تھیں سو رات کے ڈنر کے لیے وہ اٹھ کر الماری سے اپنے لیے کپڑے نکالنے لگیں۔

☆☆☆

''کشف! مجھے تم سے کچھ کرنی ہے۔''
کشف جو منصور کے یوں اچانک آنے سے بھی حیران تھی اس کے سنجیدہ انداز پر چونک گئی۔

''میں آپ کے لیے چائے لے رک آتی ہوں بابا پھر کر لیجیے گا بات۔'' زینب ابھی سونیا کی طرف تھی۔
کشف دو دن رک واپس آ گئی تھی۔
صالحہ حیدر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں چیک اپ کے لیے۔
''چائے رہنے دو۔ میرا موڈ نہیں پینے کا تم یہاں آؤ۔''
وہ جو بات کشف سے پوچھنا چاہ رہا تھا اس کے لیے چائے پینے کا انتظار بھی محال لگ رہا تھا۔
پھر یہ بھی ہو سکتا تھا صالحہ نہ آ جائیں اور ساتھ میں وہ حیدر بھی!۔
''وہ حیدر جس سے سالوں پہلے بھی منصور کو صرف نفرت اور بیزاری ہی ہوتی تھی۔
زینب ذرا جو حیدر کی طرف ملتفت ہوتی تو منصور کئی کئی دنوں کے لیے اس سے روٹھ جاتا تھا۔
اس کے نزدیک زینب، حیدر کی آنکھوں میں وہ نہیں پڑھ سکی جو منصور پڑھ سکتا تھا اس کے احساسات جو زینب کے لیے تھے!
منصور کو آج بھی حیدر سے وہی نفرت وہی حسد تھا!
اور پھر بھی اتنے سال میں نے زینب کو چھوڑے رکھا۔ اس لسوڑے نے کون سا اس کا پیچھا چھوڑا ہوگا۔
وہ نفرت سے دل میں سوچ کر رہ گیا۔
''جی بابا..... کیا پوچھنا ہے آپ کو۔'' وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔
منصور اپنی گہری سوچ سے بمشکل باہر نکلا اور بے اختیار مسکرا اٹھا۔
کشف کے سادہ و معصوم چہرے پر جو مدحت تھی وہ کسی کے بھی دل میں نرم جذبہ ابھار سکتی تھی۔
اس کا چہرہ یک لخت تناؤ کا شکار ہو گیا۔
''موحد تم سے کیا چاہتا ہے؟'' منصور کا سوال اتنا اچانک تھا جس کے لیے کشف بالکل بھی تیار نہیں تھی۔
اور نہ اسے توقع تھی منصور اس سے ڈائریکٹ ہی یہ سوال کر ڈالے گا وہ کچھ پزل سی ہو گئی۔
''بابا!'' وہ کچھ بول نہ پائی۔
''دو تین بار میں تمہیں اس کے نزدیک..... آئی مین اسے تمہارے نزدیک ہوتے دیکھ چکا ہوں جو مجھے پسند نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس پر کشف چونک گئی۔
کشف کے چہرے پر ناگواری سی ابھری تھی۔
اگر وہ اتنے عرصے کے بعد لوٹ آنے کے بعد ایک باپ ہونے کا حقیقی استعمال کرنا چاہتا تھا تو یہی 'حق' کشف کے پاس بھی تھا۔
''آپ کو کیوں پسند نہیں بابا؟''
منصور کو کشف سے اس جواب کی توقع بالکل بھی نہیں تھی۔
''کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں۔ تم نہیں جانتی وہ بالکل بھی ٹھیک شخص نہیں ہے۔'' وہ عجلت اور غصے میں بول گیا۔ کشف اس کو دیکھ کر رہ گئی۔
''میں سمجھی نہیں بابا۔'' وہ کچھ دل گرفتہ سی ہو گئی۔
جس بات کا خوف تھا وہ سامنے آ رہا تھا۔
''اس میں ناسمجھ میں آنے والی کیا بات ہے کیا تمہیں مجھ پر، میری بات پر بھروسا نہیں جو تم مجھ سے سوال کرو گی۔'' اس کا لہجہ اونچا بھی تھا اور ترش بھی!
کشف نے ہونٹ بھینچ لیے۔

شاید وہ خود کو کچھ سخت بولنے سے روکنا چاہ رہی تھی۔

''بابا آپ شاید کسی وجہ سے موحد سے ناراض ہیں تو ایک ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ انہوں نے میری اور آنی کی بہت ہیلپ کی ہے آئی مین۔'' وہ رک رک کر نرمی سے بتانے لگی۔

''تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو کشف وہ جیسا نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے بالکل بھی بہروپیا ہے وہ۔'' غصے اور نفرت میں اس کی آواز اور بھی بلند ہوگئی۔

''وہ آپ کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں بابا!'' جانے کیسے کشف کے منہ سے پھسل گیا۔

''کیا بکواس کی ہے اس نے میرے بارے میں، بولو بتاؤ میں بھی تو سنوں ذرا مجھ سے نفرت اور دشمنی میں وہ کتنا آگے نکل گیا ہے بولو۔'' منصور غصہ میں کھڑا ہوگیا۔

''یہی وقت ہے جب ہر بات کا فیصلہ ہوسکتا ہے آر پار مجھے یہ رسک لینا پڑے گا۔'' منصور کا غصہ اس کی کیفیت کشف کو روک رہی تھی مزید کچھ بھی بولنے سے۔

مگر اسے لگا اس نے یہ وقت کھودیا تو شاید بعد میں حالات مزید بگڑ جائیں۔

''موحد کا خیال ہے کہ آپ نے ان کے فادر کا مرڈر کیا ہے اور ان کی ماں کی دولت ہتھیانے کے لیے ان سے شادی......'' وہ رک کر بڑی مشکل سے کہنے لگی کہ منصور غصے میں جیسے آپے سے باہر ہوگیا۔

وہ ہاتھ اٹھا کر کشف کو تھپڑ مارنے لگا جب پیچھے سے آکر زینب نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔

''میر منصور! میں نے اپنی بیٹی کو کبھی پھول کی چھڑی نہیں ماری تم تھپڑ کیسے مار سکتے ہو اسے۔''

اور منصور کو یوں لگا جیسے فضا میں اٹکا اس کا ہاتھ پتھر کا ہو چکا ہے۔

زینب اس سے یوں بات کرے گی یہ تو وہ مر کر دوسرا جنم بھی لے آتا تو یقین نہیں کرتا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے جارہا تھا۔

وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر کشف کو لے کر تیزی سے اندر چلی بھی گئی اور منصور اس طرح پتھر بنا وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

آزر کسی بت کی طرح سونیا کے پاس بیٹھا تھا۔

رمشا سونیا کو سوپ کے دو تین چمچ بضد اصرار پلا سکی تھی۔

اب پیالا وہیں رکھ کر ماں کے پیروں کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ آزر نے رمشا کو روتے دیکھا۔

اسے یوں لگا جیسے ردا رو رہی ہے۔

''بابا...... میرا یقین کریں میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس کی سہمی ڈری آواز آزر کے کانوں میں گونجی۔

''میری بیٹی، میری جان! بابا نے کب کہا تھا کہ تم مر کر دکھاؤ گی تو میں ظالم تمہارا یقین کروں گا۔'' وہ دل میں سسکی لے کر رہ گیا۔

سونیا کی حالت سب کو نظر آرہی تھی۔

لیکن جو دیوار آزر کے دل میں ڈھے گئی تھی اس کا ملبہ کسی کو نظر نہیں آرہا تھا جس کے نیچے اس کا وجود دبا جارہا تھا۔

آزر آپ کو یاد ہے ایک بار ردا کو بخار ہوگیا تھا اتنا کہ اترتا ہی نہیں تھا۔ یاد ہے ناں۔''

سونیا کا دماغ جیسے اب صرف پیچھے کی طرف سفر کرنے کے قابل رہ گیا تھا۔ وہ پچھلی باتوں کو بس سوچتی رہتی تھی۔

''ہوں۔'' آزر بے دھیان سا تھا۔

''اور ڈاکٹر نے کہا تھا آپ کی بیٹی کا دل بڑا کمزور ہے اس کا آپ نے ساری زندگی بڑا خیال رکھنا ہے کبھی اسے کوئی بڑا دکھ رنج نہ ملے مگر ڈاکٹر نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ اس کا دل اتنا کمزور ہے کہ عین اپنی شادی والے دن

وہ سب سے روٹھ کر سرخ اوڑھنی اوڑھ کر سفید کفن پہن لے گی۔'' وہ آزر کے ہاتھ پکڑ کر کہے جا رہی تھی۔
آزر نے غم کی شدت دبانے کے لیے ہونٹ بھینچ لیے۔
''نہیں بتایا تھا ناں ڈاکٹر نے۔ یہ ایسے بتانا چاہیے تھا آزر!'' وہ اب اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔
''صبر کرو سونیا! وہ اتنی ہی لکھ کر آئی تھی۔'' وہ بمشکل خود کو اس کو سنبھالتا کہہ پایا۔
''جھوٹ، اس کی تو لمبی تھی آپ کی ضد اور میری جھوٹی ممتا نے اس کی عمر کو کم کر دیا۔ چوبیس سال کی عمر میں بھی کوئی قبر میں جاتا ہے بھلا۔ آپ نے کیا سوچ کر اسے لحد میں اتارا آزر! آپ اتنے سنگدل کیسے ہو سکتے ہیں۔'' وہ اب رو رہی تھی۔
''مما پلیز آپ کی طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔'' رمشا اسے سنبھالنے لگی۔ حمزہ کمرے کے کونے میں بیٹھا تھا۔
وہ بھی اٹھ کر ماں کو بانہوں میں لے کر پیار کرنے لگا۔
آنسو تو ان تین چار دنوں میں اس کے بھی نہیں رکے تھے۔
آزر کا فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔
اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے پاکٹ سے فون نکال کر دیکھا۔
نمبر دیکھ کر وہ چند لمحے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔
پھر کچھ فیصلہ کر کے اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے فون کان سے لگایا۔
''جی فرمایئے۔'' اس کا لہجہ ترش اور کھردار تھا۔
وہ ماتھے پر بل ڈالے کچھ سن رہا تھا۔
سونیا اس سے بے نیاز ردا کے سرخ دوپٹے کو گود میں لیے سینے سے چمٹائے جا رہی تھی۔
اتنے دنوں سے سب کے لاکھ کہنے پر بھی اس نے یہ دوپٹہ نہیں چھوڑا تھا۔
آزر نے گہرا سانس لے کر فون بند کر دیا۔
''مر گیا وہ مردود بھی، جس نے ہماری خوشیوں کو منوں مٹی تلے دبا دیا خودکشی کر لی اس شیطان فرحان نے۔'' آزر کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔
سونیا جیسے پتھر کی ہو گئی۔
پھر دوپٹے کو سینے سے بھینچ کر اونچا اونچا رونے لگی۔
''وہ وہاں بھی چلا گیا، وہ مردود وہاں بھی چلا گیا میری ردا کو تنگ کرے گا۔ ردا واپس آ جا میری بچی..... میں تجھے اپنے اندر چھپا لوں گی..... ساری دنیا سے بچا کر اپنے اندر چھپا لوں گی..... آ جا میرے پاس۔'' وہ دوپٹے کو چہرے سے لگائے اونچا اونچا روئے جا رہی تھی۔
اور وہ تینوں بے بسی سے اسے روتا دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

موحد وارڈ کا راؤنڈ لیتا اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔
''سسٹر پلیز ایک کپ کافی کو بھجوا دیں میرے آفس میں۔''
''جی ڈاکٹر صاحب!'' سسٹر کہہ کر دوسری طرف چلی گئی۔
وہ آفس میں داخل ہوا اور بے اختیار چونک گیا۔
منصور اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''کیا زہر اگلا ہے تم نے کشف کے دل میں میرے خلاف۔'' وہ ایک دم سے غصے میں آ کر اس کا گریبان

پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے چیخا۔
''اپنے حواسوں میں رہیں مسٹر! یہ میرا آفس ہے اور یہاں کیمرے لگے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں سے نکل کر حوالات کی سیر کرنی پڑ جائے آپ کو۔'' وہ اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے تنفر سے بولا۔
''ویسے حوالات کی سیر بھی کون سی نئی بات ہوگی آپ جیسے کرمنل کے لیے۔'' اس کے لہجے میں نفرت تھی، تمسخر تھا۔
''میں تمہارا منہ نوچ لوں گا۔'' وہ پھر سے اشتعال میں آ گیا۔
''ہمت ہے، آپ میں اتنی۔ اور مسٹر منصور! مجھے وہ کمزور سا بچہ مت سمجھنا جس کو تم نے یتیم کیا اور اس کی ماں کو بھی چھین لیا۔''
وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غرایا۔
منصور کو لمحہ بھر کو پسینے سے آ گئے۔
بہت سالوں بعد اب آہستہ آہستہ تھکنے لگنے لگا تھا وہ جب بھی موحد کا سامنا کرتا ہے خود کو کمزور محسوس کرتا ہے۔ موحد کی آنکھوں میں اس کے لیے جو کھلا چیلنج ہوتا تھا وہ منصور کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتا تھا۔
وہ بے اختیار نظریں چرا کر رہ گیا۔
اس کی حالت دیکھ کر موحد کچھ سرد پڑ گیا۔
''کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟'' وہ بظاہر خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے فائلیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔
''میری اور میری بیٹی کی زندگی سے نکل جاؤ۔'' وہ جھک کر غصے میں بولا۔
''اوہ۔ اچھا کیا فرمائشی پروگرام ہے۔'' وہ اسی تمسخر سے بولا۔ ''یاد کریں بہت سال پہلے ایسی ہی درخواست، فریاد میں نے بھی آپ سے کی تھی کہ میری اور میری ماں کی زندگی سے نکل جائیں۔ نکلے تھے؟''
منصور کچھ بول نہیں سکا۔
وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
''میں بہت کیلکولیٹڈ نہیں ہوں لیکن زندگی کے کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں حساب کتاب کے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا۔'' منصور کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔
''اب اس حساب کتاب کا وقت آ گیا ہے۔''
وہ پوری طرح محاذ کھول چکا تھا۔
منصور کا خون کھول کر رہ گیا۔
لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔
اسے بات کرنی تھی موحد سے اور یہ معاملہ بات چیت سے ہی طے ہو سکتا تھا۔
دل میں فیصلہ کر کے وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
موحد نے اسے یوں بیٹھتے دیکھ کر کچھ حیرانی سے دیکھا۔
''ٹھیک ہے، میں تمہاری اور تمہاری ماں کی زندگی سے نکل جاتا ہوں۔ تم میری اور میری بیٹی کی زندگی سے نکل جاؤ۔ ہم مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے ایک دوسرے کی طرف۔''
وہ رک رک کر اسے آفر کرنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔
موحد نے حیران نظروں سے اسے دیکھا جن میں بے یقینی تھی۔
دوسرے لمحے وہ ہنسنے لگا۔ منصور کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
''میں نے تمہیں کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ وہ زور زور سے سر ہلانے لگا۔

''اتنے سالوں بعد اتنی شان دار آفر..... کیا یہ اس صدی کا سب سے بڑا مذاق نہیں مسٹر منصور۔'' وہ جیسے ہنسی دبا کر بولا۔

''یہ مذاق نہیں، میں سنجیدہ ہوں۔''

''میں بھی سنجیدہ ہوں۔'' وہ جواباً بولا۔

''تو جو میں نے کہا، اسے مان لینے میں ہی ہم دونوں کی عافیت ہے۔'' وہ مفاہمتی انداز میں بولا۔

''یہ آپ سے کس نے کہا، مجھے آپ سے یا کسی ایکس وائے زیڈ سے عافیت کی طلب ہے۔ بہت سال ہوئے میں نے اس پیدا کرنے والے سے عافیت مانگنا شروع کر دی تھی جو ہماری ہر حالت سے باخبر ہے۔'' اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا، منصور بس اسے دیکھتا رہ گیا۔

''اب یہ معاملہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے، اسے کب شروع کرنا ہے اور کب ختم کرنا ہے۔ اس کا فیصلہ اب میں کروں گا۔ آپ کا وقت گزر چکا مسٹر میر منصور!''

وہ حقارت سے اسے دیکھتا اپنا فون اٹھا کر کمرے سے نکل گیا اور منصور یوں بیٹھا تھا جیسے اب کبھی یہاں سے اٹھ ہی نہیں پائے گا۔

☆☆☆

بلال فون ہاتھ میں لیے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایما کی کال تھی۔

وہ اس سے ملنا چاہتی تھی کہ دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈیویلپ ہو سکے۔ بلال کی ذہنی حالت بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔

یہ ٹھیک تھا، اسے کشف اچھی لگتی تھی بلکہ وہ پسند کرتا تھا اسے اور ثمینہ کی ضد نے بلال کو بھی ضدی بنا دیا تھا۔

''مگر جو کچھ کشف نے اس کے ساتھ کیا، اس کے بعد اس کا دل جیسے اس ''پسند'' اور سوکالڈ محبت سے بھی منکر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اس دوران ایمان بیچ میں آ گئی۔

شروع میں وہ ثمینہ کی وجہ سے اسے بری لگتی تھی۔ وہ اسے نظر انداز بھی کرتا رہا۔ مگر کچھ تھا ایسا اس میں جو بلال کو اس کی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

اور اگر ایسا ہو گیا تو ثمینہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا اور وہ ثمینہ کو ایسی کوئی خوشی نہیں دینا چاہتا تھا۔

''کیا انہوں نے میری خوشی کا خیال رکھا جو میں انہیں خوشیاں دوں۔''

اس کا دل بغاوت پر اترا ہوا تھا۔

اس کے فون پر میسج ٹون بجی۔

ایما اس سے ملنے کی جگہ کا پوچھ رہی تھی۔

''سوری، میں نہیں آ سکتا۔ ان فیکٹ میں ملنا بھی نہیں چاہتا۔ سوری اگین۔'' اس نے فیصلہ کر کے ٹائپ کرتے ہوئے میسج بھیج دیا۔

وہ اپنی ماں کی کوئی خوشی کبھی پوری نہیں کرے گا۔

اس کے دل کو یہ سوچ کر کمینی سی خوشی ملی تھی۔

☆☆☆

ایما کی آنکھوں میں آنسو زریں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیے تھے۔ ایما ماں کو دیکھ کر اٹھ کر دوسری طرف رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

''تم ابھی تک رو رہی ہو ردا کے لیے۔'' وہ اس کے پاس آ کر آہستگی سے بولی۔
ایما نے یوں ہی سر ہلا دیا۔
زریں پلٹتے ہوئے رک گئی۔
اس نے بیٹی کے ہاتھ سے فون لے کر دیکھنا شروع کر دیا۔
وہ بے بسی سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔
زریں نے گہرا سانس لے کر فون ایما کو واپس کر دیا۔
''شاید وہ تمہیں پسند نہ کرتا ہو۔'' کچھ دیر بعد بیٹی کو سمجھانے کی نیت سے زریں نے کہا۔
''ایسا نہیں ہے مام! اس کی آنکھیں کچھ اور کہتی ہیں۔'' وہ تڑپ کر بولی تھی۔
''ہر بار آنکھیں سچ بھی تو نہیں بولتیں۔'' زریں پھیکے پن سے بولی۔
ایک پرانا درد دل میں جاگا تھا۔
''میں اسے بری نہیں لگتی مام!'' وہ سر جھکا کر بولی۔
''کاش ماں باپ کے بس میں ہوتا دنیا جہاں کی خوشیاں لا کر اولاد کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔''
وہ دکھی سی ہو گئی۔
سونیا اور آزر نے کیا سوچا نہیں ہو گا اور انجام.....
''اگر ایما نے بھی جذباتی پن میں کوئی ایسا قدم اٹھا لیا، یہ تو ہے بھی بہت پاگل۔'' ایما کے اترے چہرے کو دیکھ کر بے اختیار زریں پریشان سی ہوئی تھی۔
''ابھی یہاں بھی حالات ایسے نہیں ہیں ایما کہ کوئی ایسی بات کی جا سکے یا نہ جا سکے۔ تھوڑا ٹائم دو خود کو بھی، بلال کو بھی۔ ہو سکتا ہے، وہ خود بھی تمہاری طرف ہاتھ بڑھا دے۔''
وہ بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔
بلال اسے بھی برا نہیں لگا تھا۔ شروع میں تو منصور کی ضد میں اس کے تمام ہی رشتہ دار زریں کو بہت برے، مطلبی اور خود غرض لگے تھے مگر ردا کے واقعے کے بعد اس نے لوگوں کے رویوں کو خود سے پرکھنا شروع کیا تو اسے بہت کچھ الگ سا دکھ رہا تھا۔
اگر ایما کی شادی بلال سے ہو جاتی ہے اور یہ دونوں میرے ساتھ واپس کینیڈا چلے جاتے ہیں پھر تو مجھے بھی منصور کے ساتھ کی ضرورت نہیں۔ بھلے موحد بھی اپنے فیصلے خود کرتا رہے۔
وہ خود غرضی سے سوچنے لگی تھی۔
''بلال ناس ہے، البتہ اس کی ماں بہت ان ڈیسنٹ سی ہے۔'' وہ بڑبڑانے والے انداز میں خود کلامی کر رہی تھی۔
''وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔'' ایمان مایوسی سے بولی۔
''تھوڑا ٹائم دو اسے بھی اور خود کو بھی۔ پھر یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔'' وہ بے زار تھی۔ ''تمہارے بابا کو تو اللہ نے موقع دیا ہے، ہم سے جان چھڑانے کا۔''
منصور دن کا بیشتر حصہ باہر ہی کہیں گزارتا تھا۔
واپس آتا بھی تو زیادہ وقت سونیا اور ارس کی فیملی کے ساتھ گزرتا۔ اسے سوچوں میں گم دیکھ کر ایمان اٹھ کر باہر جانے لگی۔
''رمشا کے پاس جا رہی ہوں۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے، زبردستی کچھ کھلاؤ تو ایک دو لقمے لیتی ہے۔''
ایما پر بہت اثر تھا ردا کی موت کا اور اب رمشا کی حالت اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔
''اتنی ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح تو تم خود بیمار پڑ جاؤ گی یوں دوسروں کے غم کھا کر۔''

زریں اپنی طبیعت کے عین مطابق اسے ٹوکنے لگی اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔
''مجھے آج منصور سے بات کرنا ہی ہوگی۔ ایسا کب تک چلے گا' ہم یوں ہی ادھر پڑے رہیں۔'' وہ بے زاری سے اٹھ کر ایما کے پیچھے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''حق..... کس حق کی بات کرتے ہو۔'' زینب کے لہجے میں تلخی گھلی تھی۔
منصور اسے دیکھ کر رہ گیا۔
''تمہاری خفگی کس طرح دور ہوگی زینب؟'' وہ نرم پڑ کر بولا۔
زینب نے طنزیہ نظر اس پر ڈالی۔
''تمہیں کب سے میری خفگی کی پروا ہونے لگی۔''
''ہمیشہ سے تھی اور ہے۔'' وہ زور دے کر بولا۔
زینب نے ہونٹ سختی سے بند کر لیے۔ شاید وہ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''بہر حال کشف کے معاملے میں تمہیں کوئی حق حاصل نہیں کہ تم اس سے یوں سختی سے بات کرو یا.....'' وہ قطعی لہجے میں کہہ رہی تھی۔
''یا..... کیا.....'' منصور آج شاید تہیہ کر کے آیا تھا، بات کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لیے۔
''یا سے آگے جو بھی ہے، تم جانتے ہو اور منصور.....!'' وہ اس کی طرف پلٹی۔ کپڑوں کا ڈھیر تھا جو وہ استری کر چکی تھی۔ ''اگر تم نہیں بھی جانتے تو پلیز جاننے کی کوشش نہیں کرو۔'' آخر میں اس کا لہجہ کھردرا تھا۔
منصور اسے گھور کر رہ گیا۔
''تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو زینب! کہ میں تمہاری زندگی میں کوئی بھی اہمیت نہیں رکھتا۔'' وہ غصے میں آ گیا۔
''تم ٹھیک نتیجے پر پہنچے اگرچہ دیر سے..... مگر زیادہ دیر نہیں ہوئی اور یہ بات تم جتنی جلدی سمجھ لو، ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا بلکہ تینوں۔'' وہ آخر میں جتا کر بولی۔
منصور کی آنکھوں میں گلا تھا۔
''میں جانتا ہوں، تم آج جس طرح مجھ سے بی ہیو کر رہی ہو۔ اس کی وجہ میں خود ہوں۔ میں نے تمہیں، اپنے گھر والوں کو بہت دکھ دیے ہیں مگر اب میں ہی ان کو دور کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ رک کر قطعی لہجے میں بولا۔
''زینب! میں چاہتا ہوں تم جلد سے جلد کوئی بھی اچھا رشتہ دیکھ کر کشف کی شادی کا فیصلہ کر لو۔''
اس نے اتنی اچانک بات کی کہ باہر کھڑی کشف بھی چونک گئی۔
''اس بات کا مطلب؟'' وہ کڑوے پن سے بولی۔
''پتا نہیں، تم میری بات کا کیا مطلب لو مگر موحد کشف کے قریب ہو رہا ہے۔''
''تمہارا بیٹا۔'' وہ طنز سے بولی۔
''وہ کیا ہے، میں جانتا ہوں۔ اس سے کشف کو بچانا چاہتا ہوں اس لیے۔''
''میں تم سے، تمہارے بیٹے سے خود کو اپنی بیٹی کو بچانا چاہتی ہوں منصور! تم واپس چلے جاؤ۔ اگر تمہیں ہمارا خیال ہے تو پلیز، تم یہاں سے چلے جاؤ۔''
وہ ہاتھ جوڑ کر بولی اور کشف ساکت کھڑی رہ گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ اِن شاء اللہ)

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

قیمت -/150 روپے

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361, 32735021

ماریہ نواز

سفر

مکمل ناول

گزشتہ قسط کا خلاصہ

گھر میں داخل ہوتے ہی باپ کی چنگھاڑتی آواز اس کی سماعتوں میں زہر گھول دیتی تھی اور پہلی بار وہ اپنے باپ کے سامنے چیخ اٹھا۔

عائشہ اپنی تائی کے گھر دادی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی ماں اس کے باپ سے طلاق لے کر اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو باپ دل برداشتہ ہو کر پردیس چلا جاتا ہے۔ وہ تائی کی ہر بات مانتی ہے۔ پھر ایک دن دادی راہ عدم سدھارتی ہیں۔ وہ باپ کے انتظار میں ہوتی ہے مگر ایک دن اسے اپنے باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے۔ وہ پڑھائی میں زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تایا ابو شایان کو اسے ٹیوشن پڑھانے کا کہتے ہیں، شایان اسے پسند کرنے لگتا ہے۔

حیدر علی اپنی بیوی سے پرانے تلخ رویوں کی معافی مانگتے ہیں مگر وہ ان سے نظریں پھیر لیتی ہیں۔ ان کے بیٹے کی دنیا محدود ہے۔ شاہ زین کو رات تین بجے نرس اٹھاتی ہے مگر ہاسپٹل جاتے ہوئے اس کی ماں دنیا سے چلی جاتی ہے۔ وہ باپ کا گھر چھوڑ کر ہاسٹل شفٹ ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ اسے ہاسٹل کا سب سے اعلا کمرہ دیتا ہے۔ جہاں اسے اپنا روم میٹ زہر لگتا ہے۔

شایان عائشہ سے شادی کے لیے ماں باپ پر زور ڈالتا ہے۔ تایا کے سمجھانے پر تائی امی مان جاتی ہیں اور ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ شایان کے دل سے عائشہ اتر جاتی ہے اور وہ گھر والوں کو منگنی توڑنے کا کہہ دیتا ہے۔ وہ تایا تائی کی اپنی باپ سے کی گئی باتیں سن لیتی ہے۔ پھپھو اپنے نکھٹو بیٹے کا رشتہ اس کے لیے لے کر آتی ہیں تو وہ اپنے باپ سے کہہ کر انکار کر دیتی اور پہلی دفعہ باپ سے ہاسٹل میں رہنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے اور کراچی کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتی ہے۔ جہاں اس کی دوستی شیریں سے ہو جاتی ہے مگر بی بی اے کے پہلے سمسٹر میں فیل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے باپ سے انٹیریر ڈیزائننگ کرنے کی خواہش بیان کرتی ہے مگر وہ نہیں مانتے تو وہ ان کے ساتھ رہنے کا مطالبہ کرتی ہے مگر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ اپنے اخراجات پورا کرنے کے لیے وہ ریسپشنسٹ جاب کر لیتی ہے جہاں منیجر اس پر گندی نظر رکھتا ہے تو وہ جاب چھوڑ دیتی ہے اور شیریں کے آئیڈیا دینے پر سلائی کا کام شروع کر دیتی ہے۔ مگر پیسوں کی کمی کے باعث وہ ایک گھر میں کیٹرنگ کا کام شروع کر دیتی ہے۔

شاہ زین انگلینڈ چلا جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات سیما سے ہوتی ہے۔ عائشہ کی دوستی یونیورسٹی کی ایک ماڈرن لڑکی نتاشا سے ہوتی ہے جو اسے ایک دن بتاتی ہے کہ وہ بیوہ ہے۔ شاہ زین لندن میں ہی جاب کر لیتا ہے اور سیما سے شادی سے معذرت کر لیتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

''اچھی تھی۔ جب تک کریش نہیں کی تھی میں نے۔'' وہ بے زاری سے بولی تھی۔

''بس یار! کبھی کبھی تنگ آجاتی ہوں لوگوں کو تنگ کر کر کے بھی۔''

عائشہ ہاتھ میں پکڑی کتابیں رکھ کر اُس کی طرف آئی تھی۔ برابر میں بیٹھ کر اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''نتاشا دیکھو.....'' اس نے بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی تھی

''اگر آگے بڑھنا میرے بس میں ہوتا تو بڑھ چکی ہوتی میں۔ میں جو سوچتی ہوں، وہ میں سوچنا نہیں چاہتی۔ جو میں محسوس کرتی ہوں، وہ میں محسوس کرنا نہیں چاہتی۔ مگر نہ میں بھول سکتی ہوں۔ نہ معاف کر سکتی ہوں۔'' اُس کے لہجے میں غصے سے زیادہ شکستگی تھی۔

''معاف کرنا بہت مشکل ہے۔ اور بھول جانا تو شاید ناممکن۔'' عائشہ رسان سے بولی تھی۔

''مگر یہ غصہ یہ دکھ تمہاری زندگی کا فوکل پوائنٹ بن گیا ہے۔''

''تو کیا کروں، کیسے کوئی اور فوکس ڈھونڈ لوں؟'' وہ جھلائے ہوئے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''فوکس مت ڈھونڈو۔ ڈسٹریکشن ڈھونڈو۔ کوئی ایسی ڈسٹریکشن جو دن کے اختتام پر کوئی چھوٹی ہی سہی کسی خوشی، کسی کامیابی کا احساس دے سکے۔ کوئی مثبت خیال دے سکے تمہیں سوچنے کے لیے۔ کوئی ہابی، کوئی تعلیم، کوئی کاروبار، کوئی چیریٹی پروجیکٹ، کچھ بھی۔ ایسا جو تمہاری زندگی میں پازیٹو انرجی کے لیے ایک روزن کھول سکے۔''

نتاشا کچھ نہیں بولی تھی۔ بس ایک گہری سانس لے کر سر گھٹنوں پر رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

آفس میں اُن کے پہلے پروجیکٹ کا فائنل پلان بالآخر اپروو ہو چکا تھا۔ زیادہ عائشہ ہی کو ماننا پڑا تھا، مگر کچھ نہ کچھ اُس نے منوا بھی لیا تھا۔

کرن آج آفس نہیں آئی تھی۔ اس وقت

عموماً وہ اور کرن ٹی بریک لیتے تھے، کبھی نعمان اور مسٹر آرکیٹکٹ بھی ساتھ ہوتے، مگر زیادہ تر کرن ہی اُن دونوں کے لیے چائے لے آتی تھی۔ اُسے طلب تو محسوس ہو رہی تھی مگر اکیلے جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا اور کام بھی آج کچھ زیادہ تھا۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ مسٹر آرکیٹکٹ آن ٹپکے، وہ بھی ایک عدد چائے کی پیالی کے ساتھ۔

''چائے؟'' شہریار نے پیالی اُس کی طرف بڑھائی۔

''آج کرن نہیں آئی تو میں نے کہا، میں اُس کی ڈیوٹی کرلوں۔''

''شکریہ۔'' عائشہ نے اُس کی اِس درجے خوش اخلاقی پر دل میں حیران ہوتے ہوئے پیالی تھام لی تھی۔

''مس عائشہ! میں تھوڑا میٹریوریل ہوں۔'' وہ سر کھجاتے ہوئے بولا تھا۔

''مگر ایک نئے آنے والے کو اپنے آئیڈیاز کے لیے کھڑے ہوتے دیکھ کر اچھا لگا۔ جو لوگ اپنے کام کے لیے پیشنیٹ ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ کام کرنا عموماً ایک اچھا تجربہ ہوتا ہے۔ لکنگ فارورڈ ٹو اِٹ۔'' وہ کہہ کر پلٹ گیا تھا۔

''ویسے اتنا برا بھی نہیں ہے۔'' عائشہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ آفس میں تھی جب اُسے شیریں کی کال آئی تھی۔

''کہاں ہو یار؟ مجھے ملنا ہے بات کرنی ہے ایک ضروری۔'' اُس کی آواز میں گھبراہٹ بھی تھی مگر ساتھ جوش بھی۔

''آفس میں ہوں۔ کیا ہوا خیریت ہے؟'' عائشہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ ایسے نہیں فیس ٹو فیس۔ بتاؤ کہاں مل سکتی ہو فوراً؟''

عائشہ نے گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔

''اچھا ہاسٹل پہنچو، میں آرہی ہوں۔''

وہ ہاسٹل پہنچی تو شیریں پہلے سے موجود تھی۔

''یار فرحان رشتہ لانا چاہ رہا ہے۔'' عائشہ کا منہ حیرت اور پریشانی سے کھلا رہ گیا تھا۔

''مگر دس دن رہ گئے ہیں تمہاری شادی میں۔ کارڈ تک بٹ چکے ہیں۔''

''یہی تو مسئلہ ہے یار کیا کروں؟'' وہ سر تھام کر بولی تھی۔ عائشہ کے پاس اُس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ ''کیسے بات کروں اب امی ابو سے؟''

''پہلے یہ تو سوچ لو کہ بات کرنی بھی چاہیے یا نہیں؟ اِن سالوں میں وہ کتنی دفعہ تمہیں دھوکا دے چکا ہے۔ کتنے جھوٹ بول چکا ہے۔''

''یار! وہ کمٹمنٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی ایشو تھا ہمارے بیچ۔ اب وہ شادی کرنا چاہتا ہے تو اِس سے بڑھ کر کیا کمٹ منٹ ہو سکتی ہے۔'' وہ ایک بار پھر سے محبت پر ایمان لا چکی تھی۔

''سوچ لو، شیریں۔ ایک بار پھر۔''

''یار مجھے پتا ہے۔ میں اُس کے علاوہ میں کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ لوگوں کی باتوں سے ڈر کر اپنی محبت سے، اپنی خوشیوں سے کیسے دست بردار ہو جاؤں۔'' وہ گویا فیصلہ کر چکی تھی۔

پھر اُس نے اپنے دل کے علاوہ کسی کی نہیں سنی تھی۔ آج اُس کی اور فرحان کی شادی تھی اُسی مقررہ تاریخ پر۔

کچھ لوگ دبی دبی آواز میں تبصرے کر رہے تھے۔ کچھ معنی خیز نظریں اِدھر اُدھر گھما رہے تھے۔ کچھ شقی القلب تو بہانگ دہل سوال کر رہے تھے کہ راتوں رات دولہا کیسے بدلا۔ شیریں کے گھر والے شرمندہ شرمندہ سے نظریں چراتے پھر رہے تھے۔ مگر شیریں کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی، عائشہ نے اُس کے ہمیشہ قائم رہنے کی بڑے دل سے دعا کی تھی۔

☆☆☆

نتاشا اپنی کافی شاپ شروع کر رہی تھی۔ ''یونو دو ہی چیزوں میں، میں اچھی ہوں فلرٹنگ اور بیکنگ۔ فلرٹنگ سے اب میں کافی بور ہو چکی ہوں تو

سوچ رہی ہو بیکنگ کو فل ٹائم پر سو کروں۔'' وہ اپنے مخصوص لاابالی انداز میں بولی تھی۔

''آپ کی خدمات بھی درکار ہوں گی۔ شاپ ڈیزائن کرنے کے لیے۔''

''جو حکم۔'' عائشہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔ نتاشا کے اس فیصلے سے اُسے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

شیریں کے جانے کے بعد عائشہ کا بھی ہاسٹل میں دل نہیں لگا تھا۔ وہ رہنے کے لیے کوئی چھوٹا موٹا گھر ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر اکثر لوگ اکیلی لڑکی کو گھر کرائے پر دیتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ یہ آخری گھر اُسے بڑا پسند آیا تھا۔ یہ چھوٹی سی اسٹکی تھی۔ مگر اچھی بنی ہوئی۔ کرایہ بھی مناسب تھا۔ مالک مکان ایک بیوہ خاتون تھیں جو اپنے تین بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑا بیٹا میڈیکل کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ چھوٹا بیٹا اور بیٹی اے لیولز کر رہے تھے۔ عائشہ کو تو ہر حساب سے سوٹ کرتا تھا یہ گھر۔ مگر خاتون کچھ تذبذب میں تھیں۔

''صرف قریبی مرد رشتے دار، باپ، بھائی، چچا وغیرہ آسکتے ہیں۔ وہ بھی پہلے بتانا ہوگا کہ کون آرہا ہے اور کب تک رہے گا۔'' شرط رکھی گئی۔

''جی آپ فکر نہ کریں۔ کوئی نہیں آئے گا۔'' عائشہ نے تسلی دی۔

''کیوں..... کیوں نہیں آئے گا۔'' پہلے آنا مشروط تھا اب نہ آنا مشکوک۔

''دراصل میرے والد بحرین میں ہوتے ہیں۔ کم کم آتے ہیں۔ بھائی کوئی ہے نہیں۔'' اُس نے کچھ جھوٹی سچی وضاحت دی تھی۔

''اچھا جو بھی ہے، یہاں کچھ مشکوک نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹی والا گھر ہے۔'' اب وہ سیدھی بات پر آئی تھیں۔

''آنٹی آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' عائشہ نے تسلی کرائی تھی۔ انٹرویو بالآخر کامیاب ہوا تھا اور مکان اُس کا۔ شیریں تو اپنی شادی کی شاپنگ میں مصروف تھی۔ مگر نتاشا نے اُس کا پورا پورا ساتھ دیا تھا شفٹنگ میں۔

کچھ پرانی کتابیں رکھتے ہوئے ایک پرچی اُن میں سے گری تھی۔ اُس نے اُٹھا کر دیکھا تو ایک نمبر لکھا تھا۔ اس کی ایک خالہ کا نمبر۔ اُس نے نجانے کیا سوچ کر کراچی آتے ہوئے یہ نمبر تائی امی کی ڈائریکٹری سے ڈھونڈ کر اپنے پاس نوٹ کر لیا تھا۔ شاید اس لیے، کہ سنا تھا اُس کی ماں بھی کراچی ہی میں رہتی تھی۔ اتنے سال اُسے نہ اس نمبر کا خیال آیا نہ کسی اور کا۔ مگر اب نظر سے گزرا تو اُس نے اُٹھا کر پرس میں ڈال دیا تھا۔

اگلے دن وہ تنگ سی گلی میں رکشے سے اُتری تھی۔ موبائل پر ایڈریس ایک بار پھر چیک کر کے ایک بوسیدہ حال سا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ گندمی رنگ، تیکھے نقوش، لاپروا سا انداز، ملگجا سا لباس۔

''جی؟'' منک کے پوچھا گیا تھا۔

''زینت بی بی کا گھر ہے یہ؟''

''جی، آپ کپڑوں کے لیے آئی ہیں؟''

عائشہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ جس پر اُس نے دروازے سے ہٹ کر اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

''آپ بیٹھیں، میں امی کو بلاتی ہوں۔'' وہ کہہ کر اندر بڑھ گئی تھی۔ عائشہ نے شکستہ سے در و دیوار کا جائزہ لیا تھا۔

''محبت کی جنت'' میں شاید صرف محبت ہی تھی۔

''اماں لوگ مرتے ہیں اس یونیورسٹی میں داخلے کے لیے۔ بس تم داخلے کے پیسے ابھی کہیں سے کر کے دے دو۔ آگے میں خود انتظام کر لوں گا۔'' اندر سے آتی ایک مردانہ آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''میں کہاں سے لاؤں۔ تمہارا باپ تو راشن کے پیسے پورے نہیں دیتا۔ سلائیاں کر کر کے تو گھر کا خرچ چلاتی ہوں۔ اپنے باپ سے ہی مانگو۔''

''ہنہ باپ سے..... اُس کے پاس لینے والیوں کی لائن ہے۔ ایزی لوڈ، ہوٹلوں میں کھانے، تحفے تحائف۔ ہمارے لیے کچھ بچے گا تو دے گا ناں۔ اور یونیورسٹی کے لیے تو وہ ویسے بھی نہ دے۔ چاہتا ہے کہ میں فل ٹائم دوکان پر بیٹھوں تاکہ جو دو چار گھنٹے بیٹھتا ہے وہ بھی نہ بیٹھے۔''

''میں کیا کروں؟ کیا کرسکتی ہوں؟'' لاچارگی سے پوچھا گیا تھا۔

''کاش پیدا نہ کیا ہوتا ہمیں یوں جانوروں سی زندگی دینے کے لیے۔'' وہ تن فن کرتا، اُس کی موجودگی سے بے نیاز باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے پیچھے وہ بھی چلی آئی۔ چپل گھسیٹتی، جگہ جگہ سے پھٹا ہوا جارجٹ کا دوپٹہ سر پر جمائی۔ وقت کی سختی نے عمر سے زیادہ جھریاں چہرے پر ڈال رکھی تھیں۔ سفید بالوں کو رنگے زمانے ہو چکے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی دفعہ اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ ایک عمر گزاری تھی اُس نے یہ سوچتے ہوئے کہ وہ لمحہ کیسا ہوگا۔ مگر اب جو یہ لمحہ آیا تھا تو دل خالی تھا کسی بھی جذبے سے۔ نہ محبت، نہ نفرت، نہ غصہ نہ شکوہ۔ بس دل میں کہیں کہیں تھوڑا سا ترس تھا جیسے کسی انجان بدحال شخص کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ عائشہ خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''السلام علیکم۔'' اُس نے خاموشی کو توڑا تھا۔

''وعلیکم السلام۔''

''جی، بیٹھیں۔'' اُس نے ایک شکستہ سی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ عائشہ بیٹھ گئی۔

''کپڑے دینے تھے آپ نے؟'' اُس کے لہجے میں اب کچھ تجسس تھا۔

''جی۔'' عائشہ اُس کے سوال پر چونکی تھی۔

''کہاں ہیں؟ ساتھ نہیں لائیں؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں میں بھول گئی۔''

''کوئی بات نہیں، اگلی بار لے آئیے گا۔ ہر طرح کا ڈیزائن بنا دیتی ہوں میں۔ سلائی بھی بہت مناسب۔''

عائشہ نے جواباً سر ہلایا تھا۔ باہر کا دروازہ پھر کھلا تھا۔ اِس بار اندر آنے والا ادھیڑ عمر کا مرد تھا۔ خضاب سے رنگے بال، چست قمیص میں نمایاں ہوتی توند۔ مگر سب سے ناگوار عائشہ کو وہ آنکھیں لگی تھیں جو اُسے بڑے سے دوپٹے میں بھی اپنا ایکسرے کرتی محسوس ہوئی تھیں۔

سلام عائشہ کو دیکھ کر کیا گیا تھا مگر جواب زینت نے دیا تھا۔ ''آپ اندر چلیں، میں پانی لاتی ہوں۔'' گویا اس نے بھی دیکھ لیا تھا یا شاید عادی تھی۔

''ہاں تو اندر ہی جا رہا ہوں، جاہل عورت۔'' وہ فوراً طیش میں آیا تھا اور بکتا جھکتا اندر چلا گیا تھا۔

تو یہ تھا ''محبت کی کہانی'' کا انجام۔ عائشہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ''میں چلتی ہوں۔''

''ٹھیک، پھر کب تک لائیں گی کپڑے؟''

''ہاں، دیکھتی ہوں۔۔ جلد ہی'' عائشہ ٹالنے کو بولی تھی۔

وہ اُس کے ساتھ چلتی دروازے تک آئی تھی۔

''میرا نام زینت ہے آپ کا؟''

''عائشہ نوید۔'' عائشہ نے ایک نظر اُس کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالی تھی اور اُسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر آگے بڑھ گئی تھی۔

بہت سنا تھا اُس نے ماں اور اولاد کے تعلق کے بارے میں۔ لاشعوری طور پر ایک دن اچانک مل جانے کی چاہ بھی کی تھی اور انتظار بھی۔ مگر اب مل کر کوئی احساس نہ جاگا تھا۔ کیا وہ پریکٹیکل بنتے بنتے پتھر کی ہوتی جا رہی تھی؟

چند دن کے بعد عائشہ نے اکرم کے ہاتھ کچھ رقم بھجوائی تھی۔ وہ خود بھی نہیں جان پائی تھی کہ اِس عمل کی وجہ صرف ''ترس'' تھا۔ یا کچھ جتانا بھی مقصود تھا۔ اُس کی ماں نے کچھ پس وپیش کے بعد رقم رکھ لی تھی۔ مگر اُس سے ایک بار ملنے کی التجا کی تھی۔ پہلے تو عائشہ نے انکار کر دیا۔ اب تو راکھ بھی مٹی ہو چکی تھی تو پھر کریدنے سے کیا حاصل۔ مگر پھر مان گئی تھی۔ اتنی کہانیاں سنی تھیں اُس نے اپنی ماں کے متعلق۔ ایک

اور سہی۔

ایک ریسٹورنٹ کی ٹیبل پر وہ اپنی ماں کے مقابل خاموشی سے بیٹھی تھی۔ زینت نے اپنے پرانے سے پرس سے لفافہ نکال کر میز پر رکھا۔

''مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہئیں۔'' الفاظ خوددار تھے، مگر لہجے میں صرف ندامت۔

عائشہ نے نہ کچھ کہا تھا نا لفافے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ بس ایک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے پیدا ہونے کے بعد میں نے صرف چند لمحوں کے لیے تمہیں گود میں لیا تھا۔ مگر خدا کی قسم وہ لمحے میں ساری زندگی بھول نہیں پائی۔''

اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر رواں تھے۔ ''تمہیں خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں تب تک اتنی دور نکل چکی تھی کہ میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نوید مجھے قبول نہ کرتا اور ارشد تمہیں رکھنے کو تیار نہ تھا۔ خیر اچھا ہی ہوا ارشد جیسے شخص کے گھر میں.....'' اُس نے رک کر آنسو پونچھے تھے۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرائی تھی۔

''تم اپنے باپ کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہو، تو دیکھو۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ عائشہ نے اس کی ساری بات سپاٹ چہرے کے ساتھ سنی تھی مگر اس آخری بات پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر دوڑ گئی تھی۔

''مجھے تمہاری خیرات نہیں چاہیے۔ بس اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی تھی۔

''جب مجھے ماں کی ضرورت تھی تو آپ میری ماں نہیں بن سکیں۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب آپ اُن کے لیے سوچیں جن کی ماں آپ ہیں۔'' عائشہ نے لفافہ اُس کی جانب کھسکایا تھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اکرم نے آج اُسے فون کیا تھا۔

''باجی کوئی نیا کام نہیں ہے۔'' وہ اُمید سے پوچھ رہا تھا۔ نتاشا کی شاپ ڈیزائن کرتے ہوئے اُس نے اُسے ساتھ رکھا تھا۔ اِس بار بجٹ اُس کے ہاتھ میں تھا تو پیسے بھی اُسے اچھے دیے تھے۔ مگر وہ اب اپنی نوکری کے علاوہ تو کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔ اُس کے جواب پر وہ بہت مایوس ہوا تھا۔ آٹھ افراد کے کنبے کا تنہا کفیل ہونا آسان تو نہیں تھا۔

عائشہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اپنا لیپ ٹاپ اُٹھا کر فری لانس ڈیزائنر کے طور پر اپنی پروفائل بنانی شروع کر دی تھی۔ آفس سے واپس آ کر وہ یوں بھی فارغ ہی رہتی تھی۔ اچھا تھا کہ وقت کا کوئی مصرف نکال لیتی۔ چند ہی دن میں اُسے ایک چھوٹا سا پروجیکٹ مل گیا تھا۔ اکرم کو فون کر کے بتایا۔

''اف باجی، شکر ہے اللہ کا۔'' اُس کی آواز میں جو خوشی تھی وہ عائشہ کے لبوں پر مسکراہٹ لے آئی تھی۔ کچھ ایسے ہی معجزے کبھی اُس کے لیے بھی ہوئے تھے۔

☆☆☆

شیریں شادی کے بعد شاید بہت ہی مصروف ہو گئی تھی۔ ملنا ملانا بہت کم ہو گیا تھا اُس سے۔ نتاشا کا بزنس اچھا بھلا چل پڑا تھا۔ شروع میں لوگ صرف ایک نئی ''کول، شیک'' کافی شاپ ٹرائی کرنے آتے تھے۔ مگر پھر اُنہیں بار بار جو چیز کھینچ لاتی تھی وہ نتاشا کی بیکنگ تھی۔ ویسے تو وہ کافی مصروف رہتی تھی۔ مگر جب سے عائشہ نے اپنی جگہ کرائے پر لی تھی، وہ اکثر آ جاتی تھی۔ آج جانے کیوں، اُس کی تان بار بار اپنے امریکہ پلٹ کزن پر ٹوٹ رہی تھی۔ اُس کے خاندان کے کسی بھی فرد کا ذکر خیر اُس کے منہ سے عائشہ نے کم ہی سنا تھا۔ مگر اِن موصوف کو بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا جا رہا تھا۔

''یو نو واٹ، وہ بالکل تم جیسا ہے، محنتی، مستقل مزاج، سلجھا ہوا اور سیلف میڈ۔''

''اچھی بات ہے، دنیا کو ضرورت ہے۔

میرے جیسے لوگوں کی۔'' عائشہ نے لیپ ٹاپ سے نظر اُٹھائے بغیر کہا تھا۔

''ایگزیکٹلی ،اِس لیے میرا خیال ہے کہ تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے اور پھر کوئی درجن بھر بچے جو دنیا میں خوش حالی پھیلا سکیں۔''

''واہ کیا آئیڈیا ہے ،اکنامک ریسیشن کے اِس دور میں دنیا کو بچانے کا ایک یہی طریقہ رہ گیا ہے۔اور یہ آئیڈیا پیش کرنے کی وجہ سے آپ کا نام تاریخ میں زریں حروف میں لکھا جائے گا۔'' جیسی بے سروپا بات تھی ویسا ہی جواب بھی دیا تھا عائشہ نے۔

''یار! میں سیریس ہوں۔'' نتاشا تھوڑا جھلا کر بولی تھی۔

''اچھا۔'' عائشہ نے کان سے مکھی اُڑائی۔

مگر دو دن بعد نتاشا نے اچانک باہر ڈنر کا پروگرام بنالیا تھا۔ریسٹورنٹ پہنچے تو اپنی ریزروڈ ٹیبل پر بیٹھے موصوف کو دیکھ کر اُسے اندازہ ہوا کہ وہ پاگل واقعی سیریس تھی۔

نتاشا نے دونوں کا آپس میں تعارف کروایا تھا۔اچھی باوقار پرسنالٹی کا مالک تھا وہ۔مگر نتاشا نے پہلے کھانا آرڈر کیا تھا۔ پھر تمام تر توجہ اپنے مشن پر مرکوز کر لی تھی۔اب وہ اُن دونوں کی مشترکہ عادات اور نظریات پر روشنی ڈال رہی تھی۔مگر موصوف کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بالکل بے خبر تھے کہ دراصل یہاں اُن کا میچ میکنگ سیشن ہو رہا ہے۔پھر نتاشا واش روم کا کہہ کر غائب ہو گئی تھی۔ وہ بیچارہ خاموشی توڑنے کے لیے کچھ ''اسمال ٹاک'' کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔اور عائشہ کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔پھر بیک وقت اُن دونوں کو نتاشا کا میسج آیا تھا کہ اُسے کسی ضروری کام کی وجہ سے جانا پڑ رہا ہے۔باقی ڈنر اُس کے بغیر ہی انجوائے کیا جائے۔

''اِس وقت کون سا ضروری کام آ گیا؟'' احد حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

عائشہ کی بس ہو گئی تھی۔ ''کوئی ضروری کام نہیں آن پڑا۔ یہ دراصل نتاشا نے اپنی طرف سے ڈیٹ ارینج کی ہے۔آپ کی اور میری۔دماغ خراب ہے اُس کا۔'' عائشہ نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا تھا۔

''میں چلتی ہوں، دیر ہو رہی ہے۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا ہم کچھ دیر بات کر سکتے ہیں؟'' احد نے اُسے اُٹھتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

''کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟'' عائشہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ایکچوئلی آپ سے نتاشا کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔میری اطلاعات کے مطابق آپ اُس کی سب سے قریبی دوست ہیں۔اگر آپ بیٹھ جائیں۔۔'' وہ کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا تھا۔

عائشہ بیٹھ گئی۔''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

''بات دراصل یہ ہے کہ.....آئی ایم ان لوو ود ہر.....سنس فار ایور آئی تھنک'' وہ مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔''جب اِس کا رشتہ طے ہو رہا تھا تو ماما نے ماموں سے میرے کہنے پر بات کی تھی۔مگر کچھ ہماری حیثیت میں اُس وقت فرق تھا۔ کچھ ماموں دوسرے آپشن سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ محبت میری یک طرفہ تھی۔سو کوئی چانس نہیں تھا۔'' اُس نے رک کر گولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیا تھا۔''مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا ماموں کو کوئی اعتراض ہو گا مگر.....اب مجھے لگتا ہے شاید نتاشا نہ مانے۔''

''آپ سات سال امریکہ میں رہے ہیں اور حال ہی میں وطن لوٹے ہیں،رائٹ؟'' عائشہ نے پوچھا تھا۔

''جی۔'' احد نے مختصر اُجواب دیا تھا۔

''احد صاحب! یہ وہ نتاشا نہیں ہے جسے آپ سات سال پہلے جانتے تھے۔'' عائشہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔ جو اِس کے ساتھ ہوا۔ جو

باتیں رشتے دار کرتے ہیں وہ بھی وقتاً فوقتاً کانوں میں پڑتی رہتی ہیں۔ نتاشا اب وہ نتاشا نہیں رہی۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے اُس کے لیے جذبات بھی بدل گئے ہیں۔ میں موو آن کر چکا ہوں۔ مگر جب واپس آیا تو پتا چلا۔ بس پھر سے ایک نظر ڈالنے کی دیر تھی۔ وہیں کا وہیں کھڑا ہوں میں آج بھی۔'' وہ تھوڑا سا ہنسا تھا۔

''محبت جتنی بھی افلاطونی ہو۔ زندگی کی اور بھی حقیقتیں ہوتی ہیں۔ تقاضے ہوتے ہیں۔ مزید آگے بڑھنے سے پہلے ایک بار پھر اِس نئی نتاشا کو جان لیں، سمجھ لیں۔ وہ ابھی تک کسی حد تک اُس ٹراما کے حصار میں ہے۔ وہ اب بھی بہت خوب صورت ہے۔ مگر اب اُس کے دل تک پہنچنے کا رستہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔'' عائشہ رسان سے بولی تھی۔

''پوری نہیں تو آدھی دنیا تو دیکھ ہی چکا ہوں۔ اور اِس دنیا میں مجھے ایک ہی لڑکی نظر آئی۔ اب اُس کو اِس لیے تو نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ کمپلیکیٹڈ ہے۔'' وہ جذب سے بولا تھا۔ ''ویسے آپ فکر نہ کریں صبر بھی ہے مجھ میں اور مستقل مزاجی بھی۔''

اُس کی آخری بات پر عائشہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔ ''جی، بتایا تھا اُس نے جب وہ مجھے آپ کے لیے کنوینس کر رہی تھی۔'' احد بھی ہنس پڑا تھا۔

''ویسے آپ آل ریڈی رائٹ ٹریک پر ہیں۔ اُس کا خیال ہے کہ آپ میری طرح ہیں۔ اور میں اُس کی بیسٹ فرینڈ ہوں۔ پوٹینشل ہے کافی۔'' عائشہ اب مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہی تھی۔ اُسے احد اچھا لگا تھا۔ پھر نتاشا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اُنھوں نے کھانا کھایا تھا۔

واپسی میں احد نے اُسے ڈراپ کرنے کی آفر کی تو اُسے بھی رات کو ٹیکسی میں جانے سے بہتر لگا تھا اُس کے ساتھ جانا۔ مگر شائستہ آنٹی (مالک مکان) اُسے رات کو ایک مرد کے ساتھ آتے دیکھ کر کافی شک میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ اُس وقت تو اُنھوں نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ مگر پھر آنے والے دنوں میں اُس کی ''پریکی'' شروع کر دی تھی۔ اکثر اس کے آنے کے وقت وہ گیٹ کے گرد منڈلاتی پائی جاتیں۔ یا چھت پر واک کر رہی ہوتیں۔ آفس کے بعد وہ اگر کسی کام کے لیے دوبارہ نکلتی تو نگرانی مزید کڑی ہو جاتی۔ ایک آدھ بار تو اُس نے اُنہیں دیوار کے اوپر سے بھی جھانکتے پایا تھا۔

آج وہ قریبی دوکان سے کچھ سودا سلف لے کر واپس اندر داخل ہوئی تو چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ آنٹی آج پھر غالباً دیوار کے اُوپر سے جھانکنے کے چکر میں درخت کے تنے سے سلپ ہوگئی تھیں۔ عائشہ تیز قدموں سے اُن کی طرف آئی۔ سہارا دے کر اُنہیں کمرے تک لائی تھی۔ گھر میں اِس وقت کوئی نہیں تھا۔ سو اُسی نے اُن کے بتانے پر الماری سے مالش کے لیے ٹیوب نکال کر مالش کی تھی اور اُوپر سے گرم پٹی باندھ دی تھی۔

''اُس دن تم جس کے ساتھ آئی تھیں رات کو، وہ کون تھا۔'' بالآخر آنٹی نے جاسوسی میں ناکام ہو کر براہ راست جرح کا فیصلہ کیا تھا۔

''میری دوست کا کزن تھا۔ دراصل میری دوست ہی نے مجھے واپس چھوڑنا تھا مگر کسی وجہ سے وہ نہیں چھوڑ سکی تو رکشہ ٹیکسی کی جگہ.....''

''رات کو دوست کے کزن کے ساتھ۔ معاف کرنا ہم ذرا پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔'' وہ اُس کی بات کاٹ کر ناگواری سے بولی تھیں۔ ''اِسی لیے میں اکیلی لڑکی کو گھر دیتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔''

''کہتے ہیں کہ آوارگی مرد کی فطرت میں زیادہ ہوتی ہے۔ تو پھر خطرہ زیادہ اکیلی عورت سے کیوں لاحق ہوتا ہے؟ کیا عورت میں صحیح غلط کی تمیز نہیں ہوتی؟ یا اُس میں اللہ کا ڈر مردوں سے کم ہوتا ہے؟'' عائشہ نے مزید اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے بجائے اُن سے پوچھا تھا۔ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ''چلتی ہوں، خیال رکھیے گا۔'' پھر چند دن تک وہ بے دخلی کے نوٹس کا انتظار کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

آج موسم بڑا سہانا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سردیوں کا آغاز تھا۔ کرن کو صبح سے مچھلی کے پکوڑے یاد آرہے تھے۔ وہ تینوں اُس کے منہ سے اتنی بار سن چکے تھے کہ اب سب ہی کا دل للچایا ہوا تھا۔ آفس سے واپسی پر چاروں ہی ایک جگہ پہنچ گئے جو مچھلی کے پکوڑوں کے لیے مشہور تھی۔ وہاں سے واپسی پر سڑک کی طرف آتے ہوئے کرن اور ہارون تھوڑا آگے نکل گئے تھے۔ وہ اور شہریار ایک پروجیکٹ ڈسکس کرتے ہوئے پیچھے آرہے تھے۔

''وہ جو مین ونڈو ہے وہاں۔'' شہریار نے عائشہ کی بات پوری بھی نہیں ہونے دی تھی۔

''اُس ونڈو کے پاس تو تم پھٹکنا بھی مت۔''

''اچھا نہیں کچھ کر رہی میں اُس اسٹیٹ آف آرٹ ونڈو کو۔ بات تو سن لو۔''

''اللہ جوڑی سلامت رکھے باجی۔ کچھ دے دو اللہ کے نام پہ۔'' ایک فقیر نے اُن کی بحث میں خلل ڈالا تھا۔

''معاف کرو بھائی۔ نہیں سہہ سکتا میں اِسے اور اِس کے آئیڈیاز۔''

شہریار دل پر ہاتھ رکھ کر اتنی بے چارگی سے بولا تھا کہ عائشہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ مگر پھر نجانے کیا ہوا تھا۔ عائشہ کو اکثر شہریار کی نظریں اپنا احاطہ کرتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ گو بظاہر اُس کا رویہ بالکل نارمل تھا۔ وہی پروفیشنل بحث مباحثہ، اور ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ مگر وہ نامحسوس انداز میں اُس کا خیال رکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

اُسے جاب کرتے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے پراجیکٹس بھی کرتی رہتی تھی۔ خرچا اُس کا محدود سا تھا۔ بچپن میں کسی عیاشی کی عادت اُسے ڈالی نہیں گئی تھی۔ بعد میں جب اپنا بوجھ خود اُٹھانا پڑا تو پیسے دانتوں تلے دبا دبا کر خرچ کیے تھے۔ اب پیسے تھے مگر خرچ کرنے کی عادت نہیں۔ بس وقتاً فوقتاً کچھ رقم وہ اپنی ماں کو بھجوا دیا کرتی تھی۔ اچھے بھلے پیسے جمع ہو گئے تھے اُس کے پاس۔ تو سوچا گاڑی خرید لے۔ ضرورت تو تھی اُسے۔ اتنے پیسوں میں نئی گاڑی تو نہیں آسکتی تھی مگر شہریار نے اپنے کسی جاننے والے سے اُسے ایک سیکنڈ ہینڈ مہران اچھی کنڈیشن میں دلوا دی تھی۔ اُس میں جو چھوٹا موٹا کام تھا، وہ بھی خود ہی کروا دیا تھا۔

''میں خود کروا لیتی ہوں۔ مجھے پتا ہونا چاہیے، آخر ساری عمر تم تو نہیں کروا کر دو گے۔'' اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا اتنا احسان لینا۔

''ساری عمر بھی کروا سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ عائشہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے اِس جملے کے کیا معنی نکالنے چاہئیں۔

''ایک دن اور صبر کر لیں میڈم! کل ہینڈ اوور کر دی جائے گی آپ کو آپ کی گاڑی۔'' اب وہ ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہا تھا۔ اُس کے شکریہ ادا کرنے پر شہریار چند لمحے اُسے مسکراتی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا پھر بغیر کچھ کہے پلٹ گیا تھا۔ اور اُس نے ایک بار پھر خود سے سوال کیا تھا۔

کیا وہ واقعی اُس میں دلچسپی لے رہا تھا یا یہ اُس کا وہم تھا؟

☆☆☆

اگلے دن حسب وعدہ اُس کی گاڑی پہنچا دی گئی تھی۔ شہریار کے جاتے ہی عائشہ نے بہت شوق کے عالم میں اُس کے گرد گھوم پھر کر دیکھا تھا۔

کتنے سال بسوں کے دھکے کھائے تھے اُس نے۔ ہاہ..... میری گاڑی۔ یہ اُس کی پہلی گاڑی تھی۔ پہلی قیمتی ملکیت بھی۔ ڈرائیونگ کی ٹریننگ تو وہ کچھ عرصے سے لے رہی تھی۔ اب اُس میں بیٹھتے ہوئے باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ''لٹس ڈو اٹ ان اسٹائل'' بیٹھ کر پرس سے سن گلاسز نکال کر لگائے۔ میوزک لگایا۔ اور پھر فشوں۔۔ مگر یہ کیا گاڑی تو ایک ہچکولا لے کر بند ہو گئی تھی۔ گلاسز تو کیا پھر چپل بھی

اُتاری کلچ اور ایکسلریٹر پر بہتر گرپ کے لیے۔ میوزک بند کر کے اللہ کا نام لیا۔ ''واہ شکر۔ چل پڑی۔'' باچھیں پھر کھل گئی تھیں۔

ہارون اور کرن کی شادی تھی اِس ویک اینڈ پر۔ وہ تقریب کی مناسبت سے کچھ کپڑے وغیرہ لینے ایک شاپنگ سینٹر آئی تھی۔ اتفاق سے شیریں مل گئی اُسے۔ ''فون کرو تو اُٹھاتی نہیں ہو، میسج کرو تو ریپلائی نہیں کرتیں، ملنے کا تو خیر سوال ہی کیا؟'' عائشہ نے اُسے دیکھتے ہی شکوؤں کی بوچھاڑ شروع کی تھی۔

''کس دنیا میں شفٹ ہوگئی ہو تم؟''

''شادی شدہ زندگی کی دنیا میں۔'' وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

''چلو اوپر فوڈ کورٹ میں بیٹھتے ہیں تھوڑی دیر۔'' عائشہ کے کہنے پر وہ ساتھ تو ہولی تھی مگر اُس کی پژمردگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''کیا بات ہے شیریں؟'' عائشہ نے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں..... باتیں تو سب ختم ہوگئی ہیں۔''

''فرحان؟'' عائشہ سے سوال نہیں بن پڑا تھا۔ مگر وہ سمجھ گئی تھی۔

''ہاں فرحان۔ ویسا ہی ہے، جیسا تھا۔'' ایک زخمی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آئی تھی۔ ''شادی کے تین مہینے کے بعد ہی مجھے اُس کے نئے افیئر کا پتا چل گیا تھا۔ شروع شروع میں تو اُس نے کچھ چھپانے کی کوشش کی مگر دو چار دفعہ کے بعد تو یہ زحمت بھی چھوڑ دی۔''

''تو.....؟ تم نے فیملیز کو انوالو نہیں کیا۔'' عائشہ کو شاک لگا تھا اُس کی بات سن کر۔

''ہماری شادی جن حالات میں ہوئی تھی۔ اُس کے بعد میں کیسے اپنے ماں باپ کو پھر پریشان کرنے پہنچ جاتی۔ اور اُس کی مدر اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے بچوں کو بھی غلط سمجھتے ہیں۔ بلکہ شادی کو ڈیڑھ سال ہوگیا ہے اور کوئی خوش خبری نا آنے پر اُنہیں تو میری فٹنس پر شکوک ہونے لگے ہیں۔ کچھ عرصہ اور ایسے گزرا تو ہوسکتا ہے وہ۔ اُسے انگریج ہی کرنا شروع کردیں۔'' وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

''ڈونٹ ٹیل می کہ تم اِن حالات میں بچے کا سوچ رہی ہو؟

''ناٹ ایگزیکٹلی۔ مگر کبھی کبھی سوچتی ہوں، شاید بچہ ہی حالات میں کوئی بہتری لے آئے۔''

''کیا ایک معصوم بچے کو دنیا میں صرف اِس اُمید پر لانا چاہیے کہ شاید وہ دو عاقل بالغ لوگوں کے مسائل حل کر سکے؟'' عائشہ کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ صرف اُس کے حالات پر نہیں۔ اُس کی ذہنی کیفیت پر بھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو یار! ایسی ہی اُمیدیں میں نے محبت سے بھی تو لگائی تھیں۔ تمہیں پتا ہے، مجھے آج بھی لگتا ہے کہ وہ اپنے طریقہ سے محبت کرتا ہے مجھ سے۔ مگر اُمید نہیں رہی اب مجھے کوئی محبت سے۔ پتا نہیں اتنی اُمیدیں مجھ جیسے لوگ محبت سے کیوں لگا لیتے ہیں۔ زندگی بدل دے گی، سوچ بدل دے گی، فطرت بدل دے گی۔ محبت کی تو خود کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ نہ یہ پاک باز ہوتی ہے نہ بدکار، نہ خودغرض نہ اعلاظرف، نہ بے وفا نہ باوفا۔ محبت کرنے والا جیسا ہوتا ہے، اُس کی محبت ویسی ہی ہوتی ہے۔''

چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑنے والی شیریں کی آنکھیں خشک تھیں اور لہجہ جذبات سے عاری۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ رومان پرور لوگ جنہیں زندگی حقیقت پسندی کا سبق نہیں سکھاتی۔ عائشہ اُسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ہارون اور کرن کی رخصتی کے فنکشن میں پہنچی تو شہریار اور کمپنی کے چند لوگ اپنے عیال کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر موجود تھے۔ وہ بھی اُن کے ساتھ جا بیٹھی۔ شہریار نے اُس کے سجے بنے روپ کو بھرپور نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر زیرلب بڑبڑایا تھا۔

''آج تو اللہ ہی رحم کرے مجھ پہ۔'' عائشہ نے بظاہر کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ مگر پتھر تو نہیں تھی جو کچھ محسوس

نہ کرتی۔ واپسی میں شہریار نے اُس سے لفٹ مانگ لی تھی۔

''مجھے ڈراپ کردو گی، گاڑی نہیں لایا میں۔ ایک دوست کی طرف جانا ہے، تمہارے راستے ہی میں پڑتا ہے۔''

''ہاں شیور۔''

''سنو۔'' عائشہ نے ابھی گاڑی اسٹارٹ بھی نہیں کی تھی کہ اُس نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

''جی؟''

''شادی کروگی مجھ سے؟''

اگنیشن میں لگی چابی پر عائشہ کا ہاتھ ساکت ہو گیا تھا۔ اُس کے تمام تر شبہات کے باوجود، یہ کچھ غیر متوقع تھا۔ وہ کیا جواب دینا چاہتی تھی، اور اُسے کیا جواب دینا چاہیے تھا۔ فی الحال سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''ابھی کے ابھی جواب دینا ضروری نہیں ہے۔'' وہ اُس کے تاثرات دیکھ کر بولا تھا۔ ''تمہاری لائف میں آل ریڈی کوئی ہے تو نہیں۔''

شہریار کے دل میں خدشے نے سر اُٹھایا تھا۔ عائشہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ہاہ تھینک گاڈ۔ ٹیک یور ٹائم۔ ویسے تو میں تمہارا دیکھا بھالا ہوں، خوب صورت ہوں، خوب سیرت ہوں۔ انکار بنتا تو نہیں ہے۔''

وہ شرارت سے کہتا ہوا گاڑی سے اُتر گیا تھا۔

''ہاں اور ایک بات تو میں بتانا ہی بھول گیا۔ آئی ایم ان لوو دیو۔'' اُس نے کہہ کر گاڑی کا دروازہ بند کیا تھا اور قریب ہی پارک کی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ عائشہ کو اپنے حواس بحال کر کے گاڑی اسٹارٹ کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔

☆☆☆

شہریار بلاشبہ ایک اچھا انسان تھا۔ صاف گو، ایمان دار۔ اتنا اندازہ تو اُسے تھا کہ جو اُس نے کہا تھا، خلوص نیت سے کہا تھا۔ مگر وسوسے، اندیشے کچھ نہ کچھ تو سر اُٹھا ہی رہے تھے۔ جب شایان نے اُس سے اظہار محبت کیا تھا، اُس وقت تو شاید وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ مگر شہریار کوئی کم عمر لاابالی لڑکا تو نہیں ہے۔ اُس نے اپنے اوور تھنکنگ میں مصروف دماغ کو لگام ڈالی تھی۔ آخر وہ تنہا تو نہیں رہنا چاہتی تھی۔ دھیرے دھیرے کچھ دھندلے سے خواب آنکھوں میں اُترنے لگے تھے۔

''پھر کیا سوچا؟'' چند دن بعد آفس سے نکلتے ہوئے آخر اُس نے جواب طلب کر ہی لیا تھا۔

جواباً عائشہ کی شرمیلی سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ نہال ہو گیا۔ چند ہی ہفتوں میں اُس نے اُسے اپنی والدہ سے ملوایا تھا۔ شہریار کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اُس کی والدہ نے اُسے اکیلے پالا تھا سو بہت قربت تھی دونوں میں۔ مگر عائشہ کو اپنے ساتھ اُن کا بہت لیا دیا سا انداز تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

''یار اصل میں اُنہوں نے کوئی اور لڑکی پسند کی ہوئی تھی میرے لیے۔ اب اُنہیں تھوڑا ٹائم لگ رہا ہے ایکسپٹ کرنے میں۔''

شہریار کے تسلی دینے پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ شہریار اُس کے کہنے پر اُنہیں اُس کی ساری فیملی ہسٹری بشمول اُس کے والدین کی طلاق کی وجہ کے بتا چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُنہیں اُس کی ماں کے کرتوت رشتے داروں کی زبانی پتا چلیں۔

☆☆☆

چار سال بعد اُس نے اپنے باپ سے دوبارہ رابطہ کیا تھا۔ انہوں نے اُس کی بات تو سرد مہری ہی سے سنی تھی مگر شہریار کی والدہ سے بات کرنے کے لیے تیار ضرور ہو گئے تھے۔ پھر اُسے شہریار ہی کی زبانی پتا چلا تھا کہ شادی کے معاملات طے کرنے کے لیے تو درکنار، وہ شادی میں شرکت سے بھی قاصر تھے اپنی ''مصروفیات'' کی وجہ سے۔ لہٰذا اُس کی تائی امی اور تایا ابا ہی سے تمام معاملات طے کیے جائیں۔

☆☆☆

چھ سال بعد اُس نے اُس گھر میں قدم رکھا

تھا۔ مگر اُس کے مکینوں کا ردعمل اُس کی توقعات کے مطابق ہی تھا۔ سرد مہر سا استقبال۔ چبھتے ہوئے سوال۔

''لوگوں کے گھر میں سامان لگانے کے اتنے پیسے ملتے ہیں کہ سال بھر کی نوکری میں بندہ گاڑی خرید لے؟

''میری شاہانہ بھی گئی تھی۔ مگر ڈگری لائی رشتہ نہیں۔''

وہ خاموش رہی۔ شایان کی شادی ہوگئی تھی اور وہ کراچی ہی میں رہتا تھا۔ شاہانہ فی الحال غیر شادی شدہ تھی اور یہیں ایک بینک میں کام کررہی تھی۔

وہ کچھ دیر بیٹھی پھر بیگ رکھنے کے بہانے اندر کمرے میں چلی آئی۔ پھر اُسے کل کی دعوت کا خیال آیا۔ اچھی بھلی نخریلی سی خاتون تھیں شہریار کی امی۔ پتا نہیں تائی امی کا کیا ارادہ تھا؟ گھر میں سامان تھا یا نہیں؟ بہت آسان تھا سامان لانا بھی اور پکانا بھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ گھر اُس کا نہیں تھا۔ پوچھ تو لینا چاہیے جو کہیں گی سن لوں گی۔ وہ سوچ کر باہر کی طرف آئی تھی۔

''بس بہن! پہلے پالا پوسا۔ پھر ہمیں ہی برا بنا کر صاحب زادی کراچی چلی گئیں من مانیاں کرنے۔ اتنا عرصہ وہاں غائب رہیں۔ اب آگئی ہیں خیر سے لڑکا ڈھونڈ کر۔ تو یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ عزت سے رخصت کریں۔''

تائی امی کی صحن سے آتی آواز نے اُس کے قدم روک لیے تھے۔

''ماں باپ اپنی دنیا میں مست مگن۔ مصیبت ہمارے سر۔ پھر بھی اچھا کون کہتا ہے۔''

وہ بیزاری سے کہہ رہی تھیں اور عائشہ کو اپنی ساری ریاضتیں، صلاحیتیں ہوا میں تحلیل ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ اپنا آپ ایک ان چاہا بوجھ محسوس ہوا تھا۔ جیسے ہمیشہ اِس گھر میں ہوتا رہا تھا۔ اُس نے کمرے میں جا کر دوپٹہ پھیلا کر اوڑھا تھا اور اپنا بیگ اُٹھا کر باہر آگئی تھی۔ تائی امی اور اُن کے ساتھ بیٹھی خاتون نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''آپ کو جو تکلیف دی میں نے اُس کے لیے معذرت۔ مگر مزید آپ کو کوئی ذمہ داری اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔''

وہ کسی ردعمل کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آئی تھی۔ اور پھر سفر شروع کیا تھا اُس جگہ سے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی مگر جسے وہ کبھی اپنا گھر نہ بنا سکی تھی۔ اُس شہر کی جانب جو اب گھر لگنے لگا تھا۔

کراچی پہنچ کر اُس نے شہریار کو فون کیا تھا۔

''میرے والد مجھے اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتے۔ میری ماں مجھے رکھ نہیں سکتی۔ تایا، تائی کا گھر میرا گھر نہیں ہے۔ میرا گھر یہی ہے جو میں نے خود بسایا ہے۔'' وہ اپنے گرد کھڑے در و دیوار کو دیکھ کر بولی تھی۔ ''آنٹی کو یہیں لے آؤ۔ میں یہیں سے رخصت ہوں گی۔''

''یار! امی تو پہلے ہی کافی معترض تھیں کہ لڑکی کے آگے پیچھے تو لگتا ہے کوئی ہے ہی نہیں۔ تم نے تایا، تائی کو بھی پکچر سے آؤٹ کردیا۔'' شہریار اُس کی بات سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ ''اچھا چلو دیکھتا ہوں میں۔''

عائشہ کے دل میں اچانک خیال آیا تھا اگر سرپرست کی موجودگی ضروری تھی۔ تو پھر باپ ہی کیوں؟ ماں کیوں نہیں؟ تنہا تو اُن دونوں نے ہی چھوڑا تھا اُسے۔ اُس کی ماں کم از کم اب تو اُس سے تعلق رکھنا چاہتی تھی۔

پھر عائشہ اپنی ماں کو لے آئی تھی۔ مگر جب اُس نے بتایا کہ وہ اُسے لڑکے کی ماں سے ملوانا چاہتی ہے تو وہ بوکھلا گئی تھی۔

''نہیں نہیں۔ یہ غلطی ہوگی۔ میں تمہارے لیے کوئی اچھا حوالہ نہیں ہوں۔ تم اپنے باپ سے بات کرو۔ منت سماجت کرلو تھوڑی۔ باپ ہے مان ہی جائے گا۔ میرا ماضی۔ میرا حال کچھ بھی تو اِس قابل نہیں۔'' وہ اُسے سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔

''جو تعلق رکھنا چاہتا ہے اُسے جھٹک دوں۔ جو

نہیں رکھنا چاہتا اُس سے تعلق کی بھیک مانگوں؟'' عائشہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ''اب جو ہے وہ ہے۔ جو نہیں نا سہی۔ یہی میرا اصل ہے کوئی قبول کرسکتا ہے تو ٹھیک۔ نہیں تو نا سہی۔''

عائشہ کا متفکر انداز دیکھ کر زینت خاموش ہوگئی تھی۔

پھر دونوں ماں بیٹی نے مل کر کھانا پکایا تھا۔ ماں پہلی بار بیٹی کو اپنے گر بتا رہی تھی۔ اور بیٹی سن رہی تھی۔ زینت کی بنائی ہر چیز عائشہ کو اچھی لگی تھی۔ اور وہ تعریف پر نہال ہوئی جارہی تھی۔ زینت نے بریانی کا دم کھول کر تھوڑی سی نکالی تھی۔

''یہ سندھی بریانی تو میری سب بہت پسند کرتے ہیں۔'' جوش جوش میں اُس نے ہاتھ ہی میں نوالہ بنا کر عائشہ کی طرف بڑھایا تھا۔ ''چکھو ذرا۔'' عائشہ نے ایک نظر اُس نوالے کو دیکھا تھا اور ایک نظر زینت کو..... پھر آگے ہو کر منہ کھولا تھا۔ اور اُس ایک پل میں وہ سارے لمحے لہرا گئے تھے، جو اُن دونوں کے کبھی بن نہ سکے تھے۔

عائشہ نے پلکیں جھپک کر نمی کو آنکھوں تک محدود کرلیا تھا۔ مگر زینت کا احساس زیاں آنسوؤں کی لڑی بن کر اُمڈ آیا تھا۔ اسی اثنا میں ڈور بیل بجی تھی۔ یقیناً شہریار کی امی ہی تھیں۔ عائشہ اُنہیں ریسیو کرنے کے لیے دروازے کی جانب بڑھی تھی۔ ہلکے رنگ مگر بہت نفیس سے کام والا جوڑا پہنے، دوپٹہ سر پر جمائے، وہ وقار سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں تو زینت نے اُن کا استقبال کچھ بوکھلائے گھبرائے ہوئے انداز میں کیا تھا۔ شاید اُس کے ''گناہوں'' پر اُسے اس قدر شرمندہ کیا جاچکا تھا کہ معذرت خواہانہ انداز اور لجاجت اُس کی شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔

''یہ میری امی ہیں۔'' عائشہ نے تعارف کرایا تھا۔

''تمہاری اسٹیپ مدر؟'' زینت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اُنھوں نے سوال کیا تھا۔

''نہیں میری رئیل مدر۔''

''وہ جو چلی گئی تھی؟'' بظاہر عام سے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

''جی۔'' عائشہ مختصراً جواب دے کر اُنہیں اندر اپنے لیونگ روم میں لے آئی تھی۔ ''بیٹھیے پلیز۔''

وہ اپنے اردگرد کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے صوفے پر ٹک گئی تھیں۔ ''کراچی ہی میں رہتی ہو؟'' زینت سے پوچھا تھا۔

''جی۔'' زینت نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ جواب دیا تھا۔

''تو بیٹی کو ساتھ کیوں نہیں رکھتیں؟''

زینت عام سے سوال کے جواب میں نروس ہو جایا کرتی تھی۔ اتنے پیچیدہ سوال کا کیا جواب دیتی۔

''اِن کی اپنی فیملی ہے، شوہر ہے، بچے ہیں۔ میں خود بھی یہاں زیادہ کمفرٹ ایبل ہوں۔'' جواب عائشہ نے دیا تھا۔ جس پر اُنھوں نے استہزائیہ آنکھیں ادھر اُدھر گھمائی تھیں۔

''کھانا تیار ہے، گرم گرم ہی لگا دیں تو بہتر ہو گا۔'' زینت نے بے سکون خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔

''بھوک تو نہیں ہے مجھے مگر جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔''

''بریانی اچھی ہے۔'' انہوں نے چند نوالے لینے کے بعد کہا تھا۔ یہ پہلا خوش گوار جملہ تھا جو اُن کے منہ سے ادا ہوا تھا۔ ''تم نے بنائی ہے؟''

''نہیں، یہ امی نے بنائی ہے۔''

''تو تم نے بھی کچھ سیکھا ہے ماں سے۔ عشق عاشقی کے علاوہ؟'' لہجہ اور لفظ دونوں ہی میں کاٹ تھی۔

''یہ میرے ساتھ کبھی نہیں رہی۔ اِس کی تائی نے پالا ہے اِسے اُنھوں نے ہی تربیت کی ہے اِس کی۔'' زینت ایسے شرمندگی سے وضاحت دے رہی تھی جیسے جرم ہوتا عائشہ کا اُس کی گود میں پلنا۔

''ہاں بتایا تھا شہریار نے، تم بھاگ گئی تھیں کسی کے ساتھ شوہر کے ہوتے ہوئے۔'' تلخ آمیز لہجے میں زہر اُگلا گیا تھا۔

عائشہ کو شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اُن کی مرضی نہیں تھی اِس رشتے کے لیے۔ مگر اتنا زہر؟

''آنٹی پلیز، آپ میری امی سے اِس طرح بات نہ کریں۔'' اُس نے درخواست کی تھی مگر مضبوط لہجے میں۔

''ستائیس سال کی تھی میں، جب شہریار کے والد کا انتقال ہوا۔ مگر اُن کی وفات کے بعد بھی میں نے بے وفائی نہیں کی اُن سے۔ خاندانی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔'' وہ زعم پارسائی میں گردن اکڑا کر بولی تھیں۔ ''سچ سننے کا حوصلہ پیدا کرو بی بی۔ سچ تو سننا ہی پڑتا ہے۔''

''اللہ آپ کو آپ کے صبر اور پارسائی کا صلہ دے۔ میری ماں اپنے رب کی گناہگار ہو گی، شاید میری بھی، شاید میرے باپ کی بھی۔ مگر اور اِس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ سو کسی کو حق نہیں اِس کا سچ اس کے منہ پر مارنے کا۔'' عائشہ کا لہجہ مستحکم تھا۔ ''آپ میری مہمان ہیں لیکن اگر آپ کو میری گناہگار ماں کے برابر بیٹھنا گوارا نہیں تو دروازہ سامنے ہے۔''

وہ تن فن کرتی نکل گئی تھیں۔ ''یہ کیا ہو گیا؟'' زینت ہاتھ اُٹھائے سکتے کی کیفیت میں پوچھ رہی تھی۔ ''میں نے کہا تھا۔ میں نہیں ہوں اِس قابل..... نہیں ہوں میں اِس قابل۔'' وہ زمین پر ڈھے سی گئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا۔'' عائشہ نے جھک کر اُسے اُٹھانا چاہا۔ اُس نے عائشہ کی ٹھوڑی کو چھوا تھا۔

''میں نے تمہیں کیا دیا ہے۔ جو تم سے اب چھینے آ گئی۔ کیا کیا میں نے اپنی بچی کے ساتھ کیا کیا۔''

اُس نے غم کے مارے اپنے آنسوؤں سے تر گال پیٹ لیے تھے۔ عائشہ نے نرمی سے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''کوئی کسی سے کچھ نہیں چھینتا۔ ہر انسان اپنے حصے کی سکھ دیکھتا ہے۔ اپنے حصے کے دکھ جھیلتا ہے۔ بہانہ کوئی بھی بن جاتا ہے۔''

وہ نرمی سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مگر زینت اس وقت ندامت اور افسوس میں اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ کوئی تسلی کام نہیں کر سکتی تھی۔ عائشہ نے آگے بڑھ کر اُس کے سسکتے ہوئے وجود کو بانہوں میں بھرا تھا۔

''بس..... بس۔'' وہ دھیرے دھیرے اُس کے بال سہلا رہی تھی۔ جیسے کوئی ماں غم سے نڈھال بچے کا درد سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔

زینت کے جاتے ہی شہریار کا فون آ گیا تھا۔

''باہر آؤ فوراً۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ اُسے ساتھ لے کر ایک قریبی پارک میں آ گیا۔

''ہوا کیا اصل میں؟'' شہریار کی ماں نے اُسے یہی بتایا تھا کہ عائشہ نے اُس سے بدتمیزی کی ہے۔

عائشہ نے ساری کہانی حرف بہ حرف سنا دی تھی۔

''اُف یار ایک تو امی بھی کچھ زیادہ ہی روایتی سوچ رکھتی ہیں۔ اوپر سے جو ملاپ چھبیس سال نہیں ہو سکا وہ بھی آج ہی ہونا تھا۔'' وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔

''مجھے یہی تاثر ملا تھا کہ وہ میرے ماں باپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ باپ کے پاس میرے لیے ٹائم نہیں تو ماں سے ملا دیا۔ اب اُن کے معیار کے مطابق نئے ماں باپ میں ایجاد تو نہیں کر سکتی نا۔'' وہ بے بسی سے بولی تھی۔

''اُف یار! کس مصیبت سے میں نے اُنہیں راضی کیا تھا۔'' وہ اضطراب میں انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

''اچھا ایسا ہے۔ میں امی کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔ گو زیادہ اُمید نہیں ہے مجھے۔ اگر نہیں مانتیں تو ہم ایسے ہی شادی کر لیتے ہیں۔''

عائشہ نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔

''شروع میں مشکل ہو گا۔ جو بھی کہیں گی

برداشت کرنا پڑے گا۔ وقت کے ساتھ مجھے اُمید ہے وہ قبول کرلیں گی۔ تمہیں جان جائیں گی تو ہوپ فلی اچھا ریلیشن بن جائے گا تم سے۔''

وہ اُمید افزا لہجے میں بول رہا تھا۔ مگر عائشہ کی آنکھوں کے سامنے وہ شب و روز گھوم گئے جو اُس نے دلوں کو جیتنے میں صرف کیے تھے۔

''بہت مشکل ہے یہ شہریار! شاید وہ کبھی قبول نہ کرسکیں۔'' وہ دوبارہ اُس وقت میں نہیں جاسکتی تھی۔

''یار شی از ناٹ آمونسٹر۔ بس تمہارے ڈسفنکشنل فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے کچھ ریزرویشنز ہیں اُن کی۔ تمہارے ساتھ رہیں گی تو دور ہو جائیں گی۔''

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟''

''یار! کچھ رسک تو لینا پڑے گا۔ ماں ہیں میری۔ چھوڑ تو نہیں سکتا میں۔''

''چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔'' عائشہ آہستہ سے بولی تھی۔

''تو پھر؟ تم بتاؤ۔ اگر تمہارے پاس کوئی بہتر حل ہے۔'' اُس نے جھلا کر پوچھا تھا۔

عائشہ نے چند لمحے سوچا تھا۔ پھر اُنگلی سے شہریار کی دی ہوئی انگوٹھی اُتار کر ہتھیلی پر رکھی تھی۔ اور ہتھیلی اُس کے سامنے کردی تھی۔

شہریار نے پہلے اُسے بے یقینی سے دیکھا تھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں شکوہ اُتر آیا تھا۔

''کتنا آسان ہے نا تمہارے لیے۔'' وہ اذیت سے مسکرایا تھا۔ ''تمہارے لیے تو میں صرف ایک مناسب رشتہ تھا۔ محبت تھوڑی کی ہے تم نے جو کوئی رسک لوگی۔''

اُس نے عائشہ کے ہاتھ سے انگوٹھی اُٹھا کر دیکھی تھی۔ ''لیکن شاید تم ٹھیک ہی ہو۔ اٹس ناٹ ورتھ اٹ۔'' شہریار نے انگوٹھی زور سے کہیں دور پھینک دی تھی اور اُس پر ایک آخری نظر ڈال کر پلٹ گیا تھا۔

وہ خاموشی سے اُسے اپنی زندگی سے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ کافی دیر بعد فون بجنے کی آواز پر چونکی تھی۔ نتاشا کا فون تھا۔ آج کی اسپیشل اپ ڈیٹ معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا اُس نے۔ عائشہ نے سب مختصراً بتا دیا تھا۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اداسی سے سورج کو ڈھلتا دیکھتی رہی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو اپنے گھر کی جانب چل دی۔ وہ گھر جہاں صرف تنہائی اُس کی منتظر تھی۔

مگر گھر پہنچی تو نتاشا کو اپنے پورشن کی سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا کچھ ساز و سامان کے ساتھ۔

''ہاہ تھینک گاڈ۔ مجھے تو پریشانی ہونے لگی تھی۔ تمہیں اِس بریک اپ ڈرامہ کی عادت نہیں ہے۔ سو آئی ہیڈ ٹو سی فار مائی سیلف۔''

اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عائشہ اُس کے گلے لگ گئی تھی۔ شکووں کی گردان کرتے دل سے شکر کا کلمہ نکلا تھا۔ بہت اُداس تنہا لمحوں میں جو بن پکارے دکھ بانٹنے آجائے ایسا دوست کتنوں کو نصیب ہوتا ہے۔

''ڈونٹ وری ڈارلنگ۔ یو ہیو گاٹ دی بیسٹ بریک اپ تھراپسٹ ان ٹاؤن۔''

☆☆☆

آفس میں شہریار بالکل اجنبی بن گیا تھا۔ کرن کو سن کر افسوس ہوا تھا مگر ساتھ اُس کی عقل کو بھی کوسا تھا۔

''یار یہی چاہ رہی تھیں شہریار کی امی۔ تم نے موقع پلیٹ میں رکھ کر دے دیا۔ شادی ہو جانے دیتیں۔ بعد میں تو ایک ہی جیسا حال ہوتا ہے۔ اپنی پسند بھی زہر لگتی ہے اور بیٹے کی بھی۔''

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر تھا، وہ کچھ دوستوں سے مل کر واپس جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے اُسے تین مرد ایک عورت کو گھیرے دکھائی دیے۔ دن میں یہاں اوپن مارکیٹ لگتی تھی مگر رات کے وقت اندھیرے اور جرائم پیشہ افراد کا راج ہوتا تھا۔ غور کرنے پر اندازہ

ہوا کے وہ ہو کر تھی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ مگر بیک ویو مرر میں اُس نے دیکھا کہ وہ لوگ اُسے مار رہے تھے۔ اُس نے پولیس کو کال کی تھی۔ مگر پھر وہ لوگ اُسے گھسیٹ کر ایک گاڑی کی طرف لے جانے لگے تھے۔ وہ جانتا تھا، وہ اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر بھی گاڑی سے اُتر آیا تھا۔

''ہے یو گائز۔ ہیوسم اسٹف؟''

وہ ہاتھ اوپر کر کے اُن کی طرف آتے ہوئے بولا تھا۔ وہ یہ ظاہر کررہا تھا کہ وہ منشیات خریدنا چاہتا ہے۔ وہ کچھ دیر اُسے شکی نظروں سے جانچنے کے بعد وہ اُسے بیچنے کو تیار ہو گئے۔ تو اُس نے ایک فرضی پارٹی کا ذکر چھیڑ دیا جس کے لیے اُسے زیادہ مقدار میں منشیات چاہیے تھیں۔ اور وہ آن لائن ڈیلرز سے بہتر ڈیل ڈھونڈ رہا تھا۔ اِس اُمید میں کہ پولیس پہنچ جائے۔ اُنھوں نے اُس کو رابطہ کرنے کے لیے نمبر دیا۔ اچانک پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا تھا۔

''یہ (گالی) پولیس والا ہے۔ گاڑی میں بیٹھو جلدی۔'' گاڑی میں موجود اُن میں سے ایک نے کہا تھا۔ مگر اُس سے بات کرنے والے شخص کو شک ہوا کہ اُس کے مقاصد دراصل کچھ اور تھے تو اُس نے اُسے سبق سکھانا ضروری سمجھا تھا۔ اُس نے بجلی کی تیزی سے چاقو نکال کر شاہ زین کی پسلیوں تلے گھونپ دیا تھا۔ شاہ زین درد کی شدت سے دوہرا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اُن کی گاڑی کے جانے کی آواز سنی تھی۔ پھر پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا تھا۔ اُس کے بعد ہر طرف اندھیرا تھا۔

اُس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو سامنے ہاسپٹل کے درودیوار تھے۔ ایک ڈاکٹر نے اُس سے کچھ سوال جواب کیے۔ اُس نے تھک کر جلد ہی آنکھیں موند لی تھیں۔ اگلی بار آنکھ کھلی تو احمر سامنے تھا۔ پہلے تو اُس نے کچھ حال چال پوچھا۔ مگر پھر اُس کی ایسی حالت کے باوجود پھٹ پڑا۔

''تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟ سپر ہیرو ہو؟ اندازہ تھا تمہیں کہ کس قسم کے لوگوں سے پنگا لے رہے ہو۔ وہ بھی ایک ہو کر کے لیے۔

this is a professional hazard that they sign up for (یہ ایک پیشہ ورانہ خطرہ ہے جسے وہ جانتے بوجھتے اپنائی ہیں۔)'' You could have died damn it. (تم مرسکتے تھے)۔ نفسیاتی بیماری ہے یہ تمہارا ہیروپن۔''

شکر ہے ایک نرس اندر آگئی تھی۔ جس کی وجہ سے احمر کو اپنی تقریر روکنی پڑی تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر اگلے دن جب احمر آیا تو اُس کا انداز بہت نرم تھا۔

احمر روز ہی اُس سے ملنے آتا۔ اکثر علینہ بھی ساتھ ہوتی۔ اُس کے باقی دوست بھی آتے رہتے تھے۔ مگر کوئی اُس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ رہنے والا نہیں تھا حیدر علی کی طرح۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی شدت سے اُن کی کمی محسوس کررہا تھا۔ نجانے اُنہیں کسی نے اطلاع بھی کی تھی یا نہیں۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ جانتے تھے اور پھر بھی اب تک نہ پہنچے تھے۔ نہ فون کیا تھا۔ آج احمر آیا تو اُس نے پوچھ لیا۔ اُس کی بات پر احمر کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

''یار میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہو۔'' اُس کا انداز دیکھ کر شاہ زین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جو وہ بتانا چاہتا ہے وہ اُسے سنانا نہیں چاہتا۔

''انکل کا انتقال ہو گیا ہے۔ جس دن تمہارے ساتھ یہ حادثہ ہوا اُسی دن ان کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ اور وہ سروائیو نہیں کرسکے۔'' شاہ زین اُس لمحے میں منجمد ہو گیا تھا۔ احمر نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا مگر شاہ زین نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

''میں تھک گیا ہوں، سونا چاہتا ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔

احمر کچھ دیر تذبذب میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

''میں یہی باہر ہوں۔'' وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولا تھا۔

شاہ زین نے اُس کے جاتے ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔ خشک بے خواب آنکھوں سے وہ گھٹنوں

چھت کو تکتا رہا تھا۔

☆☆☆

بہت بے کیف سے دن تھے۔ پھر ایک دن ایک مشہور ڈیزائنر فرنیچر کمپنی کا ایڈ آنکھوں سے گزرا تھا۔ اُسے ہمیشہ سے فرنیچر ڈیزائننگ میں دلچسپی تھی۔ انٹرویو دینے چلی گئی اور اُسے سلیکٹ بھی کر لیا گیا۔ تنخواہ حالانکہ اُس کی موجودہ تنخواہ سے کم تھی۔ مگر سچ یہ تھا کہ وہ اب یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ وہ اب تک اتنی پروفیشنل اور پریکٹیکل نہیں ہوسکی تھی کہ روز شہر یار کا سامنا کرتی اور اُس کے بارے میں نہ سوچتی۔

آج فراغت تھی تو کچھ تفصیلی صفائی کے بعد سودا سلف لینے نکل پڑی۔ گاڑی نکالتے ہوئے گیٹ پر ہی شائستہ آنٹی (مالک مکان) مل گئی تھیں۔ اُن کی پہلی اور آخری تفصیلی ملاقات کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔ گیٹ بند کرتے ہوئے اُس نے سلام دعا کی تھی۔

''کہاں جا رہی ہیں؟'' اُس نے ازراہ تکلف پوچھا تھا۔

''بس یہیں مارکیٹ تک۔ جنید کے ایگزام چل رہے ہیں تو سوچا رکشے میں ہی جا کر لے آؤں سودا۔''

''بیٹھ جایئے۔ میں بھی مارکیٹ ہی جا رہی ہوں۔'' عائشہ نے پیشکش کی تھی۔ پھر ساتھ ہی دونوں نے سودا خریدا تھا۔

''اتنا ثابت مسالہ کس چیز میں ڈالتی ہو؟'' اُنھوں نے پوچھا تھا۔

''نہیں ثابت نہیں، دھو کر خشک کر کے گرائنڈ کروں گی۔''

''واہ بھئی بڑی گھر گرہستن ہو۔ اتنے لمبے چکروں میں کون پڑتا ہے آج کل۔'' وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔ بالآخر عائشہ کو اپنی پڑوسن کے ساتھ کچھ مشترکہ دلچسپی کا موضوع مل ہی گیا تھا۔ گھر داری۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں سے بات بڑھ کر دکھ سکھ تک جا پہنچی تھی۔

☆☆☆

آج خلاف توقع شیریں ملنے آ گئی۔ چند مہینے پہلے ہی اس اتفاقیہ ملاقات کے بعد وہ پھر غائب ہو گئی تھی۔

''واہ! آج تو کوئی معجزہ ہو گیا ہے۔'' عائشہ اُس سے گلے ملتے ہوئے بولی تھی۔

''اب ایسے معجزے ہوتے ہی رہیں گے۔ فکر نہ کرو۔''

''کیوں اب ایسا کیا ہو گیا ہے؟''

''آزاد ہو گئی ہوں میں۔'' وہ مسکرا کر بولی تھی۔

''خلع لے لی ہے میں نے۔''

بظاہر بات غم کی تھی۔ مگر بتانے والے کے لہجے میں بھی کچھ اطمینان تھا۔ اور سننے والے کو بھی سن کر دھچکا نہیں لگا تھا۔ ناسور سے چھٹکارا پانے کے لیے تکلیف تو سہنی پڑتی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ سب بتانے لگی۔ کیسے فرحان نے اُسے اپنے ہی ماں باپ کو دکھ دینے اور مزید ذلیل کرنے کے گلٹ میں ٹریپ کر رکھا تھا۔ وہ یہ سارا عرصہ ان ہی کے بارے میں سوچ کر برداشت کرتی رہی۔ مگر جب بات اُس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اُس نے فیصلہ اُنھی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ وہ ماں باپ تھے بیٹی کی تکلیف کے سامنے سب بھول گئے۔

''تمہاری نئی جاب کیسی جا رہی ہے؟'' شیریں شاید مزید اس تکلیف دہ موضوع کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کچھ خاص نہیں یار! میں نے یہ فرم اس اُمید پر جوائن کی تھی کہ مجھے فرنیچر ڈیزائننگ میں کام کرنے کو ملے گا۔ مگر بزنس اونر خود ڈیزائنر ہیں اور فرض ہے کہ اُن کے شوروم میں پڑا ہر پیس اُن کا سگنیچر پیس ہو۔ میرا کام صرف کنسلٹینسی فراہم کرنا ہے۔'' عائشہ بیزاری سے بولی تھی۔ ''اور وہ بھی میری اور باس کی ذوق جمال ڈیفرنٹ ہیں۔ سوچ رہی ہوں چھوڑ دوں۔ ارننگ تو میری ویسے بھی اپنے فری لانس کام میں زیادہ ہے۔''

''یار اسد بھائی دبئی سے پاکستان شفٹ ہو گئے ہیں اور یہاں فرنیچر ہی کا بزنس اسٹارٹ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ اگر تم اُن کو کچھ گائیڈ کر سکو اپنے ایکس پیریس کے مطابق؟؟''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔'' عائشہ خوش دلی سے بولی تھی۔ پھر شپریں کے گھر ہی اُس کی ملاقات ہوئی تھی سنڈے لنچ پہ۔ فرنیچر ڈیزائننگ میں اُس کی خود بھی دلچسپی تھی سو اُس کے پاس کافی متعلقہ معلومات تھیں۔ کچھ جان پہچان بھی تھی۔ مختلف ڈیلرز اور کاریگروں سے بھی ملوایا تھا اُس نے انہیں تاکہ اُن کو بہتر آئیڈیا ہو سکے۔

اُن سے پہلی ملاقات ہی میں ایک آئیڈیا گردش کرنے لگا تھا اُس کے دماغ میں۔ آج بالآخر زبان پر لے آئی تھی۔

''اسد بھائی اگر آپ محض ایک فرنیچر شوروم کے بجائے ایک پورا فرنشنگ پیکج آفر کریں لوگوں کو؟ مع ڈیزائنر کنسلٹنسی۔''

وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولی تھی۔ بنیادی طور پر وہ اُسی قسم کے ماڈل کی سفارش کر رہی تھی جہاں وہ اس وقت کام کر رہی تھی۔ ''ایسے بزنس زیادہ تر ایک مخصوص کلاس کو کور کر رہے ہیں۔ اگر اس کو زیادہ افورڈ ایبل رینج میں لایا جائے تو میرا خیال ہے کافی پوٹینشل ہے۔''

''میں ال ریڈی تھوڑا نروس ہوں۔ اور تم نئے نئے آئیڈیاز پیش کر رہی ہو۔'' اُنھوں نے اُس کی بات پر سوچتے ہوئے سر کھجایا تھا۔

''صرف ایک آئیڈیا ہے۔ مزید ریسرچ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ فیزیبل ہے یا نہیں۔''

کافی سوچ بچار اور معلومات کے بعد اسد بھائی اِس آئیڈیے پر تو متفق ہو گئے تھے مگر تان بجٹ پر آ کر ٹوٹ گئی تھی۔ اِس پلان کے حساب سے ابتدائی سرمایہ کاری زیادہ چاہیے تھی۔

اور اسد بھائی کے پاس مزید رقم نہیں تھی۔ فیملی والے آدمی تھے۔ بچے زیرِ تعلیم تھے۔ سب کچھ بیچ باچ کر کاروبار میں لگا دینے سے ڈر رہے تھے۔ اور ڈر جائز تھا۔

☆☆☆

علینہ اور احمر نے بارہا کوشش کی کہ وہ اُن سے بات کرے۔ اپنا دل ہلکا کرے اُن کے ساتھ۔

''we were never close.Don't worry i am fine''

(ہم میں زیادہ قربت نہیں تھی۔ میں ٹھیک ہوں۔) وہ اُن کی کوششوں کے جواب میں کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔ ہسپتال سے گھر واپسی کی ٹرانزیشن بھی ہموار رہی تھی۔ کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو بظاہر غیر معمولی لگتا۔ بس وہ خاموش تھا۔ اور حالات کے مطابق اتنا ردعمل تو نارمل تھا۔ مگر درحقیقت کچھ بھی نارمل نہ تھا۔ اُس کی ظاہری خاموشی کے پیچھے اتنا شور تھا کہ اُسے اپنی دماغ کی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ کبھی اُس کے کانوں میں چیخیں اور سسکیاں گونجتی تھیں۔ کبھی کوئی اُس کے کان میں سرگوشی کرتا۔

''مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے نہیں چلو گے۔''

محبت، نفرت جذبہ انتقام، ندامت سب گڈمڈ ہو گیا تھا۔ باقی تھا تو صرف درد۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اُس نے بے خواب آنکھوں سے ٹک ٹک کرتی گھڑی کو دیکھا تھا۔ اور پھر اُس کو اُٹھ کر اتنی دفعہ پٹخا تھا کہ وہ بالآخر خاموش ہو گئی تھی۔ مگر اپنے اندر کے شور کا کیا کرتا وہ؟ پھر اُس نے ایسی جگہوں کی راہ لی جہاں بہت شور ہو۔ تاکہ اُسے اپنے اندر کی آوازیں سنائی نہ دیں۔ ایسے ہی ایک نائٹ کلب میں اُسے سگریٹ پیتے دیکھ کر کسی نے پوچھا تھا۔

''یو وانٹ سم تھنگ اسٹرونگر؟''

شاہ زین نے اُس زہر کے بیوپاری کو غور سے دیکھا تھا۔ اگر اِس درد پر زہر بھی اثر کر جائے تو کیا برا تھا؟

احمر اُس کے لیے پریشان تھا۔ کتنی دفعہ اُس کے گھر کے چکر کاٹے مگر نجانے وہ موجود ہی نہیں ہوتا تھا یا دروازہ نہیں کھولتا تھا۔ آج اُسے ایک جاننے

والے نے بتایا تھا کہ وہ مہینے بھر سے آفس بھی نہیں گیا تھا۔ وہ آج اِس ارادے سے آیا تھا کہ جب تک شاہ زین نہیں ملے گا وہ وہیں اُس کے گھر کے سامنے جما رہے گا۔ مگر اِس کی نوبت نہ آئی۔ اُسے پہنچتے ہی شاہ زین مل گیا تھا۔ اپنے ہی دروازے کے سامنے بے سدھ پڑا ہوا۔ احمر دروازہ کھول کر اُسے اندر لے کر گیا تھا۔ گھر کی حالت بھی شاہ زین سے مختلف نہ تھی۔ اُسے صوفے پر لٹا کر احمر نے کمبل ڈالا تھا اور خود گلتے سڑتے ادھ بچے کھانے اور خالی بوتلوں پھینکنے میں لگ گیا۔ تاکہ کم از کم سانس لینا تو ممکن ہو۔ چند گھنٹوں کے بعد اُس کے حواس کچھ لوٹے تھے۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' احمر نے کافی کا مگ اُس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''انجوائے۔'' شاہ زین نے بظاہر لاپرواہی سے جواب دیا تھا۔

''اِس قسم کی ''انجوائے منٹ'' میں تو تم نے کبھی ٹین ایج میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ یہ کن چکروں میں پڑ گئے ہو یار۔''

''ہاں تم پانچ وقت مسجد میں اذان دیتے ہو۔ تمہارا جممیٹل ہونا تو بنتا ہے۔'' شاہ زین طنزیہ لہجے میں بولا تھا۔

''جممیٹل نہیں ہو رہا۔ پریشان ہو رہا ہوں۔ تم آفس بھی نہیں گئے کافی عرصے سے؟''

''یو نو واٹ؟ باپ مر گیا ہے میرا۔ اب مجھے یہ پری میلنڈ کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں اُس کے پیسے خرچ نہیں کرنا چاہتا۔ اپنے باپ سے نفرت تھی مجھے مگر اُس کے پیسے سے نہیں۔'' وہ آنکھ مار کر بظاہر ہنسا تھا۔ ''ناؤ آئی کین فائنلی انجوائے۔''

''کاش تم واقعی انجوائے کر رہے ہوتے۔'' احمر تاسف سے بولا تھا۔ ''جیسے تم ہنس رہے ہو اِس سے بہتر ہے تم رو لو۔''

شاہ زین نے اچانک سے اٹھ کر اُس کا گریبان غصے سے پکڑا تھا۔ ''رونا چاہتا ہوں میں۔ مرا باپ مرا ہے۔ مگر اپنی ماں کے قاتل کے لیے کوئی کیسے رو سکتا ہے۔'' وہ آنکھوں میں وحشت لیے اُس سے پوچھ رہا تھا۔ پھر اُس کا گریبان چھوڑ دیا تھا۔

''گیٹ لاسٹ۔۔ جسٹ گیٹ لاسٹ۔''

احمر کچھ دیر کے لیے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گیا۔ مگر گیا نہیں۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اُس کے سامنے آ بیٹھا تھا۔

''تم تکلیف میں ہو۔ مگر یہ سب تمہاری تکلیف دور نہیں کر سکتا۔ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔ یہ وہ نہیں ہے جس کے تم قابل ہو۔'' احمر دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ شاہ زین جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی کے جذبات اُبھرے تھے۔ مگر احمر کو یہ بھی حوصلہ افزا لگا تھا۔ کم از کم اُس نے اِس خیال کو فوری مسترد نہیں کیا تھا نہ اپنے اصل جذبات غصے یا سپاٹ چہرے کے پیچھے چھپائے تھے۔

علینہ اور احمر کی کوششیں رنگ لائی تھیں۔ شاہ زین آخر کار پروفیشنل ہیلپ لینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ایک مہینہ اُس نے ری ہیب سینٹر میں گزارا تھا۔ نفسیاتی ماہرین نے Post traumatic stress disorder تشخیص کیا تھا۔

☆☆☆

آج ویک اینڈ تھا۔ نتاشا آئی ہوئی تھی۔

''یہ کباب بڑے مزے کے بنائے ہیں تم نے۔'' وہ تیسرا کباب پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

''میں نے نہیں بنائے۔ امی بنا کر لائی تھیں۔'' عائشہ نے تصحیح کی۔ نتاشا اُس کی بات سن کر سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''ایک بات بتاؤ۔ تم نے اپنی ماں کو معاف کیسے کیا؟'' نتاشا نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں۔ اچانک نہیں کیا۔ اور کچھ خاص سوچ کر بھی نہیں کیا۔'' عائشہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

''پتا ہے مجھے لگنے لگا ہے کہ انسان کو ہم شاید جتنا بڑا ولن بنا دیتے ہیں، اتنا تو اُس کا اختیار ہی نہیں

ہوتا۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میری کہانی میں شاید کوئی بھی ولن نہیں تھا۔ بہت سے لوگوں نے میرے ساتھ کچھ نہ کچھ برا کیا۔ مگر میری قسمت لکھنے پر قادر نہیں تھے وہ۔ بلکہ اُن میں سے اکثر لوگوں نے مجھے جینے کے بہت قیمتی گر سکھائے۔ جیسے کہ میرے سروائیول سکلز، محنت کی عادت۔ میری تائی کی دین ہیں۔ شاید میں یہ سب نہ کر پاتی۔ اگر بچپن سے ہی مجھے ایسے کولہو کے بیل کی طرح نہ جوتا گیا ہوتا۔''

''چائلڈ لیبر کو جسٹی فائے کر رہی ہو تم، لڑکی!'' نتاشا ناک چڑھا کر بولی تھی۔

''کچھ بھی کہو، کچھ کریڈٹ تو جاتا ہے اُن کو بھی۔ پتا ہے؟'' وہ ہنسی تھی۔

''کبھی کبھی جب میرا اچھا وقت چل رہا ہوتا ہے تو میرا دل کرتا ہے۔ ایک ایک خط لکھوں کچھ لوگوں کو۔ میرے ساتھ کمینہ پن کرنے کا شکریہ۔''

پھر کچھ سوچ کر وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔

''مگر شاید میں ایسا اِس لیے سوچ سکتی ہوں کہ میں مجموعی طور پر اپنی زندگی سے ناخوش نہیں ہوں۔''

''ہاں، شاید..... لوگوں کو معاف کرنا آسان ہوتا ہے۔ وین یو آر ایٹ آ گڈ پلیس اِن یور لائف۔'' نتاشا نے اتفاق کیا تھا۔

''تو آج کل آپ کہاں ہیں زندگی میں؟'' عائشہ نے شرارت سے پوچھا تھا۔ نتاشا کچھ کچھ بدل رہی تھی اور وجہ یقیناً احد تھا۔

''مے بی مووِنگ ٹو ورڈز آ گڈ پلیس۔'' وہ کندھے اُچکاتے ہوئے ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

عائشہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ پھر اُس کا فون بجا۔ اُٹھا کر دیکھا تو بینک سے معذرت کا میسج تھا۔ متوقع ہی تھا۔ اُس نے منہ بنا کر فون واپس رکھ دیا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں یار! بینک میں لون کے لیے اپلائی کیا تھا۔ نہیں ملا۔ خیر ملنے کی کوئی اُمید بھی نہیں تھی۔ نہ گارنٹی، نہ ماڈ گیج کرانے کے لیے کوئی پراپرٹی۔ معجزہ ہی ہوتا اگر مل جاتا۔''

''مگر لون کس لیے؟'' نتاشا نے حیرت سے پوچھا تو وہ اُسے اسد بھائی کے بزنس کے بارے میں بتانے لگی۔ ''اگر لون مل جاتا تو میں اُن کے ساتھ تھرٹی، تھرٹی فائیو پرسنٹ کی پارٹنرشپ کر لیتی۔''

''اگر تم چاہو تو میں مجھے لون دے سکتی ہوں۔'' نتاشا گلاس میں پیپسی ڈالتے ہوئے لاپروائی سے بولی تھی۔

''نہیں یار۔'' عائشہ نے آفر مسترد کی تھی۔

''سوچ لو۔''

''نہیں۔ اور ویسے تم اتنے پیسے لاؤ گی کہاں سے؟ اپنے ابا سے مانگو گی؟''

''ہاہاہاہا۔ وہ تو مجھے نہ دیں۔ باپ سے پہلے بزنس مین ہیں وہ۔ حق مہر میں کچھ پراپرٹی ملی تھی مجھے۔ اپنا بزنس اسٹارٹ کرنے کے لیے کچھ بیچی تھی میں نے۔ وہی بقایا پیسے پڑے میں میرے اکاؤنٹ میں۔ اینی وے۔ تم سوچ لو۔''

☆☆☆

''میرے والد ہمارے ساتھ مسلسل نہیں رہتے تھے۔ اُن کی جاگیر تھی، سیاسی حلقہ تھا، دوسری بیوی تھی۔ سو وہ آتے جاتے رہتے تھے۔

مجھے اُن کے آنے کا انتظار رہتا تھا۔ مگر جانے کا اُس سے زیادہ۔ جب وہ زیادہ دن ہمارے پاس گزار لیتے تھے تو میں دعائیں کرنے لگتا تھا کہ وہ کبھی دوبارہ نہ آئیں۔ وہ جب بھی آتے تھے میرے لیے بہت کچھ لاتے تھے۔ میں اُن کا شہزادہ تھا۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتے تھے مجھے کیا چاہیے؟ مگر میں ان سے کبھی یہ نہ کہہ سکا کہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میری ماما کو نہ ماریں۔ میری ماما کو نہ ماریں۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا تھا۔

اور پھر تھراپسٹ کے کاؤچ پر بیٹھا وہ چھ فٹ کا مرد رو پڑا تھا۔ کسی چھوٹے سے بے بس بچے کی طرح۔

☆☆☆

نتاشا ایسے گھر میں پیدا ہوئی تھی جہاں پیسے کی ریل پیل تھی۔ اِس لیے اُسے اِس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ ایسے میں اُس سے اتنی بڑی رقم لینا عائشہ کو مفاد پرستی لگ رہا تھا۔ مگر دوسری طرف اگر وہ یہ رقم لیتی تو واپس کرنے کی نیت سے لیتی۔ لیکن اگر کاروبار نہ چل پایا؟ عجیب مخمصے میں تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے ایک چھوٹے قرضے کے لیے اپلائی کیا تھا جو خوش قسمتی سے مل گیا تھا۔ گاڑی بھی بیچ دی۔ اور پھر جو رقم کم پڑ رہی تھی اُس کے لیے نتاشا سے بات کی۔

اسید بھائی نے اُس کی پارٹنر شپ کی آفر بخوشی قبول کی تھی۔ اتنا اندازہ تو اُنہیں ہو چکا تھا کہ اُس کا تجربہ اور لگن دونوں ہی کاروبار کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ محدود وسائل کی وجہ سے چھوٹے پیمانے مگر بڑے جذبے کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ اکرم اب اُس کا فل ٹائم اسسٹنٹ تھا۔ ترقی کا سفر صبر آزما بھی تھا اور قدرے سست رو بھی مگر پھر ترقی تو زینہ زینہ چڑھ کر ہی کی جاتی ہے۔

☆☆☆

آج اُس کی تھراپسٹ اُس سے اُن واقعات کے بارے میں پوچھ رہی تھی جن میں وہ زخمی ہوا تھا۔ اُس نے مختصراً تفصیل بتائی تھی۔

''کیا آپ کو بہت غصہ آتا ہے اور آپ قابو نہیں رکھ پاتے؟''

میں نہیں سمجھتا کہ میں کوئی زیادہ شارٹ ٹمپرڈ ہوں۔''

''پھر ایسی صورتحال کیسے پیدا ہو جاتی ہے کہ آپ اپنی سیفٹی کو بھول جاتے ہیں؟''

''میرے دوست کہتے ہیں، مجھے ہیرو بننے کا شوق ہے۔'' وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

''کیا واقعی؟'' تھراپسٹ بھی مسکرائی تھی۔

مگر وہ اب سنجیدہ تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد گویا ہوا۔

''میں پندرہ سال کا تھا جب میں نے اپنے باپ کے سامنے آواز اُونچی کی تھی۔ میں کھیل کر اندر داخل ہوا تھا۔ میرا باپ شاید نشہ میں تھا اور میری ماں کو پیٹ رہا تھا۔ وہ دونوں سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ میں پہلی بار زور سے چیخا تھا۔

''بس۔'' مگر دیر ہو گئی تھی اگلے ہی لمحے میری ماں گردن کے بل سیڑھیوں سے نیچے گری تھی۔ اُس دن میرے سارے خوف ختم ہو گئے تھے۔ مگر پھر بچانے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ میری ماں اُسی دن مر گئی تھی۔ اگلے کئی سال تو وہ بس سانسیں رُکنے کا انتظار کرتی رہی۔''

چند لمحے وہ رک کر حلق میں پھنسے آنسو اندر اُتارتا رہا۔ ''اب کبھی کبھی بغیر سوچے سمجھے کچھ سچویشنز میں کود پڑتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ دیر نہ ہو جائے۔''

☆☆☆

ری ہیب سینٹر سے واپسی پر علینہ اور احمر نے اُسے فوری طور پر واپس اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ نہیں ہونے دیا تھا۔ بلکہ چند مہینے اصرار کر کے اُسے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ دواؤں اور تھراپی کی بدولت وہ کافی بہتر ہو چکا تھا۔ اور اب اپنے فلیٹ میں بھی شفٹ ہو گیا تھا۔ مگر وہ دونوں میاں بیوی اب تک اُسے ڈاکٹر اور تھراپسٹ کی اپائنمنٹ کے لیے خود ڈراپ کرنے پر مصر تھے۔ وہ کئی بار ان سے کہہ چکا تھا کہ اِس کی اب ضرورت نہیں۔ مگر جانتا تھا وہ یقینی بنانا چاہتے تھے کہ وہ اپنے علاج میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ آج احمر اُسے تھراپسٹ کے آفس کے سامنے ڈراپ کر رہا تھا تو اُس نے اُترنے سے پہلے اسٹیرنگ پر رکھے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

''تھینک یو، آئی اوو مائی لائف ٹو یو۔''

''صحیح بات ہے۔ مجھے بھی لگنے لگا ہے میں اور علینہ تمہارے اماں، ابا ہیں۔'' احمر ہنستے ہوئے بولا۔

''ناؤ ڈونٹ میس اٹ اپ۔''

''آئی ول ڈو مائی بیسٹ ڈیڈی۔'' ہنستے ہوئے کہہ کر اُتر گیا تھا۔

آج تھراپسٹ اُس سے اُس کی ماں کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اُس کی عادتیں، پسند نا پسند، اُس کی سوچ، شخصیت کے بارے میں۔

''بڑے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی گھریلو تشدد کا شکار افراد کے لیے Chronic abuse کے سائیکل سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ باوجود اِس کے کہ معاشرہ اور قانون اُن کی معاونت کے لیے موجود ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ کہنا کہ آپ کی والدہ کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ جو اُنھوں نے نہیں کیا نا انصافی ہوگی۔'' وہ بولی تھی۔

شاہ زین نے اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''مگر اِس کے باوجود، اگر ایک بچہ اور ایک بڑا ایک سچویشن میں وکٹم ہیں تو اُن میں سے، اُس سے نکلنے کے لیے تگ و دو کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟''

''میں وکٹم نہیں تھا۔ میرے والد نے مجھ پر کبھی بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا۔'' شاہ زین نے تصحیح کی تھی۔

وہ اُس کی بات پر چند لمحے خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی تھی۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک بے بس بچہ جو اپنی ماں کو بار بار بیدردی سے پٹتے دیکھتا ہے۔ وہ وکٹم نہیں ہے؟ پہلی بار شاہ زین کو یہ کہانی ایک نئے زاویے سے نظر آئی تھی۔

''آپ اپنے والد کو اُس سب کے لیے معاف نہیں کر سکتے جو اُنھوں نے آپ کی ماں کے ساتھ کیا۔ یہ آپ کی نہیں، آپ کی ماں کی صوابدید تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ اپنے والد کو اُس ذہنی اذیت کے لیے معاف کر سکتے ہیں، جس سے آپ گزرے؟''

شاہ زین کے پاس فی الحال اِس سوال کا جواب نہیں تھا۔

کوئی سال سے زیادہ کے عرصے کے بعد شاہ زین نے وہ خط کھولا تھا۔ جو حیدر علی کے وکیل نے اُن کی قانونی وصیت کی کاپی کے ساتھ اُس تک پہنچایا تھا۔

پیارے شاہ زین،

سدا خوش رہو۔ یہ خط میں تمہیں معافی کی اُمید میں نہیں لکھ رہا۔ بلکہ اعتراف کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ میں ایک بہت بڑا جاگیردار، گدی نشین، سابق صوبائی وزیر۔ درحقیقت ایک بہت چھوٹا اور کمزور انسان ہوں۔ تمہاری ماں کو میں نے پہلی بار اُس کے کالج کے باہر کھڑے دیکھا تھا اور دیکھتے ہی دل ہار بیٹھا تھا۔ پاگلوں کی طرح اُس کے کالج کے چکر کاٹے تو وہ بھی نظر انداز نہ کر سکی۔ کم فہمی کی عمر تھی میری محبت پر ایمان لے آئی۔ بات شادی تک پہنچی تو میرے گھر والوں نے انکار کر دیا۔ میرے چچا کی بیٹی میری بچپن کی منگیتر تھی۔ اُس کے گھر والوں نے بھی چھڑے چھانٹ کو بیٹی دینے سے انکار کر دیا۔

جوانی کے جوش میں ہم دونوں نے بغاوت کر کے شادی کر لی۔ ہم دونوں کے گھر والوں نے ہمیں عاق کر دیا۔ مگر جلد ہی فکر معاش محبت پالینے کی ساری خوشی نگل گئی۔ میں نے بیرونی امداد کے بل پر بمشکل انٹر کیا تھا۔ اِس قابلیت پر مجھے کس پائے کی نوکری مل سکتی تھی۔ اور پھر میرا مزاج نوکری کے قابل کہاں تھا۔ ایک دو جگہ شروع کی مگر ہفتہ بھی نہ نکال سکا۔ آخر خدیجہ ہی نے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی۔ چھوٹی سی تنخواہ میں گزارہ تو مشکل تھا۔ مگر اُس سے زیادہ وہ چوٹ برداشت کرنا مشکل تھا جو میری مردانہ انا پر پڑ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ محبت حالات کی تلخی میں غرق ہو گئی۔ مجھے اُس سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔

تمہاری پیدائش کے بعد حالات مزید ابتر ہو گئے تو میں نے اپنے باپ کے پاؤں میں گر کر معافی مانگ لی۔ مجھے اِس شرط پر معاف کیا گیا کہ میں اپنی چچا زاد سے شادی کر لوں گا۔ اُس سے ہونے والی اولاد ہی میری وارث ہوگی۔ تمہاری ماں کی حیثیت ایک رکھی ہوئی عورت سے زیادہ نہ ہوگی۔ سکینہ سے اُولاد نا ہونے کی وجہ سے تمہیں تمہاری جائز حیثیت

مل گئی۔ مگر تمہاری ماں! چلتا پھرتا آئینہ تھی میرے لیے۔ میں ذاتی حیثیت میں کتنا بے وقعت انسان تھا یہ یاد دلاتا تھا مجھے اُس کا وجود۔ میں ذلیل کرتا تھا اُسے اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے۔ اُسے اذیت دے کر بدلہ لیتا تھا اُس سے مجھے اپنی اوقات دکھانے کا۔ پندرہ سال مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا تھا۔ عورت پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بچپن سے دیکھا تھا میں نے اپنے اردگرد لوگوں کو، سو اِس کو اپنا حق سمجھا۔ کوئی صفائی نہیں ہے میرے پاس اپنی۔ جتنی تاویلیں سوچتا ہوں اپنا آپ اُتنا چھوٹا لگتا ہے۔ معافی نہیں مانگوں گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ اِس پوری دنیا میں تم سے زیادہ محبت میں نے کسی سے نہیں کی۔ کاش میں اِس قابل ہوتا کہ بدلے میں تم سے محبت کی اُمید رکھ سکتا۔

تمہارا گناہ گار حیدر علی۔''

شاہ زین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''بابا۔ بابا۔ بابا'' وہ نیچے قالین پر پڑا سسک رہا تھا اور اپنے باپ کو آوازیں دے رہا تھا۔ کب کے رکے آنسو اور سسکیاں بالآخر اُبل پڑی تھیں۔

☆☆☆

احد کی محنت ڈیڑھ سال کے بعد رنگ لائی تھی۔ منا شا بالآخر شادی کے لیے مان گئی تھی۔ شادی کے دن دونوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ عائشہ نے دل ہی دل میں اپنی سب سے پیاری سہیلی کی بلائیں لی تھیں۔ فنکشن سے واپسی پر وہ اپنا ہار سنگھار اُتارنے شیشے کے سامنے کھڑی تھی کہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر لمحے بھر کو رُک گئی۔ کان سے اُتارا جھومکا ماتھے پر رکھ کر دوپٹہ سر پر کیا تھا۔ کیا ایسا کوئی لمحہ اُس کے نصیب میں بھی تھا؟ چند لمحے اپنے عکس کو دیکھنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

چند مہینوں کے بعد ہی شیریں کے رشتے کی بھی ایک جگہ بات چلی تھی۔ اُس کی فیملی کے پرانے جاننے والے تھے۔ دوبئی میں پڑوسی رہ چکے تھے جو بعد میں آسٹریا شفٹ ہو گئے تھے۔ مگر لڑکا (جو اتنا لڑکا بھی نہ تھا، عمر میں شیریں سے نو سال بڑا تھا) کافی عرصے سے لندن میں رہ رہا تھا۔ شیریں کے منجھلے بھائی بھی لندن میں کافی عرصہ رہے تھے اور اُس سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ شیریں خوش نہ تھی تو نا خوش بھی نہ تھی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا اور کاغذی کاروائی ہوتے ہی شیریں لندن سُدھار گئی تھی۔

کاروبار اُس کی اور اسد بھائی کی اُمیدوں سے بہتر جا رہا تھا۔ مگر مارکیٹ میں ساکھ بنانا جتنا مشکل تھا، اُسے قائم رکھنا اُس سے زیادہ۔ سو زندگی بہت مصروف ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ پاکستان آیا تھا۔ اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھی تھی، پھول چڑھائے تھے۔ قریبی مسجد میں قران خوانی کروائی تھی۔ خیرات تقسیم کی تھی۔ پھر کراچی آ گیا۔ کراچی کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا تھا۔ اِس سے بہتر حالت میں تو وہ آٹھ سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ پرانے دوستوں سے ملنا اچھا لگ رہا تھا۔

مظہر تو یوں ملا تھا جیسے درمیان میں کوئی وقت بیتا ہی نہ ہو۔ وہ اُسے اپنے ریسٹورنٹ کی ایک نئی برانچ دکھانے لایا تھا ساتھ۔ واپسی پر کچھ دیکھ کر وہ پھر گاڑی سے اُترا تھا۔ شاہ زین کی نظریں اُس کے تعاقب میں سیڑھیوں کے اُوپر کھڑی لڑکی سے جا ٹکرائی تھیں۔ شرمیلی معصوم؟ شارٹ کرتے اور اسٹریٹ ٹراؤزر میں ملبوس سر پر اسکارف نما دوپٹہ ڈالے، سن گلاسز ماتھے پر کیے وہ وہی تھی۔ یا اتنی مماثلت ہو سکتی ہے دو لوگوں میں؟ وہ مظہر سے بات کر رہی تھی۔ دونوں کی باڈی لینگویج سے یہی لگ رہا تھا کہ موضوع بحث یہی بلڈنگ تھی۔ مظہر واپس آیا تو اس نے پوچھ لیا۔

''یہ لڑکی کون تھی؟''

''انٹیریئر ڈیزائنر ہے۔ فرنش کر رہی ہے یہی میرا ریسٹورنٹ۔''

''کیا نام ہے؟''

''عائشہ۔'' واہ یہ تو وہی تھی۔ مظہر نے اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ ''کیا سین ہے باس؟ تھوڑی اپ ٹائٹ ٹائپ کی ہے مگر..... پرنس چارمنگ کے چارمز کو شاید نہ ہی رزسٹ کر پائے۔ انٹروڈکشن کرواؤں؟''

نہیں یار..... شی جسٹ ریز مبلزسم ون آئی نیو۔''

☆☆☆

آج تین سال بعد وہ نہ صرف تمام قرضے لوٹا چکی تھی بلکہ کاروبار میں اُس کا شیئر بھی بڑھ چکا تھا۔ نتاشا اُمید سے تھی اور اِسی خوش خبری کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے وہ دونوں آج ''گرلز ڈے آؤٹ'' منا رہی تھیں۔

''نہیں وہ بلو میں زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔'' کپڑوں کی ایک دوکان میں ایک شناسا سی مردانہ آواز پر وہ چونکی تھی۔ عائشہ نے تھوڑا سا پلٹ کر تر چھی نظروں سے دیکھا تھا۔ شہریار ہی تھا وہ۔ بچے کو سینے پر کیریر میں باندھے سامنے کھڑی کپڑے دکھاتی عورت کو مشورے دیتا ہوا۔

''سارے بلو ہی خرید لوں؟'' اُس کی بیوی ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''بلو میں ہی تم مجھے تھوڑی سی اچھی لگتی ہو۔'' وہ شرارت سے بولا تھا۔

''چلیں پھر اِس تھوڑے سے اچھے لگنے کی بھی مجھے ضرورت نہیں۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔

عائشہ نے پاس ہی کپڑے دیکھتی نتاشا کو اشارہ کیا تھا اور دوکان سے باہر نکل آئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' نتاشا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''وہ شہریار تھا، اُس دوکان میں۔''

''پچھتا رہی ہو؟'' کھانا آرڈر کرنے کے بعد نتاشا نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ ''بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں زندگی مکمل پیکجز آفر کرتی ہے۔ اکثر لوگوں کو چننا پڑتا ہے۔ اور کچھ چن لینے کا مطلب تو کچھ چھوڑ دینا بھی ہوتا ہے نا۔ فیصلہ صحیح بھی ہو تو بھی زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں، جب ہمیں پیچھے رہ جانے والی چیزوں کا ملال ستاتا ہے۔''

''اللہ پوچھے اُس بڈھی کو۔'' نتاشا نے اپنے ڈرنک میں اسٹرا گھماتے ہوئے شہریار کی ماں کو کوسا تھا۔

''ہاہاہاہا۔ بری بات۔'' عائشہ کو اُس کے یوں جل کر کہنے پر ہنسی آئی تھی۔ ''بہت شارٹ سا ریلیشن تھا ہمارا۔ میں شہریار کو پسند ضرور کرتی تھی مگر بات ابھی محبت کی حدود میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ آج اگر میں بھی اکیلی نہ ہوتی تو شاید اُسے کسی اور کے ساتھ خوش باش دیکھ کر مجھے دکھ نہ ہوتا۔'' عائشہ ایمان داری سے اپنے جذبات کا تجزیہ کر کے بولی تھی۔

''یار! ایک تم اپ ٹائٹ بھی اتنی بنی رہتی ہو۔ بندہ تھوڑا اپروچ ایبل ہو تو کوئی بات کرنے کی ہمت بھی کرے۔'' نتاشا بولی تھی۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ کسی کو ملنے، کسی کو جاننے کی حد تک میں اوپن ہوں۔ کہیں سچائی نظر آئی تو ضرور موقع دوں گی۔ مگر پرنس چارمنگ کے چکر میں مینڈکوں کے ساتھ ہٹ اینڈ ٹرائل نہیں کھیل سکتی۔ ویسے مینڈکوں سے یاد آیا، میری رشتوں والی آنٹی کے پاس بھی پروفائل بن چکی ہے۔'' عائشہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''سیریسلی؟''

''ہاں ناں۔ امی اور شائستہ آنٹی کی ملاقاتوں کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔''

''پھر کیا اسٹیٹس ہے؟''

''ابھی تک تو شہزادیوں کے اُمیدوار مینڈک ہی نکل رہے ہیں۔'' عائشہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

مگر پھر ''ایک غیر مینڈک'' کا رشتہ بھی آ ہی گیا۔ اُس دن شائستہ آنٹی نے اُسے اچانک اپنی طرف بلوا لیا۔ وہ گئی تو اُن کے کوئی رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ ایک شائستہ سی خاتون تھیں۔ ساتھ ایک حضرت بھی تھے چالیس کے قریب، ڈیسنٹ سی

پرسنالٹی کے مالک۔ خاتون اُس سے بات کرتی رہیں، اُس کے کام وغیرہ کے حوالے سے۔ مگر عائشہ کو اُن کے آنے کا مقصد اگلے دن پتا چلا۔ جب شائستہ آنٹی نے خوشی خوشی اُس کے پاس آئی تھیں۔

''کیسی لگی تمھیں میری کزن؟''

''اچھی تھیں۔'' عائشہ کو اُن کے سوال پر کچھ حیرت ہوئی تھی

''اور اُس کا بھائی؟''

''مطلب۔'' عائشہ کچھ کچھ سمجھ تو گئی تھی۔

''اِس کی بیوی کی پچھلے سال ڈیتھ ہوئی ہے۔ ایک بیٹی ہے پانچ سال کی۔ جرمنی میں سیٹلڈ ہے ایک بینک میں جاب کرتا ہے۔ اچھا سلجھا ہوا انسان ہے۔ لڑکی دیکھ رہے تھے میں نے تمہارا بتایا، پسند آگئیں کل اِنہیں تم۔'' وہ خوشی خوشی بتا رہی تھیں۔ مگر پھر رُک کر اُنھوں نے اُس کا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھا تھا۔

''دیکھو عائشہ! ٹھیک ہے کہ وہ تم سے کوئی دس سال بڑا ہوگا، ایک بیٹی کا باپ بھی ہے مگر حقیقت پسندی سے سوچو تو یہ جوڑ برا نہیں ہے۔ اب تک جتنے بھی رشتے بتائے اُس رشتے والی نے، اُن میں تو کوئی گھر بلانے لائق بھی نہیں تھا۔ اور پھر انجان لوگ پتا نہیں کیا جھوٹ سچ بولتے ہیں۔ اِن کا تو میں سب کچا چٹھا جانتی ہوں۔ اِس کی بیوی بھی میری کزن تھی۔ خوش رکھا ہوا تھا اِس نے اُسے۔'' وہ اُسے رسان سے سمجھا رہی تھیں۔ عائشہ کو اُن کے خلوص پر رتی برابر شُبہ نہیں تھا مگر..... اُس نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔

امی کو بھی شائستہ آنٹی نے خبر دی تو وہ خوشی خوشی دوڑی چلی آئیں۔ چن چن کر اِس رشتے کی خوبیاں بتائی تھیں اُسے۔ مگر کافی سوچ بچار کے بعد اُس کا جواب انکار میں تھا۔ امی بجھی بجھی سی لوٹی تھیں۔ شائستہ آنٹی تو کچھ دن باقاعدہ خفا رہیں۔ آج وہ اُن کو پڑا اصرار کر کے سیل کا لالچ دلا کر شاپنگ پر لے آئی تھی۔ مگر کپڑے دیکھتے ہوئے اُنھوں نے پھر وہی ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''غلطی کر رہی ہو تم۔ آئیڈیل ہیرو نہیں ملتے سب کو۔''

''خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتی میں، جو کسی ہیرو کا انتظار میں کروں۔ تیس سال سے زیادہ عمر اور پیچیدہ سے خاندانی پس منظر کے ساتھ میرے کیا پروبلیمز ہیں، اندازہ ہے مجھے۔ اور کزن آپ کے ہیرو نہیں تھے تو امریش پوری بھی نہیں تھے۔ اور نہ میں اتنی تنگ نظر ہوں کہ ایک چھوٹی سی بچی کو اپنی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھوں۔''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے تمہیں؟'' شائستہ آنٹی نے کچھ جھلا کر پوچھا تھا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ میں تیس سال تک بیٹھ کر اچھے رشتے کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔ میں آج جہاں ہوں، وہاں میں بہت محنت سے پہنچی ہوں۔ یہ سب چھوڑ کر، صرف ایک اجنبی کے ساتھ کی خاطر میں ایک دوسری دنیا میں جا کر نہیں بس سکتی۔''

''مگر یہ نارمل زندگی تو نہیں ہے۔''

''نارمل زندگی کیا ہوتی ہے آنٹی؟'' اُس نے پوچھا تھا۔ ''کتنے لوگ ہیں جو صرف ''نارمل زندگی'' کا بھرم قائم رکھنے کے لیے کتنی ابنارمل زندگیاں جی رہے ہیں۔ اور کتنے لوگوں کی اچھی بھلی زندگیوں کو صرف ''نارمل'' کو پا لینے کے جنون نے ابنارمل بنا رکھا ہے۔''

''ایک تو یہ آج کی لڑکیوں کے فلسفے!''

شائستہ آنٹی سر جھٹک کر کپڑوں کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

شیریں سے جب بھی بات ہوتی وہ اُسے لندن آنے کا کہتی۔

''ہاں برابر والی گلی میں تو ہے، تم چائے رکھو میں پہنچتی ہوں۔'' عائشہ اُس کی دعوت پر ہنستے ہوئے کہتی۔

''یار! قائداعظم کا قول بیس کروڑ عوام میں

ایک تم نے ہی پلو سے باندھا ہے۔ کام کام اور صرف کام۔ تم الون ایگل نہ فکر نہ فاقہ، گھومو پھرو دنیا دیکھو۔''

شیریں ہمیشہ اُسے یہ مشورہ دیا کرتی تھی۔ مگر پھر ایک دن لندن میں انٹیریئر ڈیزائننگ پر ایک کانفرنس کا اشتہار دیکھ کر اُس کا بھی ارادہ بن ہی گیا۔ شیریں نے سنا تو خوشی سے چیخ پڑی۔ پرانے دوستوں کی جو قدر پردیس میں آتی ہے کہیں نہیں آتی۔

''واہ۔ تم آؤ ہم بھی چھٹیاں اُسی حساب سے پلان کرلیں گے۔ بہت ساری جگہیں ہیں جو ابھی تک میں نے بھی نہیں دیکھیں۔''

وہ آگے کے پلان بنانے میں لگ گئی تھی۔ مگر پھر ایک لمبی صبر آزما فلائٹ اور ایئرپورٹ کے پیچیدہ مراحل سے گزرنے کے بعد اُسے ہیتھرو ایئرپورٹ پر شیریں نے نہیں بلکہ اُس کی ایک دوست نے ریسیو کر کے شیریں کے خالی گھر پر ڈراپ کیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ اُسی صبح شیریں کے ساس سسر دونوں ایک ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوگئے تھے۔ سو وہ دونوں میاں بیوی اُس کے آنے سے پہلے ہی آسٹریا روانہ ہو چکے تھے۔ اب وہ تھی اور انگلینڈ تھا۔ وہ کبھی سندھ کے چند شہروں سے باہر نہیں گئی تھی۔ اب انگلینڈ تو نئی دنیا لگ رہا تھا۔ مگر بہت خوب صورت دنیا۔ انسان کے کمالات تو اپنی جگہ مگر قدرت نے بھی فیاضی سے حسن بخشا تھا۔

پہلے پانچ دن تو کانفرنس کی نذر ہوئے۔ اُس کے ختم ہونے کے بعد اُس نے حسب عادت ''پلاننگ'' کی۔ کہاں گھومنا ہے اور کیسے۔ لندن پاس خریدا۔ پہلے دن صبح سے شام تک ''ہوپ آن ہوپ آف بس'' پر اُترتی چڑھتی، پھرتی پھراتی مختلف محلات، میوزیمز اور پارکس دیکھتی رہی۔

اگلے دن موسم مزید سہانا ہوگیا تھا۔ ابر آلود اور کبھی کبھی بیچ میں ہلکی سی پھوار بھی ہونے لگتی تھی۔ وہ ہلکی سے خنکی کو انجوائے کرتے ہوئے لندن برج پر واک کر رہی تھی۔

وہیں ایک طرف کھڑے ہو کر سگریٹ پیتے شاہ زین نے اُسے دیکھا تھا۔ یا تو یہ دنیا واقعی بہت چھوٹی تھی۔ یا شرمیلی معصوم کی شکل اور وضع قطع کی لڑکیاں دنیا میں جگہ جگہ پائی جاتی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھے شعبدہ بازوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جو تین گلاسوں کے نیچے بال گھما کر لوگوں کو بے وقوف بنانے میں مصروف تھے۔ اُسے غور سے دیکھتا پا کر اُنھوں نے اُس سے پوچھا تھا کہ وہ کھیلنا چاہتی ہے؟

عائشہ نے سوچتے ہوئے سامنے دیکھا تو سامنے کھڑا ایک شخص اُسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نظر ملنے پر اُس شخص نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔ مگر عائشہ نے اُس کی تنبیہ نظر انداز کر دی تھی۔ اُسے سائیڈ سے بال نظر آرہی تھی کہ کس گلاس کے نیچے ہے۔ مگر شعبدہ بازوں نے اپنا کام کر دکھایا تھا اور اُسے دس پاؤنڈ سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

بے اختیار ہی نظر سامنے گئی تو اُس شخص نے مسکراتے ہوئے ابرو چڑھا کر کندھے اُچکائے تھے۔ پھر سگریٹ قریبی بن میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ عائشہ کو چل چل کر کافی بھوک لگنے لگی تھی۔ قریب میں ایک دوکان نظر آئی تو اُسی پر چلی گئی۔ مگر حلال حرام کا اتنا چکر تھا کچھ ڈھنگ کا مل ہی نہیں رہا تھا۔ کاؤنٹر پر موجود خاتون بھی اب اُس سے اُکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر ایک دوسرے شخص کو پانی کی بوتل دینے لگی۔

عائشہ کی نظر پڑی تو یہ وہی شخص تھا۔ نظر ملی تو اُس نے ''ہیلو'' کہا تھا۔ عائشہ نے بھی جواب میں مروتاً ہیلو کہا۔ خالی سبزیوں کا سلاد ہی لے لیتی ہوں، تنگ آکر اُس نے سوچا تھا۔ بٹوے میں چینج واپس رکھتا وہ شخص شاید اُس کی کشمکش و پیچ کو سمجھ گیا تھا۔

''اگر آپ حلال ڈھونڈ رہی ہیں تو یہاں قریب ایک ٹرکش ریسٹورنٹ ہے۔'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں مگر خالی پیٹ زیادہ چلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

"کتنا دور ہے؟"
"پانچ منٹ کی واک ہوگی۔" اُس کے راستہ پوچھنے پر اُس نے مکمل ڈائرکشن دی تھی۔ آخر میں بولا تھا۔
"میں خود بھی وہیں جا رہا ہوں۔" عائشہ سر ہلا کر ساتھ ہی ہولی۔
"ویسے کتنا ہاریں آپ؟ اُس نے چلتے چلتے مسکراہٹ دبا کر پوچھا تھا۔
"دس پاؤنڈ۔" عائشہ بھی بے ساختہ مسکرا دی تھی۔
"ناٹ بیڈ! یہاں لوگ اچھے بھلے پیسے ہار جاتے ہیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں۔"
"اندازہ تو تھا مجھے کہ اتنا ایزی تو نہیں ہوگا جتنا نظر آرہا ہے۔ کوئی ٹرک تو ہوگی ان کی۔ مگر میں نے سوچا چلو زندگی میں ایک بار جوا بھی سہی۔"
عائشہ خود پر ہنستے ہوئے بولی تھی۔
"ویسے ونس اِن آلائف ٹائم ایکسپیرینس کی بات تھی تو پھر کسی کسینو کا رخ کرنا تھا۔ فار آمور فل فلنگ ایکسپیرینس۔" وہ شرارت سے بولا تھا۔
"بائی داوے آئی ایم شاہ زین۔"
"عائشہ۔"
چھوٹا سا ریسٹوران تھا مگر خوشبو مزے کی آرہی تھی۔ عائشہ نے اُسی کے مشورے پر کباب آرڈر کیے تھے۔ "آپ پہلی دفعہ آئی ہیں انگلینڈ؟" اُس نے پوچھا تھا۔
"جی۔ آپ بھی ٹورسٹ ہیں؟
"نہیں۔ مجھے تو دس سال ہوگئے ہیں یہاں۔ اب کہیں اور شفٹ ہونے کا پلان ہے تو سوچا تھوڑا پھر سے ایکسپلور کر کے دیکھ لوں کہ زیادہ یاد تو نہیں آئے گا۔"
"اتنا خوب صورت شہر ہے۔ یاد تو آئے گا۔"
عائشہ باہر کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی تھی۔
پھر کھانے کے دوران کچھ مزید تعارف ہوا تھا۔ وہ دس سال پہلے یہاں پڑھنے آیا تھا۔ پھر پڑھائی کے بعد یہیں ایک بینک میں جاب کر لی تھی۔ اب جاب چھوڑ کر بزنس پلان کر رہا تھا۔ پھر گفتگو کا رُخ عائشہ کے لندن ٹرپ پر مرکوز ہوگیا تھا۔ کیا دیکھا ہے۔ کیا نہیں دیکھا۔ کیا دیکھنا چاہیے۔ وہ اُسے اُس کے شوق کو مدنظر رکھ کر مشورے دیتا رہا۔
ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو عائشہ اپنے میپ میں اُلجھی ہوئی تھی۔
"مجھے یہاں سے ٹاور برج جانا ہے۔ وہاں سے تھیمز کے کروز پر۔ مگر یہاں سے کیسے جاؤں؟ ٹیوب اسٹیشن کہاں ہے؟" وہ اپنے میپ پر غور کرتے ہوئے بولی تھی۔ شاہ زین نے سوچتے ہوئے چند لمحے اُسے دیکھا تھا۔
"چلیں میڈم۔ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔ فری ٹور گائیڈ۔"
عائشہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ کچھ جھجکی مگر شاہ زین کا انداز اتنا بے ضرر اور دوستانہ تھا کہ وہ ساتھ چل دی تھی۔ وہ جتنے شوق اور تجسس سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھی، شاہ زین کو اُس کا انداز تازگی کا احساس دے رہا تھا۔ کروز شپ کے ڈیک پر تھیمز کو دیکھتے ہوئے اُس نے اپنے شوق کا راز افشا کیا تھا۔
"میں نے کبھی اسلام آباد، نادرن ایریا اور کشمیر وغیرہ بھی نہیں دیکھا۔ اِن فیکٹ میں کبھی سندھ سے باہر ہی نہیں گئی۔"
"مطلب سیاحت کا شوق نیا ہے؟"
"نہیں شوق کی بات نہیں۔ بزی تھی شاید۔"
عائشہ نے سوچ کر جواب دیا تھا۔
"بزی ود؟"
"لائف۔ آئی تھنک۔" شاہ زین نے اُس کے جواب پر یوں سر ہلایا تھا جیسے سمجھ رہا ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کروز شپ سے وہ لندن آئی پہنچے تھے۔ لندن آئی کا ٹکٹ خریدتے ہوئے عائشہ نے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔
"پاس میں وہ سب انکلوڈڈ ہے جو ویسے بھی فری ہے۔ پتا نہیں اتنے پیسے کس چیز کے لیے۔ بکنگھم

پیلس کا ٹکٹ بھی خریدنا پڑا۔'' عائشہ نے کافی جلے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''جی بس کیا کیا جائے ؟ دنیا جھوٹی ،لوگ لٹیرے۔'' شاہ زین مصنوعی تاسف سے آہ بھر کر بولا تھا۔ عائشہ نے اُسے تھوڑا سا گھورا۔

''مذاق اُڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں لوگ پاؤنڈز میں کماتے ہیں۔ ہم وہاں روپوں میں کماتے ہیں۔ اتنے سارے روپوں کے اتنے سے پاؤنڈ بنتے ہیں۔'' اُس نے ہاتھ کے اشارے سے شاہ زین کو روپوں اور پاؤنڈ کا فرق سمجھایا تھا۔

صبح سے شام ہو چلی تھی اِس اجنبی کے ساتھ چلتے چلتے۔ مگر عجیب بات تھی۔ اجنبیت محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔

''تو آگے کا کیا پلان ہے؟ بس لندن ہی دیکھنا ہے؟''

''اصل میں تو پلان میرا فرینڈز کے ساتھ تھا۔ روڈ ٹرپ پر جانا تھا اسکاٹ لینڈ تک مگر ایک فیملی ایمرجنسی کی وجہ سے اُنہیں آسٹریا جانا پڑا۔ اب سوچتی ہوں کیا کروں۔'' وہ پرسوچ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''کل کا دن تو میں لندن ہی میں گزارنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد..... واٹ ڈو یو تھنک۔ آس پاس میں کون سا شہر ہے جہاں جانا چاہیے؟

''میرے خیال میں آپ کو نواحی علاقہ جات دیکھنے چاہئیں۔ حتیٰ اسکاٹ لینڈ بھی جانا چاہیے۔'' وہ بولا تھا۔

''پاکستان میں بھی کراچی سے باہر نہیں گئیں یہاں بھی لندن اور اس کے مضافات میں پھنسی رہیں گی۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ انگلینڈ کے جغرافیے اور ذرائع آمدورفت کے بارے سوال کیے تھے۔

''او کے ہیئر از آ ڈیل۔ مجھے گلاسگو میں ایک کام ہے۔ ہم ساتھ جا سکتے ہیں۔ بائے روڈ۔''

عائشہ فطرتاً خاموش اور کسی حد تک محتاط طبیعت تھی۔ فوراً گھلنا ملنا اُس کی فطرت میں نہ تھا اور صنف مخالف سے یہ جھجک کچھ زیادہ تھی۔ مگر اِس شخص میں جانے کیا بات تھی؟ اجنبیت محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ''انسٹنٹ کیمسٹری'' شاید ایسی ہی کسی بلا کا نام تھا۔ مگر پھر بھی اُس کی یہ پیشکش اُسے حیران کر گئی تھی۔ وہ اُس کے ساتھ مزید کیوں چلنا چاہتا تھا۔

''جائیں گے کیسے؟'' عائشہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا تھا۔

''آئی کین ڈرائیو۔''

''بس سے چلتے ہیں۔'' وہ چند لمحے سوچ کر بولی تھی۔ شاہ زین کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ بس میں کیوں جانا چاہتی تھی۔ مگر حیران اُس نے خود کو کیا تھا۔

''او کے دین بس اٹ از۔'' پھر وہ دونوں انٹرنیٹ پر بس کے شیڈول دیکھنے لگے تھے۔ شاہ زین نہیں جانتا تھا وہ یہ کیوں کر رہا تھا۔ انگلینڈ چھوڑنے کا جو فیصلہ اُس نے کیا تھا وہ اُس پر اب تک کنفیوز تھا۔ یہ ملک اب گھر جیسا لگنے لگا تھا۔ وہ صبح جو گھر سے نکلا تھا تو یکسوئی ہی کی تلاش میں تھا۔ مگر اب وہ انگلینڈ کے دوسرے کونے میں وہ کام کرنے کیوں جا رہا تھا جو شاید فون پر بھی ممکن تھا۔ اور وہ بھی بس میں؟ اِس بے ضرر مگر احمقانہ سے فیصلے کی وجہ اُس کے اندر کی کشمکش تھی؟ یا صرف یہ لڑکی؟ ہاں اتنا طے تھا کہ اُس کا ساتھ اُسے اچھا لگ رہا تھا۔ دس سال پہلے اُس نے ایک گھبرائی، پریشان حال آنسو بہاتی لڑکی کو دیکھا تھا۔ جسے اب دیکھ رہا تھا اُس میں بالیدگی تھی، اُس انسان کی طرح جس نے زندگی کے تلخ روپ بھی دیکھے ہوں۔ مگر اُس کی نگاہوں میں شوق زندہ تھا۔ دنیا میں خوب صورتی ڈھونڈ لینے کی جستجو باقی تھی۔ زندگی سے محبت قائم تھی۔ شاہ زین کو تجسس تھا وہ کہانی جان لینے کا، جو وہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

شاہ زین نے اُسے ''ٹربیول لائٹ'' کا مشورہ دیا تھا۔ کتنی دیر کشمکش و پیچ میں رہی تھی وہ پیکنگ کرتے ہوئے کہ زیادہ تو نہیں ہو گیا؟ مگر اگلے دن اُس کا

بھاری بھر کم بیگ پیک دیکھ کر حیران تھی۔ ''میرا خیال ہے میں نے کل کچھ سنا تھا ''ٹریول لائٹ'' فوائد کے بارے میں۔'' عائشہ نے چھیڑا تھا۔ ''سوری اِس سے لائٹ میں ٹریول نہیں کر سکتا۔'' وہ سر کھجاتے ہوئے بولا تھا۔

کھڑکی سے باہر دیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ سرسبز پہاڑ، خوبصورت وادیاں، بڑے بڑے کھیت، سرسبز چراہ گاہیں۔ عائشہ نے ایسا لینڈ سکیپ پہلی دفعہ دیکھا تھا سو وہ مبہوت سی دیکھے جا رہی تھی۔ چار گھنٹے میں وہ اپنے پہلے اسٹاپ پیک ڈسٹرکٹ پہنچے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد اُنھوں نے ہوٹل میں چیک ان کر کے سامان سے جان چھڑائی تھی۔ پھر شہر ایکسپلور کرنے نکلے تھے۔

''یہ شہر میں بھی پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔ یہاں سے گزرا ہوں لیور پول جاتے ہوئے مگر کبھی دیکھا نہیں۔'' وہ تفریحی مقامات انٹرنیٹ پر سرچ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ ''کنگسٹن پیلس ہے یہاں۔ وہاں تو آپ نے جانا ہوگا۔ اُس کا انٹیریر دیکھنے۔''

''نہیں بہت دیکھ لیے محلات۔ اب نو کنکریٹ۔'' عائشہ نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ ''راستے میں اتنی خوب صورت جگہیں تھیں۔ میرا اتنا دل کر رہا تھا اُتر کر دیکھنے کو۔''

''یہ ہو سکتا تھا میڈم۔ اگر آپ کو مجھ پر ٹھگ یا سیریل کلر ہونے کا شک نہ ہوتا۔'' وہ بظاہر سنجیدگی سے بولا تھا مگر آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔

''سنگین نتائج بھگتنے سے بہتر ہے بندہ بکثرت شک کرتا رہے۔'' عائشہ رسان سے بولی تھی۔

''واہ! آپ کی سمجھ داری کا تو میں فین ہو گیا ہوں۔'' اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر متاثر ہونے کی اوور ایکٹنگ کی تھی۔

''شکریہ۔ ذرہ نوازی۔'' عائشہ نے عاجزی دکھائی تھی۔ کچھ سوچ بچار کے بعد اُنھوں نے نیشنل پارک کا انتخاب کیا تھا۔

''سو اب تک کیا پسند آیا آپ کو انگلینڈ میں؟''

مان ٹور کی چوٹی پر بیٹھ کر نیچے کا نظارہ کرتے ہوئے شاہ زین نے اُس سے پوچھا تھا۔

''میرا خیال ہے۔ انگریز۔'' عائشہ نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''واؤ! دیٹ از انٹرسٹنگ۔''

''مطلب۔ باقی بھی مجھے بہت کچھ اچھا لگ رہا ہے۔ بڑے کمالات ہیں قدرت کے بھی اور انسانوں کے بھی۔ مگر یہ سب تو میں ایکسپیکٹ کر رہی تھی، تصویروں اور ویڈیوز میں دیکھ دیکھ کر۔ مگر انگریز مجھے لگتا تھا کچھ کولڈ، انڈفرنٹ سے ہوں گے۔ مگر یہاں لوگ مجھے بہت فرینڈلی اور وارم لگے۔ آپ کو کیا اچھا لگا تھا جب شروع میں آپ یہاں آئے تھے؟''

''ہمم۔ مشکل سوال ہے یہ تھوڑا۔''

''یہاں آ کر رہنا میرے لیے کچھ آزاد کر دینے والا تجربہ تھا۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا تھا۔

''جب آپ ایک سوشل ڈائمک سے نکل کر دوسرے میں جاتے ہیں نا۔ تو یا آپ آزاد محسوس کرتے ہیں، یا پھر کھویا ہوا۔ یا بیک وقت دونوں۔ میں نے آزاد محسوس کیا اپنے آپ کو۔ گو شاید اُس کا تعلق جگہ سے زیادہ میری اپنی زندگی کے تجربات سے تھا۔'' وہ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ ''ایم آئی میکنگ سینس ٹو یو؟ جو بھی میں کہنا چاہوں برباد کریں الفاظ میرے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے ایک مشہور گانے کی لائن دہرائی تھی۔

''ایک ہی وقت میں آزاد اور کھویا ہوا ہونا سمجھ سکتی ہوں میں۔'' وہ دور کہیں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ ''ویسے ایسے میوزک کا کوئی خاص ذوق نہیں میرا۔ مگر اِس لائن کی وجہ سے کافی سنا میں نے یہ گانا۔ بہت ہی کوئی ریلیٹ ایبل لائن ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''کیسا میوزک پسند ہے؟''

''سنتی رہتی ہوں۔ جو بھی نئے مشہور گانے چل رہے ہوں مگر پسند مجھے پرانے گانے ہیں۔ مطلب

بہت پرانے۔ بلیک اینڈ وائٹ بالی وڈ۔''
''اوکے۔کوئی خاص وجہ؟''

عائشہ نے سوچتے ہوئے سر ہلایا تھا۔''ہاں۔ میری دادی سنتی تھیں۔ جب تک وہ زندہ تھیں تب تک بالکل نہیں پسند تھے۔ مگر اُن کی ڈیتھ کے بعد جب کوئی پرانی دھن کان میں پڑتی تو لگتا دادی کہیں آس پاس ہیں۔ آہستہ آہستہ کمفرٹ میوزک بن گیا یہ میرے لیے۔ پتا نہیں کمفرٹ میوزک یہاں فٹ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔'' وہ ہنس کر بولی تھی۔''جیسے کمفرٹ فوڈ ہوتا ہے نا ویسے والا کمفرٹ میوزک۔'' اُس نے وضاحت کی تھی۔

''نہ بھی ہو تو کر لینا چاہیے۔ میکس سینس۔'' وہ لاپرواہی سے بولا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی سو اُنھوں نے واپسی کی راہ لی۔ ہلکی سی خنکی میں اِس اونچے نیچے سبزہ زار میں چلنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ مگر عائشہ کو کوئی ہلکی سی سرگوشی بتا رہی تھی کہ سارا کمال اِس منظر کا حصہ نہیں تھا۔ یہ اجنبی ہمراہی اِس سفر کا سب سے دل فریب حصہ تھا۔

اُن کا اگلا اسٹاپ ایڈنبرا تھا۔ بس کے بجائے اُنھوں نے ٹرین کا انتخاب کیا تھا۔ سو جلدی پہنچ گئے تھے مگر اب سامان کا مسئلہ تھا۔ جو ہوٹل اُنھوں نے آن لائن بک کیا تھا اُس میں جلدی چیک اِن کی سہولت نہیں تھی۔''اگر ہم سٹی کے اندر موو کرنے کے لیے کار ہائر کر لیں یہاں تو کافی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کمفرٹیبل ہوں تو۔'' وہ اُس سے پوچھ رہا تھا۔

عائشہ نے کچھ دیر سوچ کر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔''اوکے۔''

''آر یو شیور۔''

وہ پھر پوچھ رہا تھا۔''نو اِٹس فائن۔'' عائشہ نے کہا تھا۔ اُس نے جگہ جگہ مردوں کو عورت کی بنائی حدود کو چیلنج کرتے دیکھا تھا۔ ساتھ کام کرتی ہے تو دوستانہ رویہ کیوں نہیں رکھتی؟ اگر ساتھ ہنس مسکرا سکتی ہے تو بے ہودہ مذاق کیوں نہیں سن سکتی؟ اگر ہاتھ ملا رہی ہے تو کمر میں ہاتھ ڈالنے کو غلط سمجھنے کا حق کیسے رکھتی ہے؟ مگر یہ شخص اُس کی کھینچی حد کا احترام کر رہا تھا۔ بغیر اُس کے مستند ہونے یا نہ ہونے پر سوال اُٹھائے۔ کیا وہ واقعی اتنا مختلف تھا؟

وہ ایڈنبرا کا مشہور قلعہ دیکھنے آئے تھے جو پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ میں نارتھ انگلینڈ کی نسبت کافی سردی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں عائشہ کو اپنا ہلکا سا کارڈیگن ناکافی لگنے لگا تھا۔

''سردی لگ رہی ہے؟'' شاہ زین نے پوچھا تھا۔

''ہاں میرا خیال ہے مجھے کچھ گرم خریدنا چاہیے۔ میرے سویٹرز کراچی کی سردی کے حساب سے بنے ہیں''

''اوپر شاپس ہیں۔ مگر ابھی کے لیے جیکٹ مل سکتی ہے۔'' شاہ زین نے پیشکش کی تھی۔

''نہیں۔ سردی تو آپ کو بھی لگ سکتی ہے۔''

''میڈم! پرانی فلموں کا احمق ہیرو نہیں ہوں میں جو chivalry. کے مارے ٹھٹھرتا رہوں۔ اگر آپ کو جیکٹ چاہیے تو گاڑی سے دوسری نکال کر لے آتا ہوں۔''

''میں بھی نئے زمانے کی سیلف سفیشنٹ ہیروئن ہوں۔ تھوڑی سی سردی مینیج کر لوں گی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔ آگے دوکانیں تھیں۔ سڑک کے کنارے اسٹالز بھی لگے تھے اُس نے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ گرم کپڑے لے لیے تھے۔ مگر وہاں سے واپسی پر اُنہیں The cashmere shop کا فیکٹری آؤٹ لٹ نظر آیا تھا۔ غالباً کوئی ہائی اینڈ برانڈ تھا۔

''دیکھنا ہے؟ سیل لگائی ہے کشمیر والوں نے اسپیشل آپ کے لیے۔''

''دیکھ لیتے ہیں۔'' عائشہ بولی تھی۔ مگر اندر جا کر پتا چلا صرف دیکھنے کے لیے ہی ہے۔ دو سو پاؤنڈ کا ایک اسکارف۔ شاہ زین اپنے لیے ایک سویٹر پسند کر کے اُس کی طرف آیا تھا۔''کیا ہوا کچھ پسند

نہیں آیا؟''

''پسند تو کافی کچھ آیا۔ مگر خریدنے کے لیے نہیں۔'' عائشہ نے اُس کے ہاتھ میں موجود سویٹر کا پرائس ٹیگ پلٹ کر دیکھا تھا۔ ''چالیس ہزار کا ایک سویٹر۔ ناٹ فار می۔''

''چلیں پھر مس مینیملسٹ؟''

''چلیے مسٹر ہائی مینٹننس۔''

''کبھی کبھی میں کرنا چاہتی ہوں خود کو انڈر لج۔ مگر ہو ہی نہیں پاتا مجھ سے۔'' وہ دوکان سے نکلتے ہوئے ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''میں نے کچھ عرصہ فنانشلی کافی مشکلات دیکھی ہیں۔ وہ ٹائم شاید میرے دماغ میں پھنس گیا ہے۔''

''فنانشل اسٹرگل کیوں؟ آپ کے فادر کا تو بزنس ہے نا بحرین میں؟'' شاہ زین کو پوچھنے کے بعد احساس ہوا کہ سوال شاید زیادہ ذاتی ہوگیا۔

''سوری۔ آئی شڈنٹ ہیو آسکڈ مے بی''۔

اٹس اوکے۔ دراصل میری کچھ چوائسز سے میرے والد خوش نہیں تھے تو اُنھوں نے مجھے فنانشلی سپورٹ کرنا بند کر دیا۔ صرف انٹر تک تعلیم اور کسی خاص ہنر کے بغیر آگے کی اپنی تعلیم کا خرچ خود اُٹھانا مشکل تجربہ تھا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی تھی۔

''واؤ۔ یو سپورٹڈ یور سیلف اینڈ پیڈ فار یور ایجوکیشن؟ واؤ۔'' شاہ زین حیرت سے بولا تھا۔ ''کچھ ضرورت سے زیادہ امپریس ہو رہا ہوں میں۔''

آج اتنے دنوں کے بعد عائشہ کو اچھا پاکستانی کھانا نصیب ہوا تھا۔ نمک منڈی ایڈنبرا میں کچھ زیادہ ہی کھالیا تھا دونوں نے۔ اب ایک پارک میں واک کرتے ہوئے بسیار خوری کا اثر زائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ فاصلہ پر ایک شخص گھٹنوں کے بل بیٹھا سامنے کھڑی اپنی گرل فرینڈ کے لیے گانا گا رہا تھا۔ جس کا اختتام شادی کے لیے پرپوزل پر ہوا تھا۔ جو اُس لڑکی نے قبول کرلیا تھا۔ لڑکے کے کافی بے سرا ہونے کے باوجود عائشہ کو یہ منظر بہت کیوٹ لگا تھا۔

''ہیو ایور فال اِن لو'' شاہ زین نے پوچھا تھا۔

''ہاں۔ ڈیڑھ دفعہ۔''

''ڈیڑھ؟''

''ہاں۔ ایک دفعہ محبت بڑی بھرپور تھی۔ مگر جس سے کی وہ شاید اس کے قابل نہیں تھا۔ دوسری بار بندہ خاص تھا مگر محبت کو پنپنے کا موقع نہیں ملا۔ تو میں نے ملا کر ٹوٹل ایکسپیرینس ''ڈیڑھ'' کاؤنٹ کرلیا ہے۔'' عائشہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی تھی۔ ''آپ کو ہوئی؟''

''ہاں۔ ایک دفعہ۔''

''پھر کیا انجام ہوا؟''

''محبت بھی بھرپور تھی بندی بھی بہت خاص۔ مگر میرا خوف جیت گیا محبت سے۔''

''کیسا خوف؟ کمٹمنٹ فوبیا تو نہیں۔ جو اکثر فلرٹ لوگوں کو ہوتا ہے۔'' عائشہ نے مذاق میں کہا تھا مگر اس کی سنجیدہ شکل دیکھ کر غلطی کا احساس ہوا۔

''سوری۔''

''نہیں۔ اٹس اوکے۔ کچھ ایسا ہی مسئلہ تھا مگر اس لیے نہیں کہ میں اپنے آپشنز کلوز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اٹ واز سمتھنگ مور ریئل۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا تھا۔ عائشہ پوچھنا چاہتی تھی۔ کیا وہ پھر محبت کرسکتا تھا؟ کیا وہ اب بھی کمٹمنٹ سے ڈرتا تھا؟

''چلو کہیں کافی ڈھونڈتے ہیں۔ سخت ضرورت ہے مجھے۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ کچھ نہ پوچھ پائی۔

اُن کا اگلا اسٹیشن گلاسگو تھا۔ یہاں شاہ زین ایک سال گزار چکا تھا۔ اور اُس کا ایک اپارٹمنٹ بھی تھا جس کی سلسلے میں وہ یہاں آیا تھا۔

ایک دن وہاں گزارنے کے بعد اُنھوں نے واپسی کی راہ لی تھی۔ ٹرین میں لندن تک کا سفر محض پانچ گھنٹے کا تھا۔ عائشہ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔ سفر کتنا بھی خوش گوار کیوں نہ ہو، سفر ہوتا ہے۔ اتنے

دن سے وہ حالت سفر میں تھی۔ یقیناً تھک چکی تھی۔ تھک تو وہ بھی گیا تھا مگر پھر بھی جی نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ سفر ختم ہو۔ وہ چھ دن سے بیگ پیک اٹھائے کیوں گھوم رہا تھا؟ اِس کا جواب صاف تھا۔ اُس نے اُس سوئی ہوئی لڑکی پر ایک نظر ڈالی تھی۔ بے ترتیب لٹیں اُس کے موہنے سے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ انہیں سنوار لینے کا حق چاہتا تھا۔ اِس سلجھی ہوئی سنبھل سنبھل کر چلنے والی لڑکی کو اپنی محبتوں سے بگاڑ لینے کا حق چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر کبھی لڑکھڑایا تو یہ دھان پان سی لڑکی سنبھال لینے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

لندن پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی۔ اُنھوں نے ایک ہی ٹیکسی لی تھی۔ پہلے عائشہ کو اُس کے ٹھکانے پر ڈراپ کیا تھا۔ ''او کے پھر کل ملتے ہیں''۔ شاہ زین نے کہا تھا۔ عائشہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرسوں اُس کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ بہت سارے کام کرنے تھے۔ مگر واپس جانے کے خیال سے کیوں دل ڈوب رہا تھا۔ بہت اچھا وقت گزرا تھا یہاں مگر یہ اُس کا گھر تو نہیں تھا۔ یہ اُس کی زندگی تو نہیں تھی۔ یہ اجنبی اُس کا ہم سفر تو نہیں بن سکتا تھا ہمیشہ کے لیے۔ وہ کیا سوچنے لگی تھی۔ کافی دیر وہ وہیں کاؤچ پر یاسیت سے اوندھی پڑی رہی۔ پھر کسی طرح خود پر زبردستی کر کے نہا کر چینج کیا۔ کپڑے جو تقریباً سارے ہی گندے ہو چکے تھے واشنگ مشین میں ڈالے۔ مگر دماغ سے ایک لمحے کے لیے اُس شخص کا تصور محو ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ فون اُٹھا کر اُسے میسج کرنے کا سوچا۔

''ہنہ! کیا سوچے گا کتنی ڈیسپریٹ بندی ہے۔'' خود کو ڈپٹا۔ مگر پھر فون بجا دوسری طرف وہی تھا جس کی آواز سننے کو دل مرا جا رہا تھا۔

''بہت تھکی ہوئی ہو۔'' اُس نے پوچھا تھا۔

''نہیں ٹھیک ہوں۔''

''چلو پھر ڈنر پر چلتے ہیں۔''

''او کے۔'' عائشہ نے لمحے بھر کو سوچ کر جواب دیا تھا۔ مگر فون رکھتے ہی اُسے یاد آیا کہ کپڑے تو سارے واشنگ مشین میں تھے۔ کچھ سوچ کر شیریں کی وارڈروب کا رخ کیا تھا۔ مگر وہ اُس سے لمبی بھی تھی اور شادی کے بعد وزن بھی کافی بڑھا لیا تھا۔ بہت تلاش بسیار کے بعد ایک کم لمبی چوڑی شرٹ اور ٹراؤزر جسے شاید شیریں کیپری کے طور پر پہنتی تھی، نکال لیا۔

پہن کر آئینہ دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی۔ عام حالت میں وہ خوش شکل ہی شمار ہوتی تھی۔ مگر ایسی کوئی ماہ جبین بھی نہ تھی کہ اتنے دنوں کی تھکن اور ان بے ڈھنگے کپڑوں کے ساتھ اچھی لگتی۔ مگر یاسیت میں ڈوبنے کا زیادہ موقع اُسے نہیں ملا تھا۔ فون بجا تھا۔ شاہ زین نیچے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اُسے ایک مہنگے فائن ڈائننگ ریسٹورنٹ میں لایا تھا۔ وائٹ شرٹ پر قیمتی سیاہ جیکٹ پہنے وہ اِس ماحول کا حصہ لگ رہا تھا۔ عائشہ کو اپنے کچھ بے ڈھنگے حلیے کا زیادہ ہی احساس ہونے لگا تھا۔ خود بیٹھنے سے پہلے شاہ زین نے اُس کے لیے کرسی پیچھے کی تھی۔

''بائے داوے آئی لائیک یور فیشن سینس۔ ویری انٹرسٹنگ۔'' وہ شرارت سے بولا تھا۔ وہ جو اتنی دیر سے سیلف کانشس ہو رہی تھی ہنس دی۔

''جب آپ کے سارے کپڑے واشنگ مشین میں ہوں، اور آپ کو اپنی ایک لمبی چوڑی فرینڈ کی الماری سے کچھ چرا کر پہننا پڑے تو ایسے اسٹائل نکل ہی آتی ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

مینیو کارڈ آیا تو عائشہ نے اپنے حیرت سے کھلے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ مگر شاہ زین کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ سمجھ رہا تھا اُس کی حالت۔

Just let me play the man. (مجھے بل دے کر مرد بننے کا موقع دیں)۔ وہ شرارت سے مسکرا کر بولا تھا۔

''شیور۔ میں نے اپنے اندر کی فیمنسٹ کو بالکل اندھا بہرا کر دیا ہے ابھی کے لیے۔ ویسے بھی میرے حلیے سے یہی لگ رہا ہے کہ آپ کسی ہوم لیس کو کھانا کھلانے لائے ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔ ''سو باوجود اس کے کہ یہ ڈیٹ نہیں ہے۔ آپ

ہی کا پے کرنا بنتا ہے۔''

It's not a date only if you don't want it to be . (یہ ڈیٹ نہیں ہے صرف اگر تم ایسا نہیں چاہتی۔'') وہ سنجیدگی سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا اور پھر مینیو کارڈ پر جھک گیا تھا۔ عائشہ اُس کی بات میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ اگر یہ ڈیٹ تھی تو تکنیکی طور پر یہ اُس کی زندگی کی دوسری ڈیٹ تھی۔ اُس کی پہلی ڈیٹ پر شہریار نے اُسے انگوٹھی پہنائی تھی۔ اُس کے ساتھ شادی کے پلان بنائے تھے۔ مگر وہ تو آزاد فضاؤں کا باسی تھا۔ اُس کے لیے ''ڈیٹ'' کے معنی غالباً اُس سے مختلف تھے۔ شاہ زین نے اُس کے لیے بھی خود ہی آرڈر کیا تھا۔ مگر اِن لمحوں میں وہ اتنا کچھ محسوس کر رہی تھی کہ زبان پر رکھی چیز کا ذائقہ محسوس کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ واپسی پر وہ دونوں ہی خاموش تھے۔ شاہ زین نے ہاتھ بڑھا کر میوزک آن کیا تھا۔ علی سیٹھی کی آواز ہوا میں بکھر گئی تھی۔

آج جانے کی ضد نہ کرو
یوں ہی پہلو میں بیٹھے رہو
وقت کی قید میں زندگی ہے مگر
چند گھڑیاں یہی ہیں جو آزاد ہیں
اِن کو کھو کر میری جان جاں
عمر بھر نہ ترستے رہو۔

عائشہ نے چور نظروں سے شاہ زین کو دیکھا تھا۔ وہ سنجیدگی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ عائشہ نے آنکھیں بند کر کے اِس لمحے کے سحر کو محسوس کیا تھا۔

وہ اُسے شیریں کے گھر ڈراپ کر کے چلا بھی گیا تھا۔ مگر عائشہ کو کوئی چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ شائد اِس سحر سے وہ کبھی نہ نکل پائے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا وہ اِن لمحوں کی تنہا اسیر تھی؟

صبح وہ اپنا سب سے اچھا جوڑا پہن کر تیار ہوئی تھی۔ کپڑے وہ اچھے ہی پہنتی تھی۔ اچھی کوالٹی کے فیشن کے مطابق سلے ہوئے۔ رنگوں اور پرنٹس کے انتخاب میں تو یوں بھی اُسے کمال حاصل تھا۔ مگر آج اُسے اپنا پسندیدہ جوڑا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ عام طور پر وہ میک اپ نہیں کرتی تھی اور چٹ پٹ تیار ہوتی تھی۔ مگر آج تین بار تو لپ اسٹک صاف کر کے دوبارہ لگا چکی تھی۔ باقی بھی ہلکا پھلکا میک اپ کیا تھا۔ اور اب لگ رہا تھا کہ کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ لپ اسٹک کا رنگ شاید گہرا تھا۔ اُس نے پھر ٹشو اُٹھا لیا تھا۔ زبردستی خود کو دوبارہ لپ اسٹک صاف کرنے سے روکا تھا۔ مگر پھر شاہ زین کی آنکھوں میں ستائش دیکھ کر دل جھوم اُٹھا تھا۔ آج وہ زیادہ تر مارکیٹس میں گھوم رہے تھے۔ اُس نے کچھ تحائف خریدے تھے۔ کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنے لیے۔ مگر وقت کو تو مانو پر لگے ہوئے تھے۔ شام ڈھلنے لگی تھی اور شاید یہ آخری شام تھی اُس کی سنگت میں۔

''شاہ زین۔'' کسی کے بلانے پر وہ دونوں پلٹے تھے۔ عائشہ نے دیکھا تو ایک انتہائی خوب صورت، طرح دار حسینہ شاہ زین کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''علینہ!'' شاہ زین بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف گیا تھا اور اُس کو گلے لگایا تھا۔

''کہاں ہوتے ہو تم؟ گلاسکو میں کب ہوتے ہو؟ لندن کب آتے ہو؟ پاکستان کب چلے جاتے ہو؟ کوئی پتا ہی نہیں چلتا۔'' وہ بہت اپنائیت سے شکوہ کر رہی تھی۔ پھر اس کی نظر عائشہ پر پڑی تھی۔ تو اُس نے مسکراتے ہوئے شاہ زین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''یہ عائشہ ہے۔ آئینو فرینڈ۔'' شاہ زین نے تعارف کرایا تھا۔

''ہائے آئی ایم علینہ۔'' وہ دوستانہ انداز میں ہاتھ بڑھا کر بولی تھی

''نائس ٹو میٹ یو۔'' عائشہ نے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔

''تم کب تک جسٹ فرینڈز کے ساتھ پھرتے رہو گے؟'' اُس نے بے تکلفی سے شاہ زین کے بازو پر چپت رسید کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

عائشہ کے دل میں برچھی سی چبھی۔ اور کتنی

''جسٹ فرینڈز'' تھیں، جن کے ساتھ وہ گھومتا پھرتا تھا؟ شاہ زین اور علینہ باتوں میں اتنے مگن ہو گئے تھے کہ شاید یہ بھول گئے تھے کہ وہ بھی تھی وہاں۔ ساتھ کھڑے کتنے پرفیکٹ لگ رہے تھے۔ شاہ زین سے وہ کوئی دو تین انچ ہی چھوٹی ہوگی۔ بلیک سلیولیس جمپ سوٹ اور ہائی ہیل میں وہ کسی ماڈل سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ دودھیا رنگت اور متوازن نقش کسی آرائش کے محتاج نہیں تھے۔ ساتھ کھڑے کتنے پرفیکٹ لگ رہے تھے دونوں۔ خوش شکل، خوش لباس سوفیسیکیٹڈ۔ اور وہ؟ وہ تو اُن جیسی تھی نا اُن کی دنیا کی۔ پھر وہ کیا خواب بننے لگی تھی۔ ''شاہ زین، وہ پیچھے ایک شاپ میں مجھے کچھ پسند آیا تھا۔ میں وہ لے ہی آئی ہوں۔'' وہ اِس وقت صرف وہاں سے ہٹنا چاہتی تھی۔ اُسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس سمت جا رہی تھی۔ اپنے اندر کی اُمید و یاس کی کشمکش میں گم۔ کافی دیر چلنے کے بعد اُس نے اردگرد دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کتنی دور آ گئی تھی۔ واپس جانے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فون نکالا تو بیٹری ڈیڈ۔ کافی دیر وہیں گھوم پھر کر واپسی کا رستہ ڈھونڈتی رہی۔ پھر مایوس ہو کر ایک ٹیکسی روکی اور شیریں کے گھر کا ایڈریس بتا کر بیٹھ گئی۔ عجیب بے بسی تھی۔ غصہ تھا۔ مگر کس پر؟ شیریں کے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو انٹرنس پر لگے شیشے میں خود پر نظر پڑی۔ مسکارا آنکھوں کے گرد پھیل چکا تھا۔ آنکھوں کے کنارے لال تھے۔ اُس ماہ جبین کا سراپا یاد آیا تو اپنا آپ بہت عام سا لگا۔ پھر اُسے لگا آئینے میں آج کی عائشہ نہیں تھی۔ انیس بیس سال کی لڑکی کھڑی تھی جو خود میں وہ نقص ڈھونڈ رہی تھی جس کی وجہ سے اُس کا محبوب اُسے ٹھکرا رہا تھا۔ کیا وہ اتنی لمبی مسافت کے بعد بھی پھر وہیں جا کھڑی ہوئی تھی۔ کتنے اعتماد سے اُس نے شائستہ آنٹی سے کہا تھا کہ وہ ایک شخص کے ساتھ کی خاطر اپنی دنیا چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اور اِس شخص کی خاطر؟ وہ لمحے میں سب تیاگ سکتی تھی۔ مگر وہ تو شاید اُس کے ساتھ کا طلب گار تھا ہی نہیں۔ وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

موبائل چارج کر کے دوبارہ آن کیا تو اُس کے کئی میسجز تھے۔ اُس نے کال کی۔

''کہاں ہو یار تم؟'' وہ جھلا کر بولا تھا۔

''سوری۔ راستہ بھول گئی تھی اور فون بھی بند ہو گیا تھا میں تو گھر آ گئی وہیں سے۔''

''اوکے۔ اچھا میں علینہ کی طرف جا رہا ہوں تھوڑی دیر میں کال کرتا ہوں۔'' اُس نے کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔ عائشہ کتنی دیر وہیں بیٹھی خالی فون کی اسکرین کو گھورتی رہی۔ رات ڈھائی بجے کی فلائٹ تھی اُس کی۔ جس کا مطلب تھا اُسے ساڑھے دس تک نکل جانا چاہیے تھا ایئرپورٹ کے لیے۔ اُس کے دل میں اُمید تھی کہ شاید شاہ زین اُسے ایئرپورٹ تک ڈراپ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ پیکنگ کرنے میں مصروف ہو گئی مگر فون سارا ٹائم آنکھوں کے سامنے تھا۔ آخر فون آ ہی گیا۔

''تم ریڈی ہو جاؤ ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔'' وہ بیک گراؤنڈ میں شور کی وجہ سے زور سے بولا تھا۔

عائشہ نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے۔ ''ڈنر کے لیے تو دیر ہو گئی ہے۔''

''کیا؟'' اُسے شور کی وجہ سے شاید سنائی نہیں دیا تھا۔ عائشہ نے پھر سے دوہرایا تھا۔

''اوکے۔ چلو پھر صبح ملتے ہیں۔'' پھر عائشہ نے کسی اور کی آواز سنی تھی جو اُسے بلا رہا تھا کہ کیک کٹنے والا ہے۔ ''بہت شور ہے یہاں آواز نہیں آ رہی۔'' اُس نے عائشہ کی بات سنے بغیر ہی فون رکھ دیا تھا۔ اُسے یاد ہی نہیں تھا کہ اُس کی آج کی فلائٹ ہے؟ عائشہ نے خود کال کرنے کا سوچا۔ پھر میسج کر دیا۔ وہ اِس وقت بزی تھا۔ اُس نے اپنی پیکنگ فائنل کی پھر ڈبل روٹی پر مکھن لگا کر ڈنر کیا۔ ساڑھے نو ہو چکے تھے۔ ابھی تک کوئی ریپلائی نہیں آیا تھا۔ اُس نے فون کیا۔ مگر دو تین بار کی کوشش کے باوجود اُس نے نہیں اُٹھایا تھا۔ دو تین گھنٹے اُس کے ساتھ اور بھی گزر جاتے تو کیا ہوتا۔ اس نے روتے ہوئے دل کو

ڈپٹا تھا۔ شاید کوئی پھر ملنے کی اُمید کوئی رابطہ رہ جاتا، دل نے دہائی دی تھی۔ تو کیا ہوتا؟ کٹھور دماغ نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ایسے رابطے تو اُس کے جانے اور کتنی لڑکیوں سے تھے۔ حقیقت کی دنیا میں تو اُسے جانا ہی تھا۔ تو پھر جلدی کیوں نہیں۔ وہ ٹیکسی سے ایئرپورٹ آگئی تھی۔ دماغ کی تمام تر دلیلوں کے باوجود دل منتظر رہا۔ آخر اُس نے انگلینڈ کی سم نکال کر پاکستانی سم ڈالنے سے پہلے ایک آخری بار اُسے کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر بے سود۔ بالآخر ایک الوداعی میسج لکھا۔ اور فون بند کر دیا۔

اُسے واپس آئے مہینہ ہو چکا تھا۔ سب ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ تو پھر اتنا ادھورا اور نامکمل کیوں لگ رہا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی خود کو باور کرا رہی تھی کہ یہی تھی اُس کی زندگی۔ اور وہ سب اُسے ایک خوبصورت یاد کی طرح یاد رکھنا تھا۔ مگر دل تھا کہ چاند مانگ رہا تھا۔ آنے کے ایک ہفتے بعد اُس نے شاہ زین کے نمبر پر کال کی تھی مگر فون نہیں اُٹھایا گیا تھا۔

''تم جب سے واپس آئی ہو بجھی بجھی ہو؟'' نتاشا نے آخر کار پوچھ ہی لیا تھا۔

''آئی میٹ سم ون سپیشل۔''

''کیا۔'' نتاشا چیخی تھی۔ ''واؤ سیریسلی''۔

''زیادہ ایکسائٹڈ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔'' اُس نے خشک لہجے میں نتاشا کا شوق ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر ساری کہانی گوش گزار کر دی۔

''تو بے وقوف تم نے واپس آ کر اُس سے کانٹیکٹ کیوں نہیں کیا۔ اُس کے پاس تمہارا نمبر نہیں تھا یہاں کا۔ تمہارے پاس تو تھا۔''

''کیا تھا۔''

''ہاں ایک ہفتے کے بعد۔ اور وہ بھی ایک دفعہ۔ کیا پتا مس ہو گیا ہو تمہارا میسج اور کال..... تم پہلے کبھی مجھے اتنی ڈمب نہیں لگیں۔'' نتاشا نے اُس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔

''اگر کانٹیکٹ ہو بھی گیا تو کیا ہو گا؟ ہم الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔'' وہ مایوسی سے بولی تھی۔

''اچھا! انگلینڈ کسی دوسری دنیا میں شفٹ ہو گیا ہے؟''

''نہیں یار مسئلہ صرف جغرافیائی نہیں ہے۔ وہ میری لیگ سے بھی باہر تھا۔''

''کیسے؟''

''پیسہ، تعلیم، شکل صورت ہر لحاظ سے۔''

''سیریسلی۔ اتنا ہینڈسم تھا؟'' نتاشا نے شرارت سے پوچھا تھا۔

''تھا تو۔'' عائشہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کیا پتا تمہیں ہی لگا ہو۔''

''ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ کہ تم بھی اُسے بہت خاص لگی ہو۔ آخر کچھ تو تھا جو وہ چیونگم بنا تمہارے ساتھ سارے انگلینڈ میں مارا مارا پھرتا رہا۔'' نتاشا اُس کے دل میں پھر آس جگا رہی تھی۔ ''فون کرو اُسے اور دیکھو۔ اِف اِٹ ہیز دا پوٹینشل ٹو گو سم ویئر۔''

عائشہ کے جواب میں مایوس شکل بنانے پر نتاشا نے اُسے کشن اُٹھا کر مارا تھا۔ عائشہ وہی کشن منہ پر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ مگر پھر کچھ نتاشا کی باتوں کا اثر تھا کچھ دل کا زور۔ اُس نے شاہ زین کا نمبر ملایا تھا۔ مگر اب تو نمبر ہی بند جا رہا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ یونہی بیٹھی جانماز کے ڈیزائن پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ پھر بے اختیار اپنے رب سے اسے مانگ بیٹھی۔

اگلے دن وہ شوروم میں اکرم کو ہدایات دے رہی تھی کہ دروازے سے اندر آتے شخص کو دیکھ کر الفاظ ہونٹوں پر منجمد ہو گئے تھے۔ کیا یہ خواب تھا۔ اگر تھا تو بہت ہی حسین۔ وہ چلتا ہوا اُس کے سامنے آ رکا تھا۔

''آپ یہاں کیسے؟''

''کوئی کسی کو ڈھونڈنا چاہے، رابطہ کرنا چاہے، تو کوئی رستہ نکل ہی آتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا

''چاہنا شرط ہے۔'' انداز میں کچھ خفگی بھی تھی۔ مگر عائشہ بہت کھل کر مسکرائی۔ بہت دنوں بعد۔ وہ اُسے

اپنے آفس میں لے آئی تھی۔ وہ خاموشی سے اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کو اُس کی خاموشی نروس کرنے لگی۔

''کچھ کہیں۔'' وہ نروس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

''آئی مسڈ یو۔'' وہ بولا تھا۔ عائشہ کی مسکراہٹ اور گالوں کا رنگ مزید گہرا ہوگیا تھا۔ مگر اتنا کافی نہیں تھا شاہ زین کے لیے۔ اُس نے ابرو چڑھا کر جھلائے ہوئے انداز میں اُس کی طرف دیکھا تھا جیسے جواب مانگ رہا ہو۔ ''میں نے بھی۔''

''شادی کروگی مجھ سے؟'' عائشہ اُس کی بات پر حیران رہ گئی تھی۔

''اوکے یہ کچھ زیادہ ہوگیا۔'' وہ اپنے دوستانہ سے انداز میں پلٹتے ہوئے بولا تھا۔ ''تم اتنا نہیں جانتیں مجھے ابھی کہ ہاں کردو۔ ٹیک یور ٹائم۔''

''آپ مجھے اتنا جانتے ہیں کہ شادی کے لیے پروپوز کریں؟''

''تو بتاؤ کیا جاننا چاہیے مجھے۔'' وہ کرسی پر چوڑا ہوکر تسلی سے بیٹھ گیا۔

عائشہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہاں سے شروع کرے۔

''میری ماں شرافت ہو یا امارت کسی بھی روایتی پیمانے پر پوری نہیں اُترتی۔ مگر وہ میری ماں ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ میرا باپ مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا کیوں کہ......''

''اگر مجھے اللہ نے کبھی ایسی بیٹی دی۔'' وہ اُس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔ ''تو آئی ول بی آ ویری پراؤڈ فادر۔''

عائشہ نے چند لمحے بے یقینی سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا تھا۔ اُن سب باتوں میں سے جو وہ ابھی کہہ سکتا تھا۔ اُس نے بھی کہنے کے لیے کیا چنا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کو کہتی آئی تھی کہ اُسے کسی کی سند کی ضرورت نہیں ہے جب وہ جانتی ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔ تو پھر ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ منزل پر وہ ابھی ابھی پہنچی ہے۔ بہت لمبی مسافت کی تھکن آنسو بن کر اُمڈ آئی تھی۔ وہ کھل کر روئی تھی ہچکیوں کے ساتھ۔ شاہ زین نے اُسے نہیں روکا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر ٹیبل پر رکھے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''آؤ تمہیں دکھاتا ہوں میں پاکستان کیوں شفٹ ہو رہا ہوں؟''

''تم پاکستان شفٹ ہو رہے ہو؟''

ہاں۔ تمہیں بتایا نہیں تھا میں نے؟''

''نہیں یہ بتایا تھا کہ لندن سے کہیں شفٹ ہو رہے ہو۔''

''ہاں۔ جیسے تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری فلائٹ دن کے دو بجے کی ہے یا رات دو بجے کی۔'' وہ دونوں ہی اب مسکرا رہے تھے۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ایک عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ جس کے باہر لکھا تھا ''خدیجہ حیدر ووِمن ویلفیئر سینٹر'' عائشہ نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ ''خدیجہ حیدر میری مدر کا نام تھا۔'' پھر اُس نے آہستہ آہستہ اُسے سب بتایا تھا اپنے اور اپنے ماں باپ کے بارے میں۔ ''یہ ادارہ گھریلو تشدد کا شکار خواتین کو سپورٹ فراہم کرے گا۔ قانونی، معاشی طور پر انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد کرے گا۔ انگلینڈ میں رہ کر میں یہ کام اتنے ایفیکٹولی نہیں کرسکتا تھا۔''

سینٹر دیکھنے کے بعد اب وہ دونوں باہر بڑھ رہے تھے۔ ''ویسے آئی نو یو آ لٹل مور دین یو تھنک۔ وہ تمہارا بانگڑو سا کزن میرا روم میٹ تھا۔''

عائشہ نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔ ''اُس نے اسکرین سیور پر تمہاری تصویریں لگائی ہوئی تھیں۔ مگر دو بار اِن پر نظر بھی دی تھیں میں نے تمہیں پہلے۔ پھر تم انگلینڈ میں نظر آئیں تو میں نے سوچا پتا کروں۔ آخر بار بار یہ لڑکی مجھے کیوں نظر آتی ہے۔''

''پھر پتا چلا؟'' عائشہ نے شرارت سے پوچھا تھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' شاہ زین ہنستے ہوئے بولا تھا۔

☆☆

پھر جی اُٹھے ہیں جس سے وہ امکان تم نہیں
اب جو بھی کر رہا ہے یہ احسان تم نہیں

مجھ میں بدل رہا ہے جو اک عالمِ خیال
اس لمحۂ جنوں کے نگہبان تم نہیں

بجھے ہوئے چراغ کی لو جس نے تیز کی
وہ اور ہی ہوا ہے مری جان! تم نہیں

پھر یوں ہوا کہ جیسے گرہ کھل گئی کوئی
مشکل تو بس یہی تھی آسان تم نہیں

ہم نے سُنی نہیں ہے صدائے شکستِ دل
ہم جھیلتے رہے ہیں یہ نقصان تم نہیں

تم سے بس انتباہ کی صورت نکل پڑی
جس سے ہوئے تھے وعدہ و پیمان تم نہیں

خوش فہمیوں کی بات الگ ہے مگر یہ گھر
جس کے لیے سجا ہے وہ مہمان تم نہیں

سلیم کوثر

کوچۂ بے حسی

ہم سفر پہ جو آج نکلے ہیں
راستے اجنبی سے لگتے ہیں

لوگ پہلے سے اب نہیں ہیں یہاں
چاہتیں آخری دموں پہ ہیں

زندگی بھی تھکی تھکی سی ہے
سانس حیراں ہیں اب تلک خود پر

کیسے چلتی ہے یہ ویراں دل میں
کیسے جیون تمام ہونے تک

یہ سفر بار بار کرنا ہے
گویا اس کوچۂ بے حسی میں ہمیں

روز جینا ہے روز مرنا ہے

سباس گل

''اب روٹی اس تالے سے رگڑنی ہے، اب ابا جی والی موجیں ختم۔''

پریشانی

ایک شخص چھینک روکنے کے لیے طرح طرح کے منہ بنا رہا تھا، ساتھ بیٹھے آدمی نے کہا۔ ''بھائی! آپ چھینک کیوں نہیں لیتے؟'' اس آدمی نے کہا۔ ''بھائی میری بیوی نے کہا تھا جب تمہیں چھینک آئے تو سمجھو کہ میں بلا رہی ہوں۔''

دوسرے شخص نے کہا۔ ''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔''

پہلا شخص۔ ''عجیب احمق آدمی ہو بھئی! میری بیوی مر چکی ہے۔''

وجہ

جج: ''گھر میں مالک کے ہوتے ہوئے تم نے چوری کیسے کی؟''

چور: ''صاحب آپ کی نوکری بھی اچھی ہے، تنخواہ بھی اچھی ہے۔ پھر آپ یہ سب سیکھ کر کیا کرو گے؟''

ناراضی

لفٹ چلنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ اتنے میں ایک عورت چھوٹے بچے کو گود میں لیے ہوئے لفٹ میں داخل ہوئی۔ میں نے لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلا یا دوسرا؟''

عورت منہ پھلائے ہوئے غصے سے بولی۔ ''میرا نہیں ہے، پھوپھو ہوں اس کی۔''

حرکتیں

دادا پوتے سے کہتے ہیں کہ ''ایک زمانہ تھا جب

تسلی

ٹرین نہایت سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ اس دوران گارڈ ایک کمپارٹمنٹ میں آیا اور بولا۔ ''جو مسافر بھاگ پورہ جا رہے ہیں انہیں نہایت افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ بھاگ پورہ اسٹیشن تباہ ہو گیا ہے، وہاں آگ لگ گئی ہے۔''

ایک لمحہ خاموشی رہی! پھر ایک مسافر دوسروں کو تسلی دینے کے انداز میں بولا.....

''پریشان نہ ہو جب تک ہم بھاگ پورہ پہنچیں گے اسٹیشن دوبارہ تعمیر ہو چکا ہوگا۔''

ضرورت

امپائر نے ایک کھلاڑی کو ایل بی ڈبلیو قرار دے دیا۔ کھلاڑی بہت خفا ہوا۔ پویلین کی طرف جاتے ہوئے سفید کوٹ والے شخص سے مخاطب ہوا۔

''جس طرح تم نے مجھے ایل بی ڈبلیو دیا ہے، اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہیں عینک کی ضرورت ہے۔''

''عینک کی ضرورت مجھے نہیں تمہیں ہے۔'' سفید کوٹ والے نے جواب دیا۔ ''کیونکہ میں امپائر نہیں آئس کریم والا ہوں۔''

سواسیر

''شیخ صاحب کے گھر ایک دیسی گھی کا ڈبہ تھا مگر کسی کو کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کھانے کے وقت ہر فرد ڈبے کے اوپر روٹی چپڑ لیتا اور یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ایک دن شیخ صاحب فوت ہو گئے ان کے بیٹے نے وہ ڈبہ الماری میں رکھا اور تالا لگا دیا اور کہا۔

میری جیب میں صرف دو روپے ہوتے تھے اور میں مارکیٹ سے دودھ، دہی، گھی، دالیں اور سبزیاں لے آتا تھا۔"

جواباً پوتا کہتا ہے۔" اب یہ حرکتیں نہیں چلتیں، اب ہر جگہ کیمرے لگ گئے ہیں۔"

ڈر

ایک عورت نے اپنی سہیلی کو فون کیا تو وہ بہت رو رہی تھی۔ پوچھنے پر کہنے لگی۔" آج میرے میاں آفس جانے لگے تو میں نے کہا کہ دو ہزار روپے دیتے جائیں۔ مجھے میک اپ کروانے جانا ہے۔ میاں کچھ دیر تک میرے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے اور پھر جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کے دیتے ہوئے کہا۔" یہ پیسے رکھ لو، دو سے کچھ نہیں ہوتا۔"

ذہانت

اسکول کے طلبا عجائب گھر کی سیر کر رہے تھے۔ گائیڈ نے انہیں ایک مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

" دوستو! یہ مزدا نامی دیوی کا مجسمہ ہے۔"

طالب علموں نے اس مجسمے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر ایک طالب علم نے اپنی دانست میں بڑا عقل مندانہ سوال کیا۔" کیا مزدا دیوی شادی شدہ تھی؟"

" نہیں نہیں۔" گائیڈ نے حیرت سے فوراً جواب دیا۔" وہ تو ذہانت کی دیوی تھی۔"

مادری پدری

جوش ملیح آبادی نے پاکستان میں ایک بہت بڑے وزیر کو اردو میں خط لکھا۔ وزیر صاحب نے اس کا جواب انگریزی میں ارسال فرمایا۔ جوش نے انہیں جواب الجواب لکھا۔

" جناب والا! میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا۔"

غلط فہمی

میں اور ابا پہلی بار شہر گئے۔ ایک شاپنگ مال میں لفٹ دیکھی۔

" میں نے ابا سے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے؟ ابا نے زندگی میں پہلی بار سلور کی دیواریں بٹن دبانے سے کھلتے دیکھی تھی۔ انہوں نے صاف بتایا کہ انہیں اس چیز کا علم نہیں۔ میں اور ابا کھڑے لفٹ کو دیکھتے رہے۔ اس دوران ایک بڑھیا وہیل چیئر پر بیٹھی آئی بٹن دبایا اور سلور کی دیواریں چھٹیں اور ایک چھوٹا سا کمرہ نمودار ہو گیا۔

وہ عورت اپنی وہیل چیئر پر بیٹھی اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔ بند دروازے کی ایک جانب نمبر چلنے لگے۔ ایک دو تین چار کچھ ہی وقفے کے بعد وہی نمبر الٹے چلنے لگے۔ چار، تین، دو، ایک دروازہ کھلا اور ایک سنہرے بالوں والی بیس سالہ حسینہ کیٹ واک کرتی باہر نکلی۔ جذبات سے سرشار ابا نے مجھے تھام لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

" جا اوئے جلدی اپنی ماں نو پھڑ کے لیا۔"

گھبراہٹ

صبح آفس جاتے ہوئے شوہر نے بیوی کی خیریت دریافت کی۔ اس کے سر میں درد تھا۔ آفس پہنچ کر شوہر نے بیوی کو میسج کرنا چاہا۔

" کیسا ہے سر درد؟" مگر غلطی سے ٹائپ ہو گیا۔

" کیسی ہو سر درد؟"

شام کو آفس ٹائم ختم ہونے تک شوہر کے سر میں درد ہو گیا یہ سوچ سوچ کر کہ" اب وہ کیسے گھر جائے گا۔"

☆☆

شگفتہ جاہ

یادگار حوالے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک بار) فرمایا۔

"اے عورتوں کی جماعت! تم (خاص طور پر) صدقہ دیا کرو اور زیادہ استغفار کیا کرو کیونکہ دوزخیوں میں زیادہ تعداد میں نے عورتوں کی دیکھی ہے۔"

ان میں سے ایک ہوشیار عورت بولی۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم دوزخ میں زیادہ جائیں گی؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تمہیں (یا ہم گفتگو میں) لعنت کرنے کی زیادہ عادت ہوتی ہے۔ اور تم اپنے شوہر کی بھی بہت ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم جیسا دین و عقل میں ناقص ہو کر پھر ایک دانش مند شخص پر غالب آجانے والا کسی کو نہیں دیکھا۔"

(بخاری و مسلم۔ ترجمان السنتہ)

مراد رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ماجدہ کا نام حنتمہ بنت ہشام تھا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حضور دعا فرمائی تھی۔

"اے اللہ! اسلام کو عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعے مضبوط کر دے۔"

اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دار ارقم میں تشریف فرما تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ اب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکل کر کعبہ کی طرف چلنے لگے تو دو گروپ بنائے گئے۔ مسلمانوں کے ایک گروپ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تھے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں گروپوں کی قیادت فرماتے ہوئے کعبہ پہنچے تو مشرکوں کے سردار جن میں عمرو بن ہشام ابوجہل بھی تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مبہوت رہ گئے۔ بے حد پریشان ہوئے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا ظاہری منظر بھی عیاں فرما دیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے تھے۔

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قد لمبا تھا۔ قدرے تیز چلتے تھے۔ لوگوں کے درمیان پیدل چلتے ہوئے یوں محسوس ہوتے جیسے آپ رضی اللہ عنہ سواری پر سوار ہیں اور لوگ پیدل چل رہے ہیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رنگ سفید تھا۔ اس سفیدی میں سرخی غالب تھی۔"

(بحوالہ کتاب اعلام النبلاء، امام ذہبی)

دوست سے تعلق توڑنا

بنی اسرائیل میں دو دوست تھے۔ دونوں ایک پہاڑ پر عبادت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک شہر میں کچھ خریدنے آیا۔ اس کی نگاہ ایک فاحشہ عورت پر پڑی اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا اور اس کی مجلس اختیار کر لی۔ جب کچھ روز گزر گئے تو دوسرا دوست اس کی تلاش میں آیا اور اس کا حال سنا۔ وہ اس کے پاس آیا اور اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"میں تو تجھے جانتا ہی نہیں۔"

دوست نے کہا "برادر عزیز! دل کو اس کام میں مشغول نہ کر۔ میرے دل میں تجھ پر جس قدر آج شفقت پیدا ہوئی ہے۔ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے بوسہ دیا۔ گناہ میں مبتلا ہونے والے دوست نے جب اس کی طرف سے شفقت کا یہ مظاہرہ دیکھا تو جان لیا کہ میں اس کی نظر سے نہیں گرا۔ وہ اسی وقت اس عورت کی محفل سے اُٹھا، توبہ کی اور دوست کے ساتھ چلا گیا۔

عاجزی اور بے بسی کے وقت دینی دوستوں کی ضرورت و حاجت پیش آتی ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں دینی دوست سے قطع تعلق نہ کریں۔ عقد و دوستی کا رشتہ قرابت کی طرح ہے اور قطع رحم کسی گناہ کے سبب نہیں کیا جاتا۔

محبت اور دوستی ترک کرنا

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا۔ "آپ کا بھائی تو گناہ کا مرتکب ہو گیا۔ آپ اس سے دشمنی کیوں نہیں کرتے؟"

آپؓ نے جواب دیا "میں اس کی معصیت (گناہ) کو برا جانتا ہوں لیکن جب تک وہ میرا بھائی ہے۔ اس سے دشمنی اختیار نہیں کروں گا۔"

تاہم ایسے شخص سے ابتدا سے دوستی اور تعلق قائم نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایسے شخص سے بھائی چارہ قائم نہ کرنا گناہ کی بات نہیں۔ ہاں محبت اور دوستی ترک کرنا گناہ ہے اور اس حق کو نظر انداز کرنا ہے جو دوستی قائم کرنے سے ثابت ہو چکا ہے لیکن اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر تیرے حق میں کوئی قصور کیا ہے اور اس کا معاف کر دینا بہت بہتر ہے۔ جب کہ وہ معذرت کرے اگرچہ تجھے علم ہو کہ وہ جھوٹی عذر خواہی کر رہا ہے۔

مصلحت

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید سے فرمایا۔

"جب تیرا کوئی دوست تجھ سے زیادتی کرے تو اس پر ناراض نہ ہو کیونکہ شاید اس صورت میں تو اس سے ایسی باتیں سنے جو اس زیادتی سے بھی سخت تر ہوں۔ مرید کہتا ہے جب میں نے اس کا تجربہ کیا تو ایسا ہی سامنے آیا۔

(کیمیائے سعادت، امام محمد غزالی)

طرزِ حکمرانی

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ ایک عیسائی تاجر اپنے تجارتی گھوڑوں کو لے کر دریائے فرات کے پاس سے اسلامی سرحد میں داخل ہوا۔ زیاد بن حریر نے اس سے محصول طلب کیا۔ اس نے محصول ادا کر دیا۔ واپسی میں دوبارہ اسی راستے سے گزرا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

تو زیاد نے اس کے غیر فروخت شدہ گھوڑوں سے دوبارہ محصول طلب کیا۔

تاجر کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس نے اپنے غیر فروخت شدہ گھوڑے آپنے غلاموں کی نگرانی میں وہیں چھوڑ دیے اور خود چل کر مدینہ پہنچا تاکہ خلیفہ سے شکایت کرے۔

اس نے مدینہ پہنچ کر حضرت عمر فاروق رضؓ سے اپنا قصہ بیان کیا اور کہا۔

"مجھ سے میرے گھوڑوں پر دوبارہ محصول طلب کیا جارہا ہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی بات سن کر مختصر طور پر صرف اتنا کہا۔

"کفیت" (اس کا انتظام کر دیا گیا ہے)

تاجر نے سمجھا کہ خلیفہ نے اس کی شکایت کو کچھ اہمیت نہ دی۔ وہ مایوسی کی حالت میں دریائے فرات پر واپس آیا اور زیاد کے مطالبے کے مطابق محصول کی رقم ادا کرنے لگا مگر زیاد نے اس سے دوبارہ رقم نہ لی اور کہا۔

"خلیفہ کی طرف سے یہ حکم آگیا ہے کہ تم سے دوبارہ محصول نہ لیا جائے۔"

عیسائی تاجر اس بات سے بے حد متاثر ہوا کہ خلیفہ نے اتنی تیز کارروائی کی کہ میرا انصاف مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

"اے زیاد! میں مسیحیت کو چھوڑتا ہوں اور اس آدمی کے دین کو اختیار کرتا ہوں جس نے تمہارے پاس فرمان بھیجا ہے۔"

علاج

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ کی آنکھ میں کچھ ایسا تورم ہوا کہ طبیب نے معائنہ کرنے کے بعد کہہ دیا۔

"حضرت! اب اس کا علاج یہی ہے کہ اس آنکھ کو پانی سے بچا کے رکھیں۔ ورنہ پانی پڑنے کی صورت میں بینائی زائل ہونے کا امکان ہے۔"

یہ سن کر آپ مسکرائے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔

"ہم تو ندرانہ جان لیے کھڑے ہیں اور طبیب بینائی جانے سے ڈرا رہا ہے۔"

چنانچہ آپ نے اس غیر مسلم طبیب کی بات کا بالکل خیال نہ کیا اور وضو کر کے عشا کی نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اور حسب معمول ساری رات عبادت میں گزاری۔

اگلے دن جب وہ طبیب معائنے کے لیے آیا تو اس نے حیرت سے آپ کی دیکھا اور پوچھا۔

"حضرت! یہ آنکھ ایک ہی رات میں کیسے درست ہوگئی؟"

"وضو کرنے سے۔" جنید بغدادیؒ نے اطمینان بھرے لہجے میں اسے جواب دیا۔ یہ سن کر طبیب بہت شرمندہ ہوا اور صدق دل سے ایمان لے آیا۔

انمول موتی

- ساری دنیا کے لوگ تجھے اپنے فائدے کے لیے چاہتے ہیں صرف ایک تیرا رب ہے جو تجھے تیرے فائدے کے لیے چاہتا ہے۔
- جب رب راضی ہونے لگتا ہے تو بندے کو اپنے عیبوں کا پتا چلنے لگتا ہے اور یہ اس کی رحمت کی پہلی نشانی ہے۔
- کائنات میں کوئی کسی کا اتنا انتظار نہیں کرتا جتنا رب کریم اپنے بندے کی توبہ کا انتظار کرتا ہے۔
- محبت چہروں سے نہیں، دلوں سے روحوں سے کی جاتی ہے۔ چہرے تو روپ بدل سکتے ہیں، چہرے ایک جیسے ہو سکتے ہیں لیکن روحیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔
- خواب ضرور دیکھو، مگر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کرو، کیونکہ حقیقت کا رنگ صرف اللہ بھر سکتا ہے۔ اس سے مدد کی دعا کرو۔

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

خالدہ جیلانی

کھلا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

ارم کمال ___ فیصل آباد

اک درد کا میلہ کہ لگا ہے دل و جاں میں
اک روح کی آواز کہ رستہ مجھے دینا

بشریٰ ___ کراچی

دیکھتے دیکھتے اک گھر کے رہنے والے
اپنے اپنے خانوں میں بٹ جاتے ہیں

نوال افضل گھمن ___ گجرات

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تری روانی کو

وجیہہ محسن ___ گلشن معمار

مدتوں بعد پشیماں ہوا دریا ہم سے
مدتوں بعد ہمیں پیاس چھپانی آئی
مدتوں بعد کھلی وسعت صحرا ہم پر
مدتوں بعد ہمیں خاک اڑانی آئی

آسیہ جاوید ___ گجرات

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لیے

ثمرہ عاقب ___ گرین سٹی

کاش دیکھو کبھی ٹوٹے ہوئے آئینوں کو
دل شکستہ ہو تو پھر اپنا پرایا کیا ہے

مدیحہ ایمان ___ حیدر آباد

عمر رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے

ثوبیہ قطب ___ کراچی

حالت یہی رہی تو نکل جاؤں گا کہیں
کچھ روز نہ ہی بدن کو گوارا کروں گا میں
سانسوں کی باگ دوڑ سنبھالوں کہاں تلک
دانستہ زندگی میں خسارا کروں گا میں

اقصیٰ ناصر ___ گلستان جوہر

ایک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
ایک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

فضہ بلال ___ ڈیفنس گارڈن

یہ تو اچھا کیا تنہائی کی عادت رکھی
تب اسے چھوڑ دیا ہوتا تو اب کیا کرتے
دل کا غم دل میں لیے ٹوٹ گئے ہم چپ چاپ
کوئی سنتا ہی نہ تھا شور و شغب کیا کرتے

صدف عمران ___ کے ڈی اے سوسائٹی

کب تک نجات پائیں گے وہم و یقیں سے ہم
الجھے ہوئے ہیں آج بھی دنیا و دیں سے ہم

نادیہ یاسر ___ گوجرخان

انہیں اپنے دل کی خبریں مرے دل سے مل رہی ہیں
میں جو ان سے روٹھ جاؤں تو پیام تک نہ پہنچے

فاکہہ سہیل ___ کراچی

بات وہ کہیے کہ جس بات کے سو پہلو ہوں
کوئی پہلو تو رہے بات بدلنے کے لیے

ایس۔ آر ___ جام پور

ہجر کی رات ڈھل گئی محسن
اب تو دل سے کہو، سنبھل جائے

ارم احمد ___ لاہور

محبت کا ثمر ملتا نہیں ہے
یہ سکہ اب کہیں چلتا نہیں ہے
ہم اہل دل، سر بازار دنیا
کھڑے ہیں، راستہ ملتا نہیں ہے

صائمہ سلیم ___ کراچی

ہر شے ہے پر ملال، بڑی تیز دھوپ ہے
ہر لب پہ ہے سوال، بڑی تیز دھوپ ہے
چکرا کے گر نہ جاؤں میں اس تیز دھوپ میں
مجھ کو ذرا سنبھال، بڑی تیز دھوپ ہے

نازش ریحان ___ لسبیلہ

ہم میں بہت ہمت ہے درد سہنے کی
ہم اتنا درد دیتے ہو تھک نہیں جاتے؟

بقیہ خط آپ کے

تالیہ! دی گریٹ چورنی..... امرحہ، عابیان۔ اور تو اور موسٹ فیورٹ ہاشم کاردار۔ ان تمام ہر دل عزیز شخصیات سے ایک بار پھر ملوا کر آپ نے ہم پر خوب نوازش کی ہے۔ آپ کی تعریف کے لیے تو بھئی الفاظ ہی نہیں مل رہے۔ سارے مستقل سلسلے پڑھ ڈالے۔ کیا بات ہے، مزا آیا۔ ☆ پیاری ماہم! آپ کا خط لیٹ ملا، اس کے باوجود شامل اشاعت ہے۔ آپ اپنا افسانہ اور خط ان پیج پر بھجوا سکتی ہیں۔

مسز افتخار نواں شہر ایبٹ آباد سے لکھتی ہیں

''شام کی حویلی'' ہمیشہ کی طرح بیسٹ ''خلش'' عائشہ نصیر احمد نے اچھا لکھا۔ شفق افتخار کا ''چھاؤں جیسے لوگ'' ہادی جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ باقی ابھی پڑھا نہیں۔ مجھے نہیں پتا۔

ج: مسز افتخار! محفل میں شرکت کا شکریہ۔ آپ نے اپنا نام نہیں لکھا۔ آئندہ خط لکھیں تو اپنا ضرور لکھیں۔

اقرا عبدالصمد نے رحیم یار خان سے لکھا ہے

جب ہم میٹرک میں تھے تو کلاس میں کچھ دوستیں ڈائجسٹ پڑھتی تھیں۔ ہاف ٹائم میں یا فری پیریڈ میں ہم پورا گروپ صائمہ یا فریدہ کے گرد اکٹھا ہو کر بیٹھ جاتے اور کہانی سنتے ساتھ میں تبصرے، ہنسی مذاق بہت مزہ آتا تھا۔ میٹرک میں دوستوں کے ساتھ پڑھ لیتے تھے مگر باقاعدگی کے ساتھ میٹرک کے بعد شروع کیا۔ گھر میں پتی جان پڑھا کرتی تھیں پھر ساتھ میں ہم بھی شروع ہو گئے۔ جب ڈائجسٹ آتا تھا تو امی جی کو پتا ہوتا تھا، اب اقرا نے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانا۔ میں رسالے میں ایسے گم ہوتی تھی کوئی خبر نہیں رہتی تھی، گھر میں کیا ہو رہا ہے یا مجھے کوئی بلا رہا ہے۔ دو دن میں رسالہ ختم ہو جاتا تھا۔ رسالہ پڑھتے ہوئے بہت دفعہ سالن جلایا، کام سے ڈنڈی ماری، ڈانٹ سنی مگر کیا کرتے جب تک رسالہ ختم نہیں ہوتا تھا دھیان رسالے میں ہی رہتا تھا۔ آج الحمدللہ دو بچوں کی ماں ہوں، خط لکھنے بیٹھی تو بہت سی یادیں دستک دیتی چلی آئیں۔ شادی کے بعد جب بھی امی کے گھر جاتی تو رات کو جب سب سو جاتے تھے پھر میں اور رسالہ ہوتے تھے۔

اب تو میرے میاں رسالہ لا دیتے ہیں ستمبر کا شعاع لا دیا ہے خواتین کے لیے تین دفعہ پوچھ آئے ہیں مگر نہیں آیا۔

بہت ہو گئیں باتیں اب شعاع پر تبصرہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے شام کی حویلی اور نازنین پڑھی نازنین کا لگتا ہے اب اینڈ ہونے والا ہے اور سب کچھ سیٹ ہو جائے گا۔

شفق افتخار کی ''چھاؤں جیسے لوگ'' بھی بہت اچھی لگی۔ جویریہ مریم کا ''فسانۂ دل زار'' سو فیصد ہمارے معاشرے کی سچی کہانی ہے۔ زرقا سکندر نے رشتے ہیں انمول میں بہت ہی خوب صورت سبق دیا۔ رشتوں سے ہی زندگی کی خوب صورتی ہے۔

شازیہ الطاف نے بھی بھائی صاحب میں بھی بہت اچھا سبق تھا۔

''سفر'' میں دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے؟

ج: پیاری اقراء! بہت خوشی ہوئی کہ ہماری ایک دیرینہ قاری ہم سے ملاقات کے لیے ہماری محفل میں آئیں۔ شعاع سے آپ کی محبت اور لگاؤ ہمارے لیے انمول احساس ہے۔

رضوانہ وقاص نے ہری پور کرلاں سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

رضیہ آپا جب میرے شوہر کی پروموشن ہوئی۔ ان شاء اللہ میں آپ لوگوں کو مٹھائی کھلاؤں گی۔ آپ نے اپنا ایڈریس بتا دینا ہے اوکے۔ میری ٹانگوں کے درد کو ابھی تک آرام نہیں ہوا۔ اب 10 محرم کو اچانک پیٹ سے درد اٹھا تو ٹیسٹ کروائے، گردے میں انفیکشن ہو گیا ہے۔ اور پتے میں پتھری کی تکلیف برداشت سے باہر ہے۔ میں نے بنا ہے دوسرے دعا کریں تو دعا قبول ہوتی۔ اس لیے پلیز میرے لیے دعا کریں۔ اللہ مجھے ٹھیک کر دے۔

ماڈل کا ڈریس پسند آیا لیکن کچھ اداس سی، پریشان سی لگی۔ پہلی شعاع پڑھی، واقعی یہ ہمارا اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ حمد باری تعالیٰ پڑھی نعت پڑھی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ساری کی ساری پسند آئی ہیں۔ یہ کیا اس بار انٹرویو کسی کا نہیں آیا۔ نیا سلسلہ شروع کر دیا ہے کیا۔ فارسی کہانیاں، جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ ص۔ ح۔

اسلام آباد ان کی پیڑھی چل رہی ہے۔ دو بہنوں کی تو ہماری ایک لڑکی کی پیڑھی چل رہی ہے۔ میری نانی امی اکلوتی بیٹی۔ میری پھوپھی، ایک میری امی کی ماموں کی بیٹی اکلوتی میں اپنے والدین کی ایک بیٹی۔ بہن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بہت زیادہ۔ خط آپ کے سلمٰی مسرت کا خط پڑھا۔ اللہ آپ کی بہن اور بھانجے کو صبر دے (آمین)۔ یہ کیا یار دل دار سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ اس دفعہ ''شہر تمنا'' بھی نہیں ہے۔ ''شام کی حویلی میں'' اب اینڈ کی طرف چل رہا ہے، ثمینہ کا کردار پسند نہیں آیا۔ کیسی بیوی، کیسی ماں دکھائی ہے۔ فرحان کتنا برا شخص ہے۔ کس طرح فون پر وائس میسج بھیجے، شائستہ بیگم نے سن لیے۔ پر انہوں نے اچھا نہیں ردا کے ساتھ۔ وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ پلیز اس کو نہ ماریں۔ ''رشتے ہیں انمول'' فریحہ نے علیزہ سے بات کی تو اس نے اچھی بات کی ہے کہ امی کیا میں اکیلے گھر میں خوش رہ سکوں گی۔ ''بھائی صاحب'' آج کل واقعی کسی رشتے پر اعتبار نہیں رہا۔ بہنوئی پر نہ سالی پر۔ عزہ کی بیٹی ایمل کا اپنے باپ کی نقل اتارنا اچھا لگا ہے۔ آج کل بچے وہی کرتے ہیں جو دیکھتے سنتے ہیں۔ مکمل ناول سفر پسند آیا۔ ''چھاؤں جیسے لوگ'' ڈاکٹر تو ویسے بھی پسند ہیں۔ لیکن ڈاکٹر لوگ تھوڑی بہت غریب لوگوں کی مدد کردیا کریں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ سب کے انٹرویو پسند آئے۔ موسم کے پکوان، قیمہ بھرے کریلے، منفرد رول پسند آئے۔ امی کو بولوں گی کہ مجھے بنا کر کھلائیں۔ کیونکہ میں تو کچھ عرصہ سے کام نہیں کرسکتی۔ خوب صورت پلے ویسے تو آپ کو پتا ہے گاؤں میں رہتے ہیں میری تیاری صرف کاجل اور لپ اسٹک پسند ہے۔ لیکن اس دفعہ خوب صورت پلے پسند آیا ہے۔

ج: جتنی تفصیل کے ساتھ آپ نے ساری کہانیوں اور ان کے کرداروں پر تبصرہ کیا ہے۔ ہمیں اندازہ ہوگیا ہے کہ شعاع کی ہر کہانی بہت دلچسپی اور یکسوئی سے پڑھتی ہیں۔ ناول شہر تمنا کی قسط شامل نہ ہونے کی وجہ نعیمہ ناز کی خوش گوار مصروفیت تھی ان کی ''مصروفیت'' وہ اگلے ماہ خود بتائیں گی۔ تھوڑا سا سسپنس تو رہنا چاہیے ناں۔ یار دل دار بند نہیں کیا گیا۔ اس ماہ شامل ہے۔

گڑیا راجپوت..... جاتری شریف سے لکھتی ہیں

میرا بالکل بھی خط لکھنے کا دل نہیں تھا۔ کون سا چھپ جاتا ہے۔ شعاع اب کی بار کچھ ڈفرنٹ سا تھا۔ رسالے کے فرنٹ پر ماڈل گرل ہر بار دیکھنے میں مختلف لگی کبھی عجیب، کبھی پیاری، کبھی مسکرانے کی کوشش میں ناکام۔ حمد ونعت پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کی فضیلت سے آگاہ تو تھے لیکن پھر بھی تازگی کا مسحور کن احساس جاگا۔ اس کے بعد خط آپ کے (میرا تو ہوتا نہیں..... پتا نہیں کس کس کے) اب کی بار فہمیدہ جاوید..... کا خط سب سے الگ لگا۔ میں ان کی ہر بات سے تو نہیں لیکن پھر بھی کچھ باتوں سے متفق ضرور ہوں (اندازہ آپ خود لگالینا) جیسے انہوں نے کہا۔ سائز میں تبدیلی کریں۔ بھئی اگر بڑا کیا جائے تو وہ کتاب بن جائے گی۔ اور چھوٹا کیا تو وہ رسالہ تو نہیں رہے گا۔ بہن ''رسالی'' بن جائے گا۔ سائز والی تبدیلی ''وارا'' نہیں کھاتی ہیں ہاں اگر اوراق بڑھادیں تو مہربانی جیسا لفظ چھوٹا پڑجائے۔ گرافک ڈیزائننگ کا ضرور سوچ لینا چاہیے۔ ہاں یہ ٹھیک کہا کہ کہانیوں کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا۔ پتا نہیں ساری رائٹرز بیاہی جاچکی ہیں۔ ساس بہو اور سسرال۔ پلیز کسی کنواری سے بھی لکھوائیں..... ہی ہی ہی ..... مجھے یاد آتے ہیں وڈے وڈے خاندان کے کزنز، بون فائر۔ ''پیر کامل'' جیسی کہانیاں ہونی چاہئیں۔ ''جنت کے پتے'' جس کو پڑھ کر بہت سے چہرے حجاب میں چھپ گئے۔ ''مصحف'' جس کو پڑھ کر بہت سے دل تراجم سے تسکین پانے لگے اور رائٹرز کے انٹرویو اگر رائٹرز لکھ سکتی ہیں۔ تو وہ انٹرویو بھی دے سکتی ہیں۔

تو جناب بات ہورہی تھی ستمبر کے رسالے کی۔ جو کہ گزرے ہوئے 2020 کے مہینوں کی جان لگا۔ سب سے پہلے ''سفر'' ماریہ نواز کا بہت مزے کا لگا۔ مطلب گہرائی میں جاکر پڑھا مشکل الفاظ بھی نہیں تھے اور بہت سے اسباق بھی مل گئے۔ اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ ''شام کی حویلی'' رخسانہ آپی آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ردا کو مار کر۔ ''خلش'' عائشہ کا یہ ناول پہلے سے قدرے بہتر تھا۔ رابی کو اچھا سبق سکھایا۔ حاسد کا یہی علاج ہے۔ (رابی رہ اب میدو کے ساتھ.....) شفق افتخار ''چھاؤں جیسے لوگ'' پرانا موضوع۔ پڑھ کر بور ہوگئی۔ افسانے ابھی

پڑھے نہیں۔ اور ناتا جوڑا..... پڑھ کے دل اداس اور آنکھیں نم ہوگئیں۔ بڑی کے لیے میرا مشورہ ہے (قبل از وقت) کہ وہ اپنی بہن کی چھوٹی بیٹی کو اپنی بہو بنائے تاکہ اس جان لیوا حقیقت سے جان چھوٹ جائے اور چھوٹی بہن کو مشورہ ہے پلیز صبر سے کام لے، میں اگر اپنی امی کے حالات زندگی لکھ کر بھیج دوں تو آپ کو پتا چلے کہ ہماری امی کو بھی کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اپنے آخری الفاظ پر بھی عمل مت کرنا..... کیونکہ یہ دنیا مشکل ضرور ہے لیکن اگلی جیسی کٹھن نہیں ہے..... میں صرف باتیں نہیں کررہی ہم نے بھی مشکل وقت گزارا ہے۔ بس اللہ سب پر رحم کرے اور آخر میں میری کہانیوں کا بتادیں۔

اگر ''سلیقہ بی بی'' جیسی کہانیاں لگ سکتی ہیں تو میری کہانیوں میں کمی لگتی ہے آپ کو..... بعض کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا نہ سر ہوتا ہے اور نہ پاؤں لیکن وہ شائع ہوجاتی ہیں کیونکہ وہ آپ کی منتخب کردہ، چہیتی رائٹر کی ہوتی ہیں۔ حد ہوتی ہے۔ ہزار پندرہ سو میرے ڈائجسٹ کی مد میں نکل جاتے ہیں۔ 280 کے تو خالی ڈائجسٹ ہی آتے ہیں..... لیٹر 300 میں پوسٹ ہوتا ہے اور جس سے کرواتی ہوں، وہ 500 سے کم نہیں لیتا۔ کیوں کہ اس مصروفیت بھری زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ دوسروں کے لیے نکالتا پھرے، وہ بھی مفت، شہر اتنا دور اور روڈ اتنا خراب ہے کہ 300 کا گاڑی تیل پی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ پاتی پر نہیں چلتی۔

ج: پیاری گڑیا کہانیاں قابل غور ہوں یا پڑھی نہ گئی ہوں تو ہم بتادیتے ہیں۔ البتہ ناقابل اشاعت کہانیوں کے بارے میں ہم دانستہ خاموشی اختیار کرلیتے ہیں۔ اور یقین جانیں جتنی تکلیف آپ کو کہانی شائع نہ ہونے پر ہوتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے بڑھ کر تکلیف ہمیں کہانیاں ریجیکٹ کرتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی دکھ بھری کہانی پڑھ کر بہت افسوس ہوا ہے۔ آئندہ خط لکھیں تو اپنا فون نمبر بھی لکھیں، ہم آپ کو فون کرکے کہانیوں کے بارے میں بتادیں گے۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے لکھا ہے

اس بار عمدہ ترین ناول شفق افتخار کا ''چھاؤں جیسے لوگ'' لگا بے حد پیاری اسٹوری ہے۔ ماریہ نواز کے ناول ''سفر'' کو بھی بہترین تحریر کہہ سکتے ہیں اور رخسانہ نگار عدنان کی ''شام کی حویلی'' میں تو دل بہت لگتا ہے۔ اور جناب ''وہ نازنین'' کی کیا بات کریں۔ پسند آنے کے باوجود بھی بعض دفعہ ہم کرداروں کو یاد رکھتے ہوئے بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور اس بار جب تجھ سے ناتا جوڑا عجیب سا محسوس ہوا اتنا زیادہ وہم یا بدنصیبی سمجھنا اچھا نہیں لگا۔ ایک بہن خوش نصیب ہے تو دوسری بدنصیب۔ فرزانہ کھرل اور مریم عزیز اتنی شان دار رائٹر کہاں غائب ہیں۔ ان سے ناولز لکھوادیئے۔ باقی تمام شعاع اوور آل اچھا رہا۔

ج: پیاری تسنیم! شدید رنج اور غصہ کی کیفیت میں اکثر ہماری زبان سے کچھ ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو ہم کہنا نہیں چاہتے۔ یہ جملہ جس پر آپ کو اعتراض ہے۔ ''پورے گھر کو آگ لگادوں گی'' ان کے منہ سے شدید رنج میں نکلا ہے۔ ان کا مطلب ہرگز وہ نہیں تھا جو انہوں نے لکھا ہے۔

شعاع آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ لیکن اپنے ہی پرچوں میں اپنا انٹرویو شائع کرنا ہمیں کچھ اچھا نہیں لگتا۔

صدف ناصر نے سرفراز کالونی گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے

چار تاریخ سے چھ تاریخ تک صبح وشام کئی چکر بک سینٹر کے لگا ڈالے۔ ہر دفعہ جواب ملا۔ سیلاب کی وجہ سے رسالا نہیں آرہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چھ ستمبر کو ''شعاع'' بڑی دعاؤں کے بعد نصیب ہوا۔ ٹائٹل بہت بہت سمپل مگر اچھا لگا۔ ''پہلی شعاع'' میں حاضر ہوئے۔ پھر ''حمد باری تعالیٰ'' کی جانب بڑھے۔ ''سبحان اللہ''، ''نعت رسول مقبول'' پڑھ کر بے اختیار پرانی یادیں تازہ ہوگئیں ''بہزاد لکھنوی'' کی یہ نعت ہر وقت اسٹوڈنٹ لائف میں ہماری زباں پر رہتی تھی۔ ''پیارے نبی کی باتیں'' ماشاء اللہ ہمیشہ کی طرح شاندار۔

ج: ''ش.....خ بہن کے حالات جان کر دلی دکھ ہوا۔ جو بھی ہے بہرحال شادی کے دوسرے ہی دن کام کرنا بہت دکھی کرگیا، ان کے شوہر ہی دراصل ان کے ساتھ مخلص نہیں تو سسرالیوں کو کیا کہیں۔ اللہ آپ کی

مشکلیں آسان کرے۔ (آمین) ''خط آپ کے'' ہر دل عزیز من پسند سلسلہ میں ہم بھی شامل تھے۔ مگر ہمارے خط شامل نہ ہوں تو پلیز معذرت مت کیا کریں۔ اچھا نہیں لگتا۔ آپ بہت محترم ہیں ہمارے لیے۔ اور یہ تو بتادیں ہر ماہ ایک دو خطوط پرانے کیوں ہوتے ہیں اس طرح نئے پڑھنے والے کنفیوژن کا شکار ہوجاتے ہیں۔

خطوط کی محفل سے نکل کر ''مکمل ناول'' کی جانب گامزن ہوئے ''چھاؤں جیسے لوگ'' موجود تھے۔ ''شفق افتخار کے پاس۔ ویسے عجیب اتفاق ہے ناں! فائزہ افتخار، مہوش افتخار اور اب شفق افتخار، بہرحال کہانی بہت طویل اور شاندار۔ ہمیں لگا پرانا ٹائپ ہے مگر نہیں جی۔ بس تھوڑا سا پرانا لگا اسٹارٹ میں باقی بہت بہترین تھا۔ اب تو خال خال ہی ''مومنہ'' اور ''ہادی'' جیسے لوگ ملتے ہیں۔ پرخلوص اور اچھے۔ ''ماریہ نواز'' نیا نام ''سفر'' لیکن بلاشبہ اچھی اسٹوری۔ باقی آئندہ کیوں! اف۔ ''ناولٹ'' عائشہ نصیر احمد! وعلیکم بیک عائشہ جی۔ بلاشبہ بہترین رائٹر اور ہمیشہ کی طرح خوب کمال لکھا۔ ہم ڈر گئے کہیں وہی روایتی کہانی نہ ہو کہ کزن قربانی دے دے۔ مگر نہیں شکر ہے برانڈ نیو اسٹوری تھی بھئی۔ زبردست۔

افسانوں کی دنیا میں قدم رکھا۔ بے شک افسانوں کی دنیا میں سب سچ نہیں ہوتا مگر سب جھوٹ بھی نہیں ہے محترم! کیونکہ ''رشتے ہیں انمول میں'' زرقا سکندر نے صدفی صد میری کہانی لکھ ڈالی۔ زرقا آپ مجھے کہاں ملیں؟ میں سسرال میں بڑی بہو ہوں۔ بارہ سال سے ہر ذمہ داری انتہائی خوش اسلوبی سے نبھائی۔ آج ''پھل'' انتہائی میٹھا ملا ہے۔ پورا سسرال مجھے اور بچوں کو ہر ہر قدم سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ شکریہ زرقا! آپ نے بڑی فیملی کا ''پازیٹو'' پہلو اجاگر کیا۔

''بھاگ بھری'' بس سو سو لگی ورنہ ہمیشہ تو حمیرا عروش پسند آتی ہیں۔

''شازیہ الطاف'' کے ساتھ اس مرتبہ ''بھائی صاحب'' تھے۔ مذہبی اور اخلاقی و معاشرتی رو سے بھائی بس حقیقی بھائی ہوتے ہیں باقی صرف دھوکا! ویل ڈن شازیہ۔

''راؤ سمیرا ایاز'' کی ''تربیت'' بلامبالغہ ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کرتی ہوئی اداس تحریر۔ اچھی اور بہترین تربیت ہی ''نسلیں'' سنوارتی ہے۔

''باتوں سے خوشبو'' نے ہمیشہ کی طرح اندر باہر' خوشبو'' بکھیر دی۔ ہر لفظ باکمال، ''شعروں'' کی طرف سفر بڑھایا۔ ''شہرین، ناہید اسماعیل'' فاکہہ سہیل نے کمال کے شعر دیے ہیں۔ شکریہ بہنو۔ ''تاریخ کے جھروکے'' جتنا اب دن بدن باکمال ہوتا جاتا ہے کبھی اتنا نہیں تھا۔ ہر ماہ شان دار تاریخ پڑھنے کو ملتی ہے۔

ج: صدف! محفل میں شرکت کی اور بہت اچھا تبصرہ لے کر آئیں، بہت خوشی ہوئی۔ دعا کریں ڈالر دو سال پرانی قیمت پر آجائے تاکہ ہم آپ کی فرمائش پوری کرسکیں یعنی صفحات بڑھا سکیں۔

ڈاکٹر فریال ڈی جی خان سے لکھتی ہیں

پہلے تو ہوا لاک ڈاؤن جو کہ اچانک ہوگیا اس سے زیادہ اچانک یہ ہوا کہ ہمارا کلینک بند ہوگیا کیونکہ اس ایریا میں کورونا کیسز زیادہ ہونے لگے تھے پھر میں خود بھی دو سے تین مہینے بیمار رہی بہت۔ خیر اللہ کا کرم کہ اب ٹھیک ہوں، الحمدللہ اور کلینک بھی کھل گیا۔ اب آتے ہیں مزے دار صورت حال کی طرف۔ پہلے تو یہ بات دماغ قبول نہیں کررہا تھا کہ ڈائجسٹ بھی بند ہوسکتے ہیں، ہر تین دن کے بعد ایجنسی کال کرتی کہ رسالے آئے، وہ کہتے۔ باجی نہیں آئے پھر تو ایسا ہوا انہوں نے کال لینا چھوڑ دی، بس ''نہیں'' کا ایس ایم ایس آجاتا۔ میں سمجھ جاتی۔ پھر یہ ہوا کہ اماں نے کمر کس لی، مجھے گھر کے کام سکھانے کی۔ اماں نے کہا سسرال والے تمہاری ڈگری پکائیں گے اور ڈگری کھائیں گے۔ یا تمہاری باتیں سنیں گے۔ اماں سے زیادہ بڑی باجی۔ سب سے پہلا کام تھا کھانا بنانا۔ چلیں وہ تو ٹھیک تھا، سبزی بھی میں بناتی۔ خیر کھانا پکانا تو کچھ کچھ سیکھ لیا اور سنیں۔ فرش دھونا کہ فرش کو رگڑ رگڑ کے کیسے دھوتے ہیں۔ خیر کورونا کے دن تو پھر اماں کے دن تھے ناں، بہت سارے کام مجھ غریب سے کروائے۔

اماں نے کپڑے بھی دھلوائے اور استری بھی کروائی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر بخار۔ ناشتے کا ذمہ بھی میرا۔ روٹی بنانا بھی۔ شروع شروع کی یہی روٹین تھی خیر اب تو شکر ہے کام کرلیتی ہوں۔ اب بخار نہیں ہوتا، ہڈیاں

عادی ہوگئی ہوں۔

رسالے آنے کا میسج ملا، تو میں تو اچھل پڑی باجی نے پوچھا کیا ہوا۔ میں نے کہا کچھ نہیں، چیونٹی نے کاٹا تو اس وجہ سے اچھلی۔ باجی نہیں پڑھنے دیتی ہیں ناں، تو ان دنوں وہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ کسی طرح میڈیسن کے بہانے رسالہ لے آئی، اب پڑھنے کا مسئلہ۔ سارا گھر چھوٹے کے ایک اسٹور بچتا تھا جو کہ ساتھ والے ہمسائیوں کے چوہوں کا گڑھ تھا اور گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی آتا رہتا ہے پھر گرمیاں تھیں، یہ بھی سوچنا تھا کہ کس ٹائم پڑھنا ہے۔ سب اے سی والے روم میں اور پھر اس کو پڑھنے کے لیے کوئی جواز ہو کہ اے سی روم میں آج کل کیوں نہیں سونا۔ تو چلیں جی پھر ہو گئے شروع۔

کزن سے چوہے مار دوائی منگوائی۔ دو دن انتظار کیا۔ کیونکہ باجی کا اچانک چھاپا پڑ جانے کا خطرہ۔ چوہے اس سے بے ہوش ہو جاتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔ آگے روداد نہ پوچھیے بہت طویل ہے۔ چوہوں سے نجات پا کر سب سو گئے۔

اب پڑھنے کی باری آتی ہے، اب کیا کروں تو بس کچھ کھٹا دہی کھالیا، اس سے گلا خراب، بخار۔ اب اے سی روم میں نہ سونے کا بہانہ مل گیا۔ اب انتظار کہ کب دوپہر ہو، کب سب سوئیں اور میں اپنے ہر دل عزیز کو اٹھاؤں۔ خیر پڑھنے بیٹھی تو ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا۔ ہوش اس وقت آیا جب بخار تیز ہو گیا اور چکر آنا شروع ہو گئے کیونکہ شدید گرمی میں بیٹھی تھی۔ اب تو اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا خیر کسی طرح سے اپنے روم میں گئی، بہن کو اٹھایا۔ اس نے پٹیاں کیں۔ دوائی پلائی تو کچھ ہوش آیا۔ یہ تھی میری محبت کی داستان۔ اس دوران آپ سب کو بہت بہت مس کیا۔ اب آتے ہیں رسالوں کی تعریف کی طرف۔ رسالے خوش کرتے رہے، مزا آتا رہا۔ اب پچھلے رسالوں کا ذکر کروں تو سب ہی اچھے تھے۔ اب ستمبر کا ہی دیکھ لیں، سب سے پہلے ''شام کی حویلی'' اتنا اچانک موڑ کاٹتی ہیں رخسانہ جی آپ کہ ایک دفعہ تو دل دھک کر کے رہ جاتا ہے۔ دل کرتا ہے اتنا اچھا ناول لکھنے پر مٹھائی لے کر آپ کے پاس پہنچ ہی جاؤں۔ ماریہ نواز کا ''سفر'' بہت بہت اچھا لگا، نیا انداز لیکن اگلے ماہ کا دیکھ کے دل کے ساتھ آنکھیں بھی اداس۔ خیر بہت مزا آیا پڑھنے میں بھی۔ اب آجاتے ہیں ''وہ نازنین'' فرح بخاری، آپ نے اچھا نہیں اچھا کرنا شروع کر دیا ہے، اب مجھے رشتوں کی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے۔ عائشہ نصیر نے ''خلش'' میں حیران کر دیا کہ اس قدر غیرت مند بھی ہوتے ہیں۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔ ''آپ کے خط'' واہ واہ، دل بہار۔ دل پہ لگے ٹھاہ کر کے۔ آپ لوگوں نے، آپ کے پڑھنے والوں نے یاد کیا، ان کا شکریہ۔ اب اس خط میں اگر کوئی غلطی ہو، پڑھنے والوں کو محسوس ہو تو پلیز ''ہاتھ جوڑ کے''۔ سب افسانے بھی اچھے ہوں گے۔

ج: فریال! آپ کو شعاع پڑھنے کے لیے کتنے کشٹ اٹھانا پڑے۔ اسٹور کی صفائی، چوہوں سے محاذ آرائی، شدید گرمی کی دوپہر میں اے سی سے محرومی گوارا کی۔ پھر بخار بھی ہو گیا۔ پچ ہماری تو آنکھیں نم ہو گئیں ''دردناک'' احوال پڑھ کر۔ اماں تو تھیں ہی ظالم باجی بھی اس سے بڑھ کر ظالم نکلیں، اگر باجی اور اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں تو آپ ہی تکلیف کر کے انہیں شعاع کی کہانیاں سنائیں۔ انہیں کم از کم اتنا تو پتا ہونا چاہیے کہ ان پرچوں میں کیا ہے جو آپ اتنے شوق سے پڑھتی ہیں تاکہ وہ آپ کو اتنی سختی سے پڑھنے سے منع نہ کریں۔ محفل میں شرکت کے لیے شکریہ۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس اور حریم فاطمہ

گجرات سے شریک محفل ہیں

شکر ہے شعاع کے ساتھ دوبارہ رابطہ بحال ہوا۔ بات کرتے ہیں شعاع کی تحریروں کے بارے میں۔ سب سے پہلے رخسار نگار عدنان ''شام کی حویلی'' پڑھا۔ اب کہانی میں تھوڑی جان آئی ہے، مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کشف واقعی زینب اور منصور کی بیٹی ہے ناں۔

شائستہ نے کیا ظلم ڈھایا بے چاری ردا پر۔ لعنتی فرحان، جان لے کر ہی شیطان کی تسلی ہوئی۔

رخسانہ جی ریکویسٹ یہی ہے کہ بلال کے ساتھ کچھ اچھا ہی رکھیے۔ شائستہ کے زہر بھرے الفاظ ردا کی جان

لے گئے۔ ہماری گلی میں بھی سسرالیوں نے بہو کو قتل کردیا۔ دو بچے تھے بے چاری کے (اللہ پاک جنت الفردوس میں جگہ دے اسے)۔

''شہر تمنا'' غائب تھا۔ پلیز اینڈ اچھا سا ہونا چاہیے۔ آخر انتیس مہینوں کا ساتھ ہے۔ کبھی ساڈی وی من لیا کرو۔

''وہ نازنین'' سپر ہٹ قسط رہی۔ ماریہ نواز شاید نئی مصنفہ ہیں۔ ''سفر'' سپر ہٹ لگا مجھے۔ نتاشا اچھا کریکٹر ہے، ویسے کامیاب وہی ہیں جو اپنے دکھوں کو خوشی کے ریپر میں لپیٹ کر جئیں۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

''چھاؤں جیسے لوگ'' دل دکھی ہوا۔ میں تو اب ایسی تحریر پڑھ کر دل کو حوصلہ دیتی ہوں کہ میں اکیلی نہیں ہوں، ہر کوئی یہاں دکھی ہے۔ اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اتنی نعمتیں دے رکھی ہیں۔ جو رشتے پاس ہیں صبح و شام ان کی خیر کی، سلامتی کی دعا کرتی ہوں اور جن پیاروں کو رب نے پاس بلالیا ان کی مغفرت و بخشش کی دعائیں کرتی ہوں۔ ''خلش'' عائشہ نصیر ہوتے ہیں کچھ لوگ جو دوسروں کا حق مارتے ہیں۔ ہر اچھی اور خوب صورت شے بس ان کی ہی ہوتی ہے۔ ویسے سزا کچھ زیادہ نہیں۔ رابی کے لیے میدو کا شوہر ہونا۔

چلیے بات کر لیتے ہیں، افسانوں کی۔ حقیقت یہی ہے افسانہ افسانہ نہیں ہے۔ اس میں کہیں نہ کہیں حقیقت موجود ہوتی ہے۔ بھائی صاحب موضوع اچھا تھا۔ ایسے بھائیوں کو دور سے ہی سات سلام۔ چلو جی سالی صاحبہ کی عقل شریف ٹھکانے لگی۔ ''تربیت'' اچھا موضوع تھا۔ مائیں اولادوں کے رول ماڈل ہوتی ہیں۔ ہوتی ہیں ایسی عورتیں جو اس ذہنیت کی ہوتی ہیں، کوئی کتنا بھی اچھا ہو جائے ان کے لیے ان کی ڈیڑھ انچ کی مسجد کھڑی ہوتی ہے۔ غزل نظم قابل تعریف تھی۔ ''پہلی شعاع'' باتیں پر اثر۔ سات محرم کو ایک واقعہ ہمارے گھر بھی ہوا تھا۔ پھر اس واقعہ اور کربلا کے واقعہ نے خوب رلایا۔ کاش رونے سے بھی موت آجاتی۔ مجھے تو ایک ہی بات نے انسپائر کیا۔ اکیلا ہونا صرف اللہ کو زیبا ہے، تو یار جن کی قسمت میں تنہائی لکھی جا چکی ہو، ازل سے تو وہ کہاں جائیں۔

''پیار۔ نی کی پیاری باتیں'' ہمیشہ طرح لاجواب ہوتی ہیں۔

''شعاع کے ساتھ ساتھ'' بہت اچھا کیا جو یہ سلسلہ دوبارہ شروع کیا ہے۔ اقرا سرور، گڑیا راجپوت دونوں نے اچھا لکھا۔ کیا میں دوبارہ اس سلسلے میں شامل ہو سکتی ہوں۔

''موسم کے پکوان'' اس بار عید پر میں نے پائے بنائے تھے جو کہ میرے بہنوئی کو بہت پسند آئے۔ ورنہ تو ان کا ایک ہی جملہ ہوتا ہے ''تاوانوں ناں عقل آئی ہے تے ناں ہنڈی پکانے'' ناکوں ناک ہو کے ڈکار مار کے پھر کہیں گے ''کھان دا کوئی سواہ نہیں آیا۔''

''خوب صورت بیلے'' میرے حق میں سب مل کے دعا فرمائیں۔ اس سلسلے کو اپنا روزگار بنایا ہے، میرا رب برکت ڈالے۔

ج: آپ کا پچھلا خط اس وقت موصول ہوا، جب پرچا پریس جا چکا تھا ورنہ ضرور شامل کرتے۔ آپ ہماری ان قارئین میں سے ہیں جو بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔

ہم آپ سے متفق ہیں۔ عائشہ نصیر احمد نے مہرو کو کچھ زیادہ ہی سزا دے دی۔ مہرو نے غلط حرکت ضرور کی تھی لیکن وہ اپنی سگی پھوپھی کے گھر گئی تھی، کچھ لوگ جذبات میں آکر ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں لیکن اتنی کڑی سزا نہیں ہونا چاہیے۔

ج: پیاری فوزیہ آپ کے اتنے طویل خط میں دنیا سے، دنیا والوں سے بین السطور بہت سے گلے، شکوے جھانک رہے ہیں۔ پیاری بہن اس دنیا میں خوش رہنے کا راز یہی ہے کہ دنیا میں کسی سے توقع ہی نہ رکھیں۔ توقع سب سے بڑا دھوکا ہے۔

کوشش کریں کہ خوش رہیں اور خوش رکھیں، باقی اللہ پہ چھوڑ دیں اگر دوسرے آپ کی قدر کرتے ہیں تو بہت اچھی بات ہے۔ نہ بھی کریں تو اللہ کی مرضی سمجھ کر دل کو تسلی دے لیں۔

جو مائیں اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کرتیں۔ دادی، پھوپھی کے خلاف بھڑکاتی ہیں، انہیں بالآخر خود ہی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

ہم دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے روزگار میں برکت عطا فرمائے، آمین۔

سلمیٰ مسرت.....راولپنڈی

اس بار میں فہمیدہ جاوید کے خط پر تبصرہ کروں گی۔ انہوں نے بہت سی تجاویز دی ہیں۔ اگر آپ کوئی قدرتی سین دے دیا کریں تو ہمیں رسالے کو کور نہیں کرنا پڑے گا، میرے خیال میں زیادہ تر لوگ رسالوں کے ٹائٹل کی وجہ سے بھی ناپسند کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اندر بھی ایسی فیشن والی اور خیالی باتیں ہوں گی۔ دوسرے نماز پڑھتے ہوئے اسے پلٹ کر رکھنا پڑتا ہے، دوسرے فنکاروں اور دوسرے شعبے کے لوگوں کے انٹرویوز اخباروں اور میگزین وغیرہ میں آتے رہتے ہیں۔ آپ رائٹرز کے انٹرویوز باقاعدگی سے دیا کریں۔ تمام سینئر رائٹرز سے درخواست ہے کہ یہ آپ کا پہلا گھر ہے، اسے مت بھولیں۔ سمیرا حمید، سائرہ رضا کافی عرصے سے غائب ہیں اور بے شمار قاری بہنیں اگر کسی مصروفیت میں ہیں تھوڑا سا وقت نکال کر اپنی خیریت کی اطلاع دیں۔ ''تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' اس میں تبدیلی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ دوسرے رشتے ساس، نند، بھابھی وغیرہ کے روپ بھی دکھائیں اور نام کوئی بھی دے دیں۔

آپ کے لفظوں سے جانے کتنی لڑکیوں نے حوصلہ سیکھا اور صراط مستقیم پر چلنا سیکھا۔ اللہ، رسول ﷺ رشتہ سے جوڑا۔ یہ سب آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ دوسرے میں قانتہ رابعہ کی بہت بڑی فین ہوں، جن دنوں میں ان کی بیٹیوں کی شادی ہوئی، ان ہی دنوں میں اپنے دو بچوں کے فرض سے سبک دوش ہوئی ہوں۔ آپ سب میری بیٹی کے لیے دعا کریں، اللہ اس کے اور تمام بچیوں کے نصیب روشن کرے، آمین۔

ج: پیاری سلمیٰ! آپ اپنے بچوں کے فرض سے سبک دوش ہوئیں، دلی مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بچوں کو خوش و خرم رکھے، آمین۔ آپ کی تجاویز پر غور کریں گے۔

دریہ شہزادگاؤں کھیرے سیالکوٹ سے لکھا ہے میں شعاع کی سات سال سے خاموش قاری ہوں۔ شعاع کی ساری لکھاری بہت اچھا لکھتی ہیں۔ میں نے بھی چند تحریریں لکھی ہیں اور میری دلی خواہش ہے کہ میری کہانی شعاع میں شائع ہو۔

ج: شعاع کی آپ باقاعدہ قاری ہیں، خوشی ہوئی یہ جان کر۔ آپ اپنی تحریریں بھیج دیں، قابل اشاعت ہوئیں تو ہم ضرور شائع کریں گے۔

فوزیہ الطاف..... جہاں آباد ضلع سرگودھا

دل تو کرتا ہے کہ ہر مہینے آپ کو خط لکھوں لیکن ہمیں شمارے بہت لیٹ ملتے ہیں، کبھی کبھی تو دو مہینے کے اکٹھے ہی پڑھنے پڑتے ہیں اور ہم بہنیں اور کزنز آپس میں ہی تبصرہ کر لیتی ہیں۔ ''پہلی شعاع، حمد و نعت'' کے بعد سیدھے جاتے ہیں ''وہ نازنین'' کے پاس۔ کہانی دن بہ دن انٹرسٹنگ ہوتی جا رہی ہے۔

''شام کی حویلی میں'' اب پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ موحد ہے تو ڈاکٹر لیکن مجھے سائیکو لگتا ہے۔ کشف کے ساتھ جو ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے۔ ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ کہانیاں تو ساری الگ الگ ہیں، پر ایک بات سیم ہے کہ ساری ہیروئنز نکاح کیے جا رہی ہیں۔ اب دیکھیں نا کشف نے بھی نکاح کیا، ردا بھی ایسا ارادہ رکھتی تھی۔ نائلہ نے بھی ایسا کیا اور وہ اپنی تالیہ مراد بھی ایسا کر کے بیٹھی ہے۔ زمین اور زوباریہ نے بھی یہی کیا (یہ کیا ہو رہا ہے بھئی)۔ کوثر خالد صاحبہ کہاں ہیں؟ کچھ پتا تو کریں، بہت مس کرتے ہیں انہیں۔ مجھے ماریہ نذیر، زینب نور، تبسم بشیر اور فائزہ بھٹی بہت پسند ہیں۔ بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ میرا بہت ہی پیارا چھوٹا سا بھائی ہے ثاقب سکندر، اس نے میری مدد کی ہے خط پوسٹ کروانے میں۔ سو تھینک یو ثاقب' پلیز پلیز الف ایم 94 خوشاب کے آرجے وقاص حسینی کا انٹرویو کریں، یہ میری بہن ثوبیہ الطاف کی آخری اور دلی خواہش ہے۔

ج: رسالے آپ کو لیٹ ملتے ہیں، اس کی وجہ ملک کے حالات اور بارشیں ہیں۔ نائلہ نے جو کیا اس کی سزا اسے مل رہی ہے۔ آپ کی بہن کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی ہے۔

☆☆

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

سلمیٰ مسرت......راولپنڈی

س: شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟

ج: خواتین اور کرن پہلے سے ریگولر مطالعے میں تھے شعاع کے اجراء کا اعلان ہوتا رہا چھ ماہ انتظار کے بعد جب ہاتھ میں آیا یہ بالکل کل کی بات لگتی ہے تو اسی وقت ارادہ کرلیا کہ اب اس کا ساتھ نہیں چھوڑنا شادی سے پہلے سارے رسالے ابو لاکر دیتے تھے وہ خود بھی اردو ڈائجسٹ ٹائپ رسالے باقاعدگی سے پڑھتے رہے کراچی میں کوئی مسئلہ نہیں تھا شعاع ٹائم پر ملتا رہا۔

شادی کے بعد راولپنڈی خیابان سرسید میں اپنا گھر بنایا۔ آس پڑوس کی ان لڑکیوں سے دوستی ہوئی جو سارے رسالے پڑھنا چاہتی تھیں تو ہم نے ایک ایک رسالہ تقسیم کیا اس طرح ہر مہینے سات آٹھ رسالے پڑھ لیتی تھی لیکن ذمہ داریوں میں طوفانی قسم کا اضافہ ہوا تو آخر میں شعاع اور خواتین رہ گئے۔

چھوٹی بہن نجمہ باقاعدگی سے شعاع اور میں خواتین لیتی رہی۔ وہ بھی تین بچوں کی ماں ہے اپنے سسرال میں بڑی بہو ہے لیکن ساتھ نبھا رہی ہے۔ وہ لکھنے کی چور ہے اور مجھے لکھنے کا بے تحاشا شوق ہے اگر جلدی شادی نہ ہوتی تو شاید آپ کی ریگولر رائٹر ہوتی بہرحال جہاں اللہ رکھے ہم خوش راضی بہ رضا ہیں۔

س: دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟ معمولات؟

ج: الحمدللہ فجر سے ایک گھنٹہ قبل بستر چھوڑ دیتی ہوں، وہی ایک گھنٹہ تو ملتا ہے اپنے محبوب رب سے باتیں کرنے کا فجر کی نماز کے بعد کچن کے تھوڑے سے کام کرکے قریبی پارک میں آدھے گھنٹے کی واک کرتی ہوں پھر تیزی سے سب کے لیے ناشتہ ان کی پسند کا شروع میں میرے شوہر اور بچے لنچ لے کر جاتے تھے اب بھی کوئی نہ کوئی لنچ لے کر جاتا ہے۔

تین چار گھنٹے بہت مصروف ہوتے ہیں تیز گام بننا پڑتا ہے اس دوران گھر کی صفائی، دوپہر کا سالن، برتن سارے کام ہو رہے ہوتے ہیں اور چھ بجے میرا ٹی وی آن ہوتا ہے ایک گھنٹے کی تلاوت ترجمہ سات بجے انیق احمد کا پیام صبح آٹھ بجے کوئی پسندیدہ ریپیٹ ڈرامہ نو بجے حسب حال، مذاق رات، جیسے شو دس بجے الہدیٰ برانچ جاتی تھی بارہ بجے امی ابو کے پاس حاضری ہوتی تھی ایک بجے گھر بچوں کے استقبال سے فارغ ہوکر شعاع اور خواتین کا مطالعہ عصر کے بعد چائے کے ساتھ کوئی مہمان آ گیا یا کہیں جانا ہوا مغرب عشاء کے ساتھ سارے کام مکمل کرکے رات کو ایک گھنٹے پھر شعاع کے ساتھ گزرتے تھے اور گزرتے ہیں۔

س: آپ کی خوبیاں اور خامیاں؟

ج: اپنے بارے میں کچھ کہنا سب سے مشکل کام ہے کیونکہ جو آپ کی نظر میں خوبیاں ہوتی ہیں دوسروں کی نظر میں وہ خامیاں ہوتی ہیں قصہ مختصر والدین، بہترین ملے خصوصاً میری والدہ وہ اپنی ذات میں انجمن، ایک یونیورسٹی تھیں۔ ان سے جو کچھ میں نے لیا اس نے مجھے نکھار دیا۔ سب سے پہلی بات اگر آپ کو عبرت والی نظر سوچ مل گئی تو ان شاء اللہ آپ کبھی غافل نہیں ہوں گے اس سوچ کو لے کر میں نے خواتین اور شعاع کی ہر رائٹر کو پڑھا۔ الحمدللہ میں اپنے رب کی رضا کے رستے پر چلتی رہی آج میری زندگی میں کوئی پچھتاوا نہیں۔

میری سب سے بڑی خامی ضرورت سے زیادہ حساس ہونا ہے، زیادتی اور منافقت برداشت نہیں ہوتی میں نے اپنے دل پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ یہ تو میرے رب کا کرم ہے اور والدین کی دعائیں کہ مجھے قرآن کا فہم مل گیا۔ بہترین تحریروں نے مجھے صبر کرنا سکھایا ورنہ پتا نہیں میں اپنے ساتھ کیا ظلم کر بیٹھتی میری دعا ہے کہ جو لوگ ان رسالوں کو برا سمجھتے ہیں ایک بار پڑھ لیں تو ان شاء اللہ خود اپنی بچیوں کو لاکر دیں گے۔ اس کے لیے ہم سب کو رول ماڈل بننا ہے میں نے اپنے رسالوں کو کبھی طعنہ نہیں بننے دیا سارے فرائض ادا کرکے ان کو ہاتھ میں لیتی تھی سب کی پہلی آواز پر لبیک کہتی رہی وما توفیقی الا باللہ۔

س: پسندیدہ کتاب؟ اقتباس؟ شعر؟

ج: قرآن حکیم مکمل ضابطہ حیات اور سیرت طیبہ پر رحیق المختوم، دوائے شافی امام ابن قیم کی شاندار روحانی بیماریوں کی دوا ہے۔ اقتباس نمرہ احمد کے ناول "نمل" کے سارے الفاظ زبردست ہیں سعدی کا لازوال کردار جو اللہ سے باتیں کرتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ میں اکثر دیکھتا ہوں لوگ میوزک منعقد کر کے چیریٹی جمع کرتے ہیں اب کوئی مانے نہ

مانے اللہ نے موسیقی کی اجازت نہیں دی انسانوں کو نیک کام کرتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ یہ کام اللہ کے اصول کے مطابق ہیں یا نہیں۔

جو آنا چاہو تو ہزار رستے، نہ آنا چاہو تو عذر ہزاروں

مزاج برہم، طویل رستہ، برستی بارش، خراب موسم

س: بارش کیسی لگتی ہے؟

ابر رحمت بن کر برسے تمام مخلوق سیراب ہو، موسم خوب صورت ہو جاتا ہے۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

ام حذیفہ، خضر گواری..... کراچی

س: شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟

ج: اس کے لیے بہت پیچھے جانا پڑے گا تقریباً تین دہائیاں پیچھے، تب میں بہت چھوٹی تھی شاید دس، بارہ سال کی۔ سال پچاسی تھا یا چھیاسی یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ پہلا شمارہ نازیہ حسن کی تصویر دیکھ کر لیا۔ وہ پہلا شمارہ تھا پھر دوسرا آسیہ رزاقی صاحبہ کی کہانی کی دوسری قسط پڑھنے کے لیے لیا تھا جس کے سرورق پر اس وقت کے مشہور ڈرامے میں سکھاں، کا رول کرنے والی ہما اکبر کی تصویر تھی بس اس طرح خواتین کے ساتھ شعاع بھی۔ مطالعے میں شامل ہو گیا۔ یہ شاید 35، 34 سال پرانی بات ہے جب کا ساتھ ہے۔

''اک عمر کر زری ہے اس دشت کی سیاحی میں''

س: دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟

ج: دن کا آغاز الحمدللہ نماز فجر سے ہوتا ہے اس کے بعد سب کا ناشتہ پھر تھوڑی دیر سونا پھر روٹین کے کام، کھانا بنانا، صفائی کرنا، گھر کے سارے کام البتہ رات میں مطالعہ کرنا میرا معمول ہے۔

س: افسانوی دنیا کیسی لگتی ہے؟

ج: افسانوی دنیا بس افسانوی ہی لگتی ہے جس میں کبھی حقیقت کا رنگ بھی نظر آ جاتا ہے۔ میں خوابوں خیالوں میں رہنے والی نہیں ہوں۔ حقیقت پسند ہوں۔ بس حقیقی دنیا جب بہت تلخ لگنے لگتی ہے تو افسانوی دنیا اچھی لگتی ہے۔ جس میں ہر مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ہر پریشانی کا پہلے اینڈ ہو جاتا ہے جب کہ حقیقی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا زندگی بہت تلخ ہے۔

س: اپنی کوئی خوبی یا خامی؟

ج: یہ سوال تھوڑا مشکل ہے اپنی خوبیاں تو بے شمار مل جائیں گی۔ لیکن خامی؟ وہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں، جذباتی بہت ہوں، غصہ بہت جلدی آ جاتا ہے لیکن ختم بھی جلدی ہو جاتا ہے۔ اپنے فرینڈز اور ریلیٹوز کے لیے اچھی سامع اور راز دار ہوں، اچھی کک ہوں لیکن اپنی باتیں کسی سے شیئر نہیں کرتی۔

س: شعاع کی پسندیدہ تحریر؟ کس کردار میں اپنی جھلک نظر آئی۔

ج: یہ تو نہیں کہوں گی کہ ہر تحریر ہی شاندار ہوتی ہے باقی مجھے کہانیوں کے نام یاد نہیں رہتے۔ پھر بھی چند نام یہ ہیں یارم، جنت کے پتے، پیر کامل، امر بیل، سفال گر، میری فیورٹ رائٹر ہیں نمرہ احمد، سمیرا حمید، ماہا ملک، رخسانہ نگار عدنان، قانتہ رابعہ، اقشین نعیم، ام طیفور، فرحت اشتیاق، جہاں تک کسی کردار میں جھلک کی بات ہے وہ مجھے آج تک کسی میں نظر نہیں آئی۔

س: بارش کیسی لگتی ہے؟

ج: بارش کسے اچھی نہیں لگتی۔ بارش کی بوندوں کی نرم پھوار اندر تک سرشار کر دیتی ہے جب کہ تیز بارش میں بھیگنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بارش برستے وقت دعا قبول ہوتی ہے تو میں سب کے لیے بہت بہت دعا کرتی ہوں۔

س: پسندیدہ شعر؟

ج: شاعری مجھے ہمیشہ متاثر کن لگتی ہے بڑی سے بڑی بات کو مختصر پیرائے میں بیان کرنا ایک شاعر کا ہی کمال ہے خاص کر علامہ اقبال کی شاعری۔

پسندیدہ شعر تو بہت سارے ہیں ایک دو عرض ہیں۔

سارے صنم مسمار کر، خیر البشر سے پیار کر

رکھ کر نبیؐ کو سامنے آرائش کردار کر

☆☆☆

اب حال دل نہ پوچھ کہ اب تاب بیاں نہیں

اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی

س: پسندیدہ کتاب؟

ج: سب سے پہلے قرآن پاک کلام الٰہی ہے اس کے بعد سب ٹائم پاس ہیں جو تفریح طبع کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔ بہت سارے ناول بہت ساری کتابیں، قدرت اللہ شہاب کا ''شہاب نامہ'' جاوید چوہدری کی زیرو پوائنٹ''، اشفاق احمد کی ''زاویہ''، شیری صلیبی جنگ اور دجال، مولانا عاصم عمر اور مفتی ابو لبابہ شاہ منظور کی ''حرمین کے آنسو''، ''بولتے نقشے''

☆☆

امۃ الصبور

تاریخ کے کچھ ورق دلچسپ

سیب کی خواہش

''ایک سیب چاہیے! ایک سیب کھانے کو مل جاتا تو مجھے تسکین ہو جاتی۔ کہیں سے مجھے ایک سیب لا دو۔''

ایک بیوی نے اپنے شوہر سے سیب کا مطالبہ کر کے پریشان کر دیا۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانے کی بات ہے، ایک کسان کی بیوی کا بچہ ہونے والا تھا۔ وہ غریب جھنگ کے علاقے میں رہتا تھا۔ بیوی نے جو سیب کی خواہش کی تو بڑا پریشان ہوا۔

بستی میں کہیں سیب نہ ملا تو کسی نے کہا کہ ''بستی کے باہر ایک سوداگر آیا ہوا ہے۔ اس سے پوچھ لو شاید سیب مل جائے۔''

''وہ سوداگر کے پڑاؤ پر پہنچا۔ اس کے کارندوں نے کہا۔ ہمارے پاس تو نہیں شاید ہمارے مالک کے پاس ہو۔

ہوتے ہوتے وہ کسان سوداگر تک جا پہنچا۔ سوداگر گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا تھا۔ ایسا کائیاں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کسان کی بیوی کے بچہ ہونے والا ہے، اسے سیب کھانے کی خواہش ہو رہی ہے۔ اس نے کسان سے کہا۔

''یہ لو، سیب موجود ہے۔ مگر ایک شرط پر سیب تمہیں دیتا ہوں۔''

کسان نے کہا۔ ''وہ کیا؟''

سوداگر بولا۔ ''میرے تجارتی مال پر جو ٹیکس لگا ہے، وہ پوری مملکت میں معاف کیا جائے۔''

کسان نے جواب دیا ''میری کیا اوقات کہ تمہاری بات مان سکوں۔''

سوداگر بولا۔ ''تو بس ایک سفارش مجھے لکھ دے۔ میں یہ معافی آج نہیں چاہتا۔ تیرا بیٹا جب بڑا ہو کر وہ کچھ بن جائے گا جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تب میں یا میری اولاد تیری لکھی ہوئی سفارش اسے بتا کر اپنا مطلب حاصل کر لیں گے۔''

کسان نے بڑی خوشی سے تحریر پر انگوٹھا لگایا اور سیب لے کر چلتا بنا۔

مغلیہ سلطنت میں دو شخص وزیراعظم ہوئے۔ ایک ابوالفضل اور دوسرا سعد اللہ۔ دونوں اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر یہاں تک پہنچے۔ دونوں ذہین و فطین تھے۔

نواب سعد اللہ خان لکھتے ہیں کہ...... میں جب ذرا کھیلنے کودنے کے قابل ہوا تو میرے کسان باپ نے کہا کہ ''گائے بھینس چرایا کرو۔''

اس زمانے میں مجھے مکتب جانے والے ہم عمروں پر بڑا رشک آتا تھا۔ رہ رہ کے دل میں ہوک اٹھتی کہ کاش میں بھی پڑھ سکتا۔

ایک دن گائے بھینسوں کو چراتے چراتے میں ایک جگہ گھاس پر لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے کہا کہ...... ''دلی جا اور پڑھائی شروع کر۔''

''یہ بات میں نے اپنے باپ کو کہہ سنائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید اسے سوداگر کی بات یاد آ گئی جو مجھے اس وقت معلوم نہ تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بولا۔

''جانا ہے تو دلی چلا جا۔ خواہش میری بھی یہی ہے کہ تو پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے، مگر یہ بات پلے باندھ لے کہ میں غریب ہوں۔ پیسہ ٹکا تجھے نہیں بھیج سکتا۔ نہ سفر خرچ دے سکتا ہوں۔''

سعد اللہ خان کو اتنی بات کافی تھی۔ تین مہینے پیدل چل کر اور دنیا بھر کے دھکے کھا کر لڑکپن میں وہ دلی پہنچ گیا اور ایک مسجد کے مکتب میں پڑھنے لگا۔ دن محنت مزدوری میں گزرتا اور راتوں کو پڑھائی ہوتی۔ کئی سال اسی طرح گزرے تو جہانگیر کا بیٹا شہاب الدین محمد شاہجہاں کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔

ان ہی دنوں شاہ ایران نے ایک خط بھیجا کہ..... ''تم تو ہند کے بادشاہ ہو پھر سارے جہان کے بادشاہ..... شاہ جہاں کہلانے کے تم کیسے مستحق ہوئے۔ ہم کوئی تم سے کم ہیں؟ بہتر یہ ہے کہ تم فوراً یہ لقب بدل دو۔''

وہ خط دربار میں پڑھا گیا تو شاہ جہاں نے کہا کہ..... ''تم لوگ اس کا جواب لکھو۔ درباریوں نے بہت دماغ لڑایا، مگر کوئی جواب نہ بن پڑا۔''

آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ دلی کے مکتبوں میں اس کی اطلاع کرادی جائے تاکہ استاد اور ان کے شاگرد اس کا جواب لکھیں۔ سعد اللہ خان کی جماعت میں جب یہ فرمان سنایا گیا تو سب جواب لکھنے میں لگ گئے۔ سعد اللہ خان نے کاغذ پر اپنا نام و پتا لکھ کر جواب لکھا کہ

''ہند اور جہان کے اعداد برابر ہیں۔ اس لیے شاہ ہند کو زیبا ہے کہ شاہ جہاں کہلائے..... یہ..... ہند میں ہ کے پانچ..... ن کے پچاس اور د کے چار عدد ہوتے ہیں۔ جملہ انسٹھ بنتے ہیں۔ جہاں میں ج کے تین..... ہ کے پانچ..... الف کا ایک اور ن کے پچاس، جملہ انسٹھ ہوتے ہیں۔''

استاد نے یہ جواب سند نہ کیا اور سب سے نیچے یہ جواب رکھ کر شاہی محل بھیج دیا۔ اتفاق سے بادشاہ کے ہاتھوں میں جب یہ پلندہ آیا تو آخری کاغذ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس نے اٹھا کر سب سے پہلے اس کو پڑھا تو یہ سعد اللہ خان کا جواب تھا۔ بادشاہ کو یہی جواب پسند آیا۔ اس نے حکم بھیجا کہ..... سعد اللہ آج سے ہمارے ذاتی عملے میں شامل کرلیا جائے۔ یہ تقرر کیا ہوا، سعد اللہ خان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ترقی کے دروازے کھول دیے۔ پھر بہت جلد سعد اللہ خان مغلیہ سلطنت کا وزیر اعظم بن گیا۔

ایک دن ایک بوڑھا سوداگر اس سے ملنے آیا اور ایک تحریر اسے پیش کی۔ سعد اللہ خان نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور تمام سلطنت مغلیہ میں اس کے سامان تجارت پر محصول معاف کردیا۔

احتیاط

ایک دن امیر المومنین منصور نے یزید بن مسلم سے ابو مسلم کے بارے میں مشورہ کیا۔ یزید نے کہا۔

''امیر المومنین کی عمر دراز ہو۔ مناسب یہ ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا جائے تاکہ اس کے خرخشوں سے نجات مل جائے۔''

یہ سن کر منصور خفا ہو کر بولا۔

''تیری زبان جل جائے، یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اگر تیرے دیرینہ حقوق ہم پر نہ ہوتے تو جو سزا تو اس کے لیے تجویز کررہا ہے، ہم تیرے لیے تجویز کرتے۔''

یہ کہہ کر اسے حکم دیا گیا کہ وہ نظروں سے دور ہوجائے۔

ان باتوں کو ایک مدت گزرنے کے بعد جب منصور نے ابو مسلم کو قتل کرادیا تو یزید بن مسلم کو بلوایا اور پوچھا۔

''تمہیں یاد ہے کہ ایک بار ہم نے ابو مسلم کے بارے میں تم سے مشورہ لیا تھا اور تم نے اسے ٹھکانے لگانے کا مشورہ دیا تھا؟''

یزید نے جواب دیا۔

''میں کیوں کر بھول سکتا ہوں۔''

منصور بولا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ تم نے جو مشورہ دیا تھا، وہی معقول تھا لیکن میں نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ اس خیال سے کہ یہ بات کسی کے سامنے تمہاری زبان سے نہ نکل جائے۔ پھیلتے پھیلتے ابو مسلم تک پہنچ جائے اور وہ میرے ہاتھ نہ آئے۔ اس لیے باوجود اس کے کہ تم نے بہترین رائے دی تھی۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ اسے ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔''

☆☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کچری قیمہ

اجزاء:۔

قیمہ	ایک کلو
پیاز	ایک پاؤ
پسا کھوپرا	تین چمچے
سفید زیرہ	ایک چمچہ
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
بیسن	پانچ کھانے کے چمچے
کچری پاؤڈر	تین کھانے کے چمچے
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
پسے بادام	دو کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
خشخاش (پسی ہوئی)	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کوئلہ	ایک عدد

ترکیب:۔

قیمہ میں نمک اور کچری پاؤڈر ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ سب مسالوں کو ایک ساتھ پیس کر رکھ لیں۔ آدھی پیاز کاٹ کر تل لیں اور مسالے کے ساتھ پیس لیں۔ بچے ہوئے تیل میں نمک، کچری ملا قیمہ بھون لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر گلنے تک پکائیں۔ قیمہ گل جائے تو پسے ہوئے مسالے شامل کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی دو پیاز آملیٹ کی طرح کاٹ کر شامل کر دیں۔ ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ قیمہ گھی چھوڑ دے۔ ایک دیگچی میں بیسن بھون لیں۔ بیسن کو بھی قیمے میں شامل کر لیں۔ آخر میں کوئلے کی دھونی دیں۔ کٹا ہرا دھنیا، ہری مرچ ڈال کر پیش کریں۔ (اگر کچری پاؤڈر نہ ہو تو پپیتا بھی ڈالا جا سکتا ہے)

نوابی ملائی چکن

اجزاء:۔

چکن	ایک کلو
پسا لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
پیاز	دو عدد درمیانی
شملہ مرچ	ایک عدد
ہری مرچ	حسب پسند
ہری پیاز	دو عدد
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کریم	ایک پیکٹ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

چکن کے ٹکڑوں پر کٹ لگائیں۔ اب اس میں دہی، لہسن ادرک، نمک، پسا گرم مسالا اور کالی مرچ اور حسب ذائقہ پسی ہری مرچ اچھی طرح ملا لیں اور تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اب ایک پتیلی میں تھوڑا سا تیل ڈالیں اور چکن ڈال کر بیس منٹ تک پکائیں۔ چکن گل جائے تو اس میں کریم، لیموں کا رس، کٹی پیاز، شملہ مرچ ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ تیار ہو جائے تو گرما گرم نان یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

کوفتہ ہرا مسالا پلاؤ

کوفتے کے لیے:۔

چکن کا قیمہ	آدھا کلو
کٹی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	حسب پسند
بریڈ کرمبز	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن ادرک	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	دو عدد
انڈا	دو عدد

مسالا بنانے کے لیے

چاول	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
پودینہ	حسب پسند
کڑی پتا	دس عدد
ہرا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	آٹھ عدد
کالی مرچ	دس عدد
تیز پات	دو عدد
تیل	آدھا کپ
دہی	ایک کپ
ہری مرچ	چار عدد
ہرا دھنیا	ایک کپ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک چائے کا چمچہ
بڑی الائچی	دو عدد
دار چینی	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔

قیمے میں کوفتے کے تمام مسالے شامل کر کے چوپ کریں۔ چھوٹے چھوٹے گول کوفتے بنا کر کم تیل میں تل لیں۔ الگ پتیلی میں چاول ڈال کر ابال لیں، ایک کنی رہ جائے تو اتار لیں۔ الگ پتیلی میں تیل ڈالیں، اس میں پیاز کو ہلکا سا براؤن کر لیں۔ ہلکا براؤن ہوتے ہی تمام مسالے اور کوفتے ڈال کر بھون لیں۔ جب گھی تیل الگ ہو جائے تو چاول شامل کر دیں۔ دھنیا پودینہ چھڑک کر دم پر رکھ دیں۔ پانچ منٹ بعد اتار لیں۔

بہاری چکن تکہ

اجزاء:۔

چکن	ایک کلو
نمک	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لال کٹی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہری مرچ	دو کھانے کے چمچے
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد

ترکیب:۔

چکن کو اچھی طرح دھو لیں۔ پیاز کو براؤن کر لیں۔ ہری مرچ اور پیاز کو پیس لیں۔ ایک پیالے میں چکن، تیل، تمام مسالے، پسی مرچ اور پیاز شامل کر دیں اور ہاتھ سے اچھی طرح چکن پر لگا دیں۔ دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ نان اسٹک پین میں دس منٹ ڈھک کر پکائیں، اس کے بعد ڈھکن ہٹا دیں۔ چکن گل جائے تو پیاز کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

خوب صورتی کے نسخے

تمام ماہرین حسن نے اب تسلیم کیا ہے کہ کلینزر، ٹونرز اور دیگر حسن میں اضافے کے لیے بنائی گئی بیوٹی پروڈکٹس کے بجائے قدرت کے فراہم کردہ نباتاتی اور غذائی اجزا میں حسن اور جلد کی حفاظت اور صحت کے لیے بے شمار مفید عناصر موجود ہیں مثلاً وٹامن A وٹامن E ضروری فیٹی ایسڈ۔

''سبزیاں، دودھ، پھل، نٹس اور بیج وغیرہ خاص طور پر ہمارے حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔ ان ہی قدرتی اجزا کو اعلا ترین کاسمیٹکس میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد کی صفائی ستھرائی، از سر نو بحالی، مردہ خلیات سے نجات اور تازہ حسن افزا خلیات کی نشوونما ان قدرتی اجزا سے بہتر لیبارٹری میں تیار شدہ پروڈکٹس نہیں کر سکتی ہیں۔

☆ مثال کے طور پر لیموں ایک بہترین اسٹرینجنٹ ہے جس سے جلد کی ٹوٹ پھوٹ سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے اور جلد، گرد و غبار، سگریٹ کے دھوئیں، الٹروائلٹ ریز (سورج کی نیم بنفشی شعاعوں) وغیرہ سے ہونے والے نقصان سے محفوظ رہتی ہے اور اگر یہ نقصان ہو بھی چکا ہو تو لیموں کا استعمال جلد کو دوبارہ سے نئی چمک دمک اور تازگی بخشتا ہے۔

☆ گاجر کا رس نا صرف جلد کو نئی تر و تازگی عطا کرتا ہے بلکہ ایگزیما اور کیل مہاسوں سے نجات کے سلسلے میں بھی معاون ہے۔

☆ انگور کا رس کٹی پھٹی جلد کی مرمت کرتا ہے اور سوزش اور جلد پیدا کرنے والے جلدی مسائل میں ٹھنڈک اور تازگی پہنچاتا ہے۔

☆ کھیرا جلد سے اضافی چکنائی کو جذب کرتا ہے اور اس میں شامل اجزا جلد کی خارش، کھجلی اور جلن وغیرہ سے نجات دلا کر جلد کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔

☆ کھیرے کا رس آنکھوں کو حسن بخشتا ہے اور حلقوں، پپوٹوں کی سوجن اور آنکھوں کی تھکن دور کر کے آنکھوں کو چمک دمک عطا کرتا ہے۔

دودھ اور ٹماٹر کا کلینزر (نارمل اور چکنی جلد کے لیے)

ٹماٹر وٹامن A, B, C اور معدنیات مثلاً پوٹاشیم، میگنیشیم وغیرہ کا خزانہ ہوتے ہیں اور ایک منفرد فوٹو کیمیکل جسے لائیکوپین کہتے ہیں، ان میں شامل ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری بتائی ہوئی اس ترکیب میں اعلا درجے کی حسن بخش غیر ضرر رساں تیزابی خصوصیت والے اجزاء شامل ہیں جو جلد کی صفائی کو بہترین طریقے سے سرانجام دیں گے۔ دودھ میں شامل لیکٹک ایسڈ اور ٹماٹر میں شامل فروٹ ایسڈ کا امتزاج موجود ہے جو اس کلینزر کو ایک بہترین صفائی کرنے والا عمل ثابت کرے گا۔ یہ نارمل اور چکنی جلد کے لیے بہترین ہے۔

اجزاء:

ٹماٹر (پکا ہوا)	ایک عدد
دودھ (تازہ)	150 ملی لیٹر
پانی	حسب ضرورت

ٹماٹر کو بلینڈ کر کے چھان لیں۔ چھانے ہوئے رس میں برابر مقدار میں دودھ ملا لیں۔ اب اسے چہرے اور گردن پر لگائیں۔ دس منٹ بعد حسب ضرورت پانی سے چہرہ اچھی طرح دھولیں۔

خشک اور جھریوں والی جلد کے لیے

جلد کی تازگی اور جوان عمری لوٹانے کے لیے یہ ماسک بہترین ہے۔

دودھ کی بالائی	ایک کھانے کا چمچہ
روغن گلاب	دو قطرے

کریم (بالائی) اور روغن گلاب کو ملا کر آنکھوں سمیت چہرے اور گردن پر لگائیں ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں اور پھر نیم گرم پانی سے دھولیں یا ایک تولیہ کو نیم گرم پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں اور اس سے چہرہ صاف کریں، پھر موئسچرائزر لگالیں۔

— اسٹرابیری اسٹیم (ہر قسم کی جلد کے لیے)

بھاپ لینے سے جلد کو نا صرف صحت مند چمک دمک ملتی ہے بلکہ یہ جلد کے مساموں کو کھولتی ہے اور اس میں چھپے گرد و غبار اور میل کچیل کو صاف کرتی ہے۔

لیونڈر آئل	ایک کھانے کا چمچہ
اسٹرابیری	50 گرام
گلاب کی پتیاں	حسب ضرورت

ایک دیگچی میں پانی گرم کریں یہاں تک کہ وہ ابلنے لگے پھر اس میں اسٹرابیری، لیونڈر آئل اور گلاب کی پتیاں ڈالیں۔ پانچ سے پندرہ منٹ تک سر اور چہرے کو تولیے سے ڈھک کر بھاپ لیں۔ پھر چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر خشک کرلیں۔

کولنگ ٹونر

کھیرے اور وٹامن A سے بھرپور گاجر کے رس پر مبنی یہ ٹونر آپ کی جلد کو ٹھنڈک اور سکون بخشتا ہے اور حساس جلد کے تمام مسائل کو حل کرتا ہے۔

کھیرا (رس نکال لیں)	ایک عدد
گاجر کا رس	100 ملی لیٹر
چائے کا پانی	100 ملی لیٹر
لیموں کا عرق	100 ملی لیٹر

تمام اجزا کو مکس کر کے چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ بعد منہ دھولیں۔

— عرق گلاب اور انگور کا ماسک

یہ ماسک ہر قسم کی جلد کے لیے موزوں ہے۔ اس میں انگور کے اجزا خشک، حساس اور پھٹی ہوئی جلد کے لیے اکسیر ہیں جبکہ جلد کو جواں عمری بھی عطا کرتے ہیں — عرق گلاب کے اجزا جلد کو ٹون کرتے ہیں۔

اجزاء:

عرق گلاب	125 ملی لیٹر
گلیسرین	ایک چائے کا چمچہ
بادام کا تیل	ایک چائے کا چمچہ
گریپ فروٹ کا رس	بارہ قطرے

تمام اجزاء کو اچھی طرح مکس کر کے چہرے اور گردن پر لگائیں پھر مساج کریں ایک منٹ انتظار کریں پھر نیم گرم پانی سے چہرہ اچھی طرح دھولیں بقیہ آمیزے کو فریج میں محفوظ کرلیں۔

گرین ٹونر (ہر قسم کی جلد کے لیے)

موجودہ تحقیقات کے مطابق سبز چائے کے شفائی اور حسن بخش اجزا کی دریافت سے یہ تیزی سے کاسمیٹکس بنانے والی کمپنی کے درمیان مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ بڑھاپے سے محفوظ رکھتی ہے اور جلد کو جھریوں سے بچاتی ہے یہ جلد کی خارش دور کرتی ہے اور بہترین ٹھنڈک فراہم کرتی ہے۔

پانی	200 ملی لیٹر
سبز چائے کی پتیاں	چار چائے کے چمچے
پودینہ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ

سبز چائے اور پودینے کو پانی کے ساتھ ابالیں پھر لیموں کا رس شامل کریں۔ آمیزے کو ٹھنڈا کریں اور چہرے پر لگائیں بیس منٹ بعد منہ دھولیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ------------ روبی بٹ
میک اپ ---- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ------ موسیٰ رضا